دنیا میرے آگے

جمیل الدین عالی

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ۔ پبلشرز
لاہور ۔ حیدرآباد ۔ کراچی

دُنیا مرے آگے

سفرنامہ

جمیل الدین عالی

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدر آباد ○ کراچی

طابع: شیخ نیاز احمد

مطبع: غلام علی پرنٹرز، اشرفیہ پارک فیروز پور روڈ، لاہور

اشاعت اوّل: ۱۹۷۵ء

اشاعت دوم:- ۱۹۸۴ء

مقام اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز، لمیٹڈ پبلشرز

ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی ـــــ لاہور

اپنی گھر والی

طیّبہ بانو

کے نام

عالیؔ تیرا بھید ہے کیا ہر دو ہے پر بل کھائے
مَیں جانُوں ترے پاپی مَن کو گھر والی یاد آئے



فہرست

عرضِ ناشر

یہ سلسلہ تا حال اُردو کا طویل ترین سفرنامہ ہے، شاید مقبول ترین بھی

اگر ہم پورا سفرنامہ ایک جلد میں چھاپنا چاہیں تو ہزار صفحے سے زیادہ کی کتاب بن جائے گی۔ وہ دبیز بھی ہوگی اور مہنگی بھی۔ چونکہ یہ ایک پلاٹ والی کہانی نہیں بلکہ ہر ملک ہر شہر کا حال اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے۔ اس لئے ہم نے اسے کئی جلدوں میں چھاپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سب الگ الگ خریدی اور پڑھی جا سکتی ہیں ——!

فی الحال ہم بیک وقت دو جلدیں چھاپ رہے ہیں۔ ایک میں ہیں - ایران، عراق، مصر، لبنان روس، انگلستان اور فرانس اور دوسری میں مغربی جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ۔

ان دو جلدوں والے سفرنامے کی کہانی یہ ہے کہ یہ روزنامہ جنگ کراچی میں ۱۹۶۳ء سے لیکر ۱۹۶۶ء تک سنڈے ایڈیشن میں چھپتا رہا۔ چونکہ عام اردو قاری کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ یہ بہت مقبول ہوا - سلہٹ اور چاٹگام تک اسے پڑھنے والے بھی اچھے خاصے مجمعے لگاتے اور پڑھ کر سنتے تھے کچھ حصوں کے ترجمے غیر زبانوں میں بھی ہوئے اور متعلقہ ممالک کے جرائد میں چھپے۔ کچھ ملکوں سے اعتراض کی آوازیں بھی اٹھیں۔ اسکی مقبولیت کی یاد بھی ایسی ہے کہ ہمارے پاس کتاب چھپنے سے پہلے کافی فرمائشیں موجود تھیں ——!

اس دوران کئی اچھے اچھے سفرنامے چھپے۔ ان کی شان اور افادیت اپنی جگہ لیکن سفرناموں میں اولیت کے علاوہ عالی جی کا سفرنامہ اپنے اسٹائل، معلومات اور تبصروں کی وجہ سے آج بھی منفرد، زندہ اور تابندہ ہے۔ آپ ملاحظہ کریں گے انہوں نے روایتی بیان سے گریز کرنے میں جو پہل کی اس کا اتباع بعد کے بہت سے سفرنامہ نگاروں نے بھی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے بعد سفر کرنے والوں کی کتابیں پہلے چھپ گئیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ "دنیا مرے آگے" ان سے بھی پہلے قسط وار چھپ چکا تھا اولیت سے کوالٹی کا زیادہ تعلق نہیں مگر چونکہ آج کے بہت سے پڑھنے والے اس پس منظر سے ناواقف ہوں گے اس لئے یہ بات برسبیلِ تذکرہ بتا دی گئی ہے

چند سطریں کوالٹی پر بھی سہی۔ تکنیکی طور پر یقیناً سفرنامہ کہلائے گا۔ مگر جانے کیا کچھ ہے عالی صاحب نے سفرناموں کے ضروری کہے ہیں مگر صاف نظر آتا ہے کہ وہ ساتھ ہی ساتھ اپنے اندر بھی دیکھتے رہے ہیں۔ خاص طور پر اپنا ملک۔ پاکستان انہیں ہر جگہ یاد آیا ہے۔ کہاں کہاں اور کس کس طرح سے۔ یہ آپ کو خود دیکھنا ہوگا۔ یہ سلسلہ معلوماتی بھی ہے مگر کس پیرائے اہتمام کے۔ شاید نہیں کہتے ملک جس شہر پہنچیں اس کا جغرافیہ اور اعداد و شمار رٹنا ورد بنانے جائیں۔ بس یوں ہے کہ مجموعی طور پر ان کے سفرناموں میں یہ سب سے زیادہ معلوماتی بھی ہو گیا ہے اور دلچسپی کہیں کم نہیں ہوئی۔ اس میں سیاسی رپورٹنگ نہیں ہے۔ اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اس زمانے میں ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا۔ پروفیسر حسن عسکری کے بقول، وہ ایک تتلی کی طرح تھے جو ہر پھول سے مزا لے کر تتلی کے ... جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ سیاسی وقائع نگاری عام طور پر ادبی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔ وقائع مہینوں بلکہ ہفتوں میں بدل جاتے ہیں اور بھلا دیے جاتے ہیں۔ جہاں گشت صحافی سطح پر اس دور کے سب سے بڑے مسافر وقائع نگار رہے ہیں اور ان کے تجزیوں کا بھی کیا کہنا۔ مگر ان کی کتابیں سفر کے فوراً بعد ہی چھپتی تھیں۔ تب مزا آتا تھا۔ آج ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ تاریخ ہے۔ وہ کتابیں تازہ نہیں۔ عالی صاحب بنیادی طور پر صحافی نہیں، ادیب ہیں۔ وہ صحافت بھی کرتے ہیں تو ادب کے میڈیم ہی سے۔

بے شمار قسطوں میں یہ سارا سفرنامہ ایک ہی نام سے چھپا تھا۔ "دنیا مرے آگے"۔ اب چونکہ ہم نے اسے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا تو دوسرا نام بھی تلاش کرنا پڑا۔ ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۲ تک عالی جی نے ایک اور مستقل کالم لکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا "تماشا مرے آگے"۔ ہم نے دوسری جلد کے لیے وہی انتخاب کیا۔ اس نام میں دوسری جلد کا پورا مزاج بھی جھلکتا ہے۔

اس سفرنامے کو کتابی صورت میں لانے کی خواہشیں ہمیشہ سے اٹھتی رہی ہیں، مگر یہ کوئی ایک مسودہ تو تھا نہیں۔ سیکڑوں کالم تھے۔ ان کے پاس بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ بمشکل انہیں جمع کیا گیا۔ دوران اشاعت چند مہینوں کا تعطل بھی رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۷ء میں وہ ایک ادارے میں ملازم تھے (موجودہ ادارہ نہیں) اس کی انتظامیہ نے کہا کہ سفرنامے کے بہانے تم اسٹیبلشمنٹ پر بہت سخت چوٹیں کر جاتے ہو۔ یہ اسٹائل بدلو یا یہ ملازمت چھوڑ دو۔ یہ ملازمت نہ چھوڑ سکے۔ اسٹائل بھی نہ بدل سکے۔ سفرنامہ چھپنا بند ہو گیا۔ پھر اور قضیے پیدا ہوئے تو مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد چند قسطیں اور چھپیں پھر یہ لندن چلے گئے۔ اور سلسلہ بند ہو گیا۔ جب واپس آئے تو یہ سلسلہ دوبارہ شروع نہ کیا۔ کہتے ہیں، افتاد مزاج بدل چکی تھی۔

اندازہ ہے کہ دنیا مرے آگے کے پورے کالم جمع ہو چکے ہیں مگر ممکن ہے کہ چند قسطیں اب بھی موجود نہ ہوں۔ بہرحال جو کچھ ہے وہ بھی بہت ہے۔ لطیفہ یہ کہ جو بھی کوئی دو برس سے کتاب ہوا

لکھا تھا۔ انہیں تصحیح کا وقت نہ ملا تھا۔ چھپوانے کا شوق باقی رہ گیا تھا۔ ہمارے دوست ابن انشا صاحب اور مشفق خواجہ صاحب نے ان سے مسودہ اور کتابت چھین کر ہمارے حوالے کر دیئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ ہم اردو کی ایک اور حیرت انگیز تصنیف پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسرے سفروں پر تیسری اور چوتھی جلدیں ابھی نہیں چھپ رہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ نہ مکمل ہیں۔ نہ ان کی کتابت ہوئی ہے۔ خدا کرے اب وہ دوسرے سفروں کے "تاثرات" جلد مکمل کر دیں۔ وہ امریکہ ایک بار اور گئے تھے۔ ڈاکٹر ہنری کسنجر کے ساتھ ہارورڈ انٹرنیشنل سیمینار میں کئی ہفتے شرکت کی۔ وہاں اہم بین الاقوامی شخصیات سے گہرا ربط رہا۔ امریکہ کی اور ریاستیں دیکھیں۔ خاص طور سے جنوبی ریاستوں میں رنگ و نسل کے جھگڑے اور ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کی جانبازی کی تحریکیں۔ صدر کینیڈی سے ملے۔ بڑے بڑے ادیبوں اور فن کاروں سے ملاقاتیں ہیں۔ پھر کراچی۔ جاپان اور مشرق بعید دیکھا کئی بار اور یورپ گئے۔ روس بھی دوسری بار گئے۔ قرطبہ اور غرناطہ دیکھے اور عین ثقافتی انقلاب کے زمانے میں دو مرتبہ چین گئے اور ہفتوں رہے۔ افریشیائی ادیبوں کے اجتماعات میں موثر شرکت کی۔ چین کے بہت سے سبب دیکھے۔ ویتنام کی سرحدوں کو چھوا۔

ان سب کے لئے تیسری اور چوتھی جلدیں وقف ہیں اور اب ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی یادداشتوں تصویروں اور زور بیان کو مزید رنگ نہ لگنے دیں۔ مانا کہ اب ان کا انداز نظر بدل گیا ہے۔ سو اور بھی اچھا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ چین اور اس کا ثقافتی انقلاب بہت عظیم ہے۔ ... ان پر مشاہدے کا اظہار نہ کرنا مجھے کچھ ناقابل دست ... سا لگتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عالی صاحب نے اپنی ... مصروفیات کے علاوہ سولہ سترہ برس میں زبان، تعلیم، ادب اور ادیبوں کی بہت خدمت کی —

— کنڈے سے تعلق، انجمن ترقی اردو کی معتمد، اردو کالج کی ... مگر اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے ناقابل عفو بے پروائی برتی۔ ان کی ازلی مثال ہی باقی ہے — وہ شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک محنت کرنے والے آدمی ہیں۔ ان تھک کہے جاتے ہیں ... انسان تو نہیں۔ بیک وقت وہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ملازمت اور پبلک لائف اور تخلیقی کام کا امتزاج نہ عام ہے نہ آسان۔ آخر ش کوئی نہ کوئی اہمیت دوسری صلاحیت ... تو بار نہ ... دیتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کا پہلا مجموعہ کلام "غزلیں دوہے گیت" ۱۹۵۹ء میں چھپا اور ... دوسرا مجموعہ "لا حاصل" پورے سترہ برس بعد یعنی ۱۹۷۴ کے ... میں ... اب آ رہی ہیں۔

... تجزیہ درست نہیں۔ کچھ وزن ان کے خیال کو بھی دینا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ... ساتھ میں ہر کام کی ... سے غیر مطمئن ہوتا رہا۔ افق وسیع

بڑھتا جاتا ہے تو بڑی بڑی روشنیاں چھوٹی سے چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ اپنے کام کو منظرِ عام پر لانے سے بھی ڈر سے لگتا ہے کہ بس یہ کچھ ہے۔

یہ سچ ہوگا مگر اس طرح تو دنیا کا کام ہی نہ چلے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش درست ہے، منزل نہ ملنے کے ڈر سے سفر چھوڑ دینا محلِ نظر ہے۔ بہرحال یہ ان کا نقطۂ نظر تھا۔ انصاف کا تقاضہ تھا کہ ہم اسے بھی پیش کر دیتے۔

ایک دن ان کا ٹوٹل EVALUATION ضرور ہوتا ہے لیکن فی الوقت ان کے دوسرے کاموں پر تبصرہ ہمارے دائرہ تحریر سے باہر ہے۔

اب کچھ ان دو جلدوں کی خصوصیات کے بارے میں مگر یہ موضوع دیباچے کا ہے اور دیباچہ ان کے ہمعصر مصنف، عروسِ ادب کے "رقیب" اور دوست جناب ابنِ انشا نے لکھا ہے اور وہ بربنائے دوستی ایسی باتیں بھی کہہ سکتے ہیں، کہتے رہتے ہیں اور کہہ گئے ہیں جو ہم نہیں کہہ سکتے۔ سنا ہی ہے کہ دلی را دلی می شناسد۔ پتہ نہیں دونوں دلی ہیں یا ایک ہے اور ایک نہیں یا .....

——— ناشر

دوسری اشاعت

"دنیا مرے آگے" ۱۹۷۴ء میں چھپی تھی۔ پہلا ایڈیشن جلد نکل گیا تھا۔ اور دوسرے کی مانگ مسلسل رہی۔ مگر عالی صاحب کے تساہل یا مصروفیت نے اشاعت ثانی روکے رکھی۔ اس عرصہ میں ان کا ارادہ تھا اس میں کچھ حذف و اضافہ کریں۔ وعدوں کے بعد اتنے برس گزر گئے مگر نہ انھوں نے کچھ حذف کیا نہ اضافہ کیا۔ اب یہ فرماتے ہیں نئے ملکوں اور پرانے ملکوں میں نئے سفروں کے تاثرات مختلف ہیں۔ وہ ان پرانے تاثرات میں کیسے کھپائے جائیں۔ کاش یہی بات کافی پہلے فرما دیتے۔

اس اشاعت میں صرف باب ایران کے سلسلے میں ایک نئی بات علم میں لائی گئی ہے۔ وہ قارئین اس باب کے آخر میں ملاحظہ کریں گے۔ چند سطریں باب دہلی میں بڑھائی گئی ہیں۔

عالی صاحب نے ۱۹۶۱ء کے بعد بلکہ ۱۹۷۴ء میں اس کتاب کی پہلی اشاعت کے بعد بھی کئی بار بیرونی سفر کئے۔ کئی بار حجاز مقدس کی زیارت کی۔ وہ مزید دو مرتبہ روس گئے، برما اور جاپان گئے، تین مرتبہ ہندوستان اور تین مرتبہ چین بھی گئے۔ یورپ، امریکہ اور کینیڈا بار بار جاتے ہی رہتے ہیں۔ اتفاق کہ وہ آئس لینڈ بھی ہو آئے ہیں۔ اور شاید وہ اُردو کے پہلے ادیب ہیں جس نے آئس لینڈ دیکھا (یا اس پر لکھا) لیکن آئس لینڈ کا سفرنامہ الگ چھپے گا۔ تا حال اس کی ایک خاصی طویل قسط ایک ماہنامے میں چھپی ہے باقی حصہ زیر کتابت ہے۔ دیکھیے کتاب کب بنتی ہے۔ بطور خاص ہم منتظر ہیں کہ وہ اپنا سفرنامہ چین کب مرتب کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے چین کے دونوں دور دیکھے ہیں۔

اسی سلسلے کی دوسری کتاب "تماشا مرے آگے" ہے۔ وہ بھی ہم نے ہی چھاپی تھی اور اب اس کی دوسری اشاعت ہمارے ہی اہتمام سے ہو رہی ہے۔

"دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" کی شانِ نزول اور اشاعت پر پہلی جلد کے ابتدائیوں میں روشنی ڈالی گئی تھی۔ وہ اسی طرح اگلے صفحات میں بھی شامل ہے۔ اس اشاعت میں عالی صاحب کے عزیز دوست اور اردو کے نامور انشا پرداز اور شاعر ابن انشا کا مقدمہ شامل تھا وہ بھی اگلے صفحات پر موجود ہے۔

جیسا کہ قارئین اب تک جان گئے ہوں گے، عالی صاحب مسلسل کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ کالم ہو، سفرنامہ ہو، نگرانی لغات، مسائل علم و ادب پر رپورٹیں، انجمن ترقی اُردو کے مخطوطات اور کتابوں پر "حرفے چند"، قومی نغمے، غزلیں، دوہے، گیت وہ مصروف بھی بہت رہتے ہیں اور ملک میں اور ملک سے باہر سفر بھی بہت کرتے ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ مگر وہ اپنی چیزیں جمع اور

مرتب کرنے کے شوقین نہیں۔ یا انہیں یہ فن نہیں آتا۔ یہی دیکھ لیجئے کہ یہ سفرنامہ جو کبھی یک تجان سائز نہایت مقبول اور زبان و بیان اور مواد کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز سلسلہ تھا روزنامہ "جنگ" میں ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۶ء پورے تین برس چھپا مگر کتاب کے لئے اسکو جمع کرنا ۱۹۷۴ء میں ممکن ہوا۔ وہ بھی اس طرح کہ انشاجی مرحوم نے چند دوسرے احباب کی مدد سے یہ کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ کاش انہیں ایسے دوست یا معاون ملیں جو انکی تحریریں مرتب کرتے رہیں۔ ورنہ اردو ادب۔۔ اور وہ خود خاصا نقصان اٹھاتے رہیں گے۔

ان دونوں کتابوں پر خاصے تبصرے آچکے ہیں۔ بعض مبصرین نے ترتیب زمانی پر تحقیق کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اردو کے قابل ذکر سفرنامہ نگاروں میں پاکستان کی مدتِ حیات میں محمود نظامی مرحوم کا تھا۔ ان کی کتاب نظرنامہ ہے۔ اور دوسرا نام جمیل الدین عالی کا۔ لیکن ہوا یہ کہ عالی صاحب کی کتاب بہت دن بعد سامنے آئی رجبکہ تمام سفرنامہ کا ملی صورت میں برسوں پہلے چھپ چکا تھا۔ اور بہت سے دوسرے مصنفین کی کتابیں ان سے بہت پہلے بازار میں آگئیں جبکہ انہوں نے سفر بھی کافی بعد میں کئے تھے۔ چنانچہ تبصروں میں دوسروں کا ذکر زیادہ آیا۔ نئی نسل کے بہت سے مبصرین نے ان کے سفرنامے پڑھے ہی نہیں تھے۔ ان کا بھی قصور نہیں۔

لیکن یہ مسئلہ تقدیم زمانی کا ہی نہیں۔ مبصرین نے عالی صاحب کے مشاہدے، مطالعے و انداز بیان کو ایک حیرت افزا انفرادیت کا نمونہ اور فکر انگیز بھی قرار دیا ہے۔ قارئین خود بھی ملاحظہ کریں گے کہ اکثر مقامات پر وہ بہت بڑی بڑی باتیں کہہ گئے ہیں جبکہ تحریر کے وقت ان کی عمر چالیس برس بھی نہ تھی۔

اس امر پر سوچا گیا کہ فلیپ پر چند فاضل مبصرین کے اقتباسات دیئے جائیں مگر پہلی اشاعت کے فلیپ پر جناب قدرت اللہ شہاب کی رائے درج تھی اسے حذف کرنا یا اس کا خلاصہ کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ فلیپ پہلی سی طرح ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جناب قدرت اللہ شہاب کے خیالات و الفاظ کی قیمت آج بھی ذرہ برابر کم نہیں ہوئی بلکہ فزوں ہو چکی ہے۔ اگلی اشاعت میں انشاء اللہ مبصرین کے تبصرے یا اقتباسات ایک پورے باب کی صورت میں دیدئے جائیں گے۔

اُمید ہے کہ اشاعت اوّل کی طرح یہ اشاعت ثانی بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

ناشرین

عالی مرے آگے

ہمارے عالی صاحب نے سفر پہلے کیا، ہم نے بعد میں۔ انہوں نے اخباری کالموں میں اپنا سفرنامہ پہلے لکھا، ہم نے بعد میں لکھا، گویا وہ اس معاملے میں ہم سے آگے آگے تھے، ہم ان سے پیچھے پیچھے تھے۔ دنیا اُن کے آگے، وہ ہمارے آگے۔ اور خود ہم کئی اور سفر کرنے اور لکھنے والوں کے آگے۔ ہر اونٹ کسی نہ کسی پہاڑ کے نیچے آتا ہے اور ہر پہاڑ کسی نہ کسی اونٹ کے نیچے آتا ہے۔ بہرحال ہمارے پہاڑ جمیل الدین عالی ہیں۔

ہم اعداد و شمار کے آدمی نہیں۔ ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ ان کا سفرنامہ کس سن میں شروع ہوا اور کس سن میں ختم ہوا۔ ان کے سفر کرنے کی تاریخیں اب یاد ہیں۔ یہ سب آپ کو ان کی اپنی تحریر سے معلوم ہو جائے گا۔ بس اتنا یاد ہے کہ لوگ اتوار کی اتوار اس سفرنامے کے منتظر ہوا کرتے تھے اور بیٹھ کر اس کی جگالی کیا کرتے تھے۔ عالی صاحب کے سفر اس سفرنامے پر ختم نہیں، بعد میں بھی وہ سفر کرتے رہے۔ ہمیں اور دوسرے دوستوں کو نامے بھی لکھتے رہے لیکن باقاعدہ سفرنامہ پھر نہ لکھا۔ شاید اس لئے کہ بعد کے سفر انہوں نے خصوصی آسائش میں کئے۔ چہرے پہ جوانی کا نور اور جیبوں میں ڈالروں کا وفور۔ تاہم پہلے عشق کی شدت اور ہی ہوتی ہے۔ یہ سفرنامہ ان کے پہلے عشق کا نتیجہ ہے اور جتنا لطف اور جتنی سوزشیں اور جتنا خلوص اور جتنی حماقتیں پہلے عشق میں ہوا کرتی ہیں۔ وہ آپ کو اس سفرنامے میں درجہ بدرجہ مل جائیں گی۔

"دنیا مرے آگے" اردو کا پہلا سفرنامہ نہیں۔ ذرا تحقیق کر کے آپ کو یہ بتلانے آئے ہیں کہ پہلا سفرنامہ کون سا تھا (یاں ہم نے جو پہلا پڑھا) وہ یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص تھا اور اپنے بیان کے مطابق مذہب یونانی رکھتا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ ذہنی سین ہوگا۔ پورا مسلمان یا پورا عیسائی کسی طرف سے معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بات ۳۵-۱۸۳۶ء کی ہے۔ وہ سفر سست رفتار جہاز کا تھا اور اس میں ولایت کے عجائب اور ان کے اپنے عجائب، میموں کے پیچھے بھاگنے کا ذکر بہت ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ لیکن میموں کے پیچھے بھاگنے کی بات بھی سفر کرنے والوں اور سفرنامے لکھنے [illegible] ہے۔ بجائے کمبل پوش کو کیوں الزام دیجئے ہم ہوتے تم ہوتے کہ میر ہوتے۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔ کوئی [illegible] چھپا گیا کوئی سلیقے سے لکھ گیا۔ کسی نے دونوں کام بدسلیقگی سے کئے۔ بہرحال یہ کمبل پوش مزے کا آدمی تھا۔ دوسرا مشہور سفرنامہ سید احمد خاں کا ہے۔ یہ بچارے البتہ کام کرنے گئے تھے اور کام کرتے رہے۔ ایوب جیسا [illegible] کی محافظت میں خدمتگاری کا حق ادا کیا۔ صرف علمی شغف کی داستان سننی ہو تو اسے پڑھیے۔ اس کے بعد

ہمارے محبوب قلمکار مولوی محبوب عالم آ گئے ہیں۔ یہ ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ گئے تھے۔ ہم نے جب سفر کیا تو ان کا سفرنامہ ہماری جیب میں تھا بلکہ بغل میں کیونکہ جیب میں سمانے کی چیز وہ نہیں۔ ان کے بل بکوں اور تجربوں کا تنوع مختلف ہے۔ یہ بھی شیان آدمی ہیں۔ ملک کی فکر میں غلطاں اور سرگرداں رہتے تھے۔ ایک بار دریا میں پار اتر کے میدان میں پتہ نہیں حالی وہاں گئے یا نہیں۔ ہم محض مولوی محبوب عالم کی یاد میں گئے۔ ان کو کھلنڈری لڑکیوں نے گھیر لیا اور کاغذ کی زنجیر کر کے ان کا کالر کھول کر اندر ڈال دیں اور بھی خلاف شرع مذاق ضرور کئے ہوں گے۔ بہرحال منشی جی لاحول پڑھتے رہے۔ ان کا زیادہ عرصہ کو شر خوراک یعنی حلال گوشت کی تلاش اور جھٹکے سے بچنے کی کوشش میں گزرا۔ اخباروں کے دفتر جھانکتے رہے۔ پیرس کی مشہور عالم نمائش دیکھتے رہے بلکہ فی الاصل اسی کے لیے گئے تھے۔ برلن میں ہم منشی جی کے ہاتھوں بہت پریشان ہوئے۔ پہلے مشرقی برلن جاکر اخبار برلنر ٹاگ کا وہ شمارہ مشکل سے ڈھونڈا۔

اخبار کا عکس چھپا تھا۔ پھر اس اخبار کا دفتر دیکھنے گئے۔ وہاں میدان تھا۔ سبزہ اگا تھا۔ در و دیوار پہ نہیں کرو پھر ایک بات ہے۔ در و دیوار کے ہونے کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ زمین پہ۔ قصہ یہ ہے کہ ان کے زمانے پر دو مہیب جنگیں اور ستر سال گزر چکے تھے۔ بعد میں بھی کچھ سفرنامے آئے اور ہمارے زمانے میں تو نیبرے جنگل کا جنگل ہو گیا اور برابر ہو رہا ہے بلکہ اب تو سنا ہے امیگریشن والے جانے والوں سے یہ شرط کر لیتے ہیں کہ واپس آ کر سفرنامہ نہ لکھنے کا وعدہ کرو تو جانے کی اجازت دیں گے۔ لیکن عالی کا سفرنامہ اپنی علیحدہ شان رکھتا ہے اور سب چھپانی تو اخبار کا تہراتیں فیچر تھا اس میں فقط معلومات کی بات نہ تھی۔ اسٹائل کی دلکشی کا حصہ تھا۔ جہاں خود جاتے تھے۔ قارئین کو ساتھ لیے ہوتے تھے۔ کہیں روما کے کولوسیم میں گھوم رہے ہیں، کہیں سین کے پل پہ پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کہیں تبریز میں جھانک رہے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ اس میں سوائے پانی اور کیچڑ کے کچھ نہیں۔ کچھ ان کو نئے اور نامور آدمیوں سے ملنے کا بھی شوق تھا۔ سو یہ شخص کہ تماشا گاہِ عالم رُو سے او تھا۔ بہر حال تو دوسروں کے ہاں جاتا بھی ملے گا جس سے بعض نادانوں کو یہ شبہ کرنے کا موقع بھی ملا کہ ان کو نمود کا بہت شوق ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا اس بیداد گر رنج فزا نے ہم سے پیش لفظ لکھوانا کیوں پسند کیا۔ دوستی اپنی جگہ لیکن ان کا زائچہ اور ہمارا اور۔ وہ ہیں مقطع، ہم ہیں مسودہ۔ ہم مارک ٹوین کے دبستان کے آدمی ہیں کہ جو ذمہ دار ہو تحریر کی معلومات سے آزاد کیا۔ افادیت کو پاس آنے دیا۔ ہم نے اپنے پہلے سفرنامے "آوارہ گرد کی ڈائری" کے دیباچے ہی میں خبردار کر دیا تھا کہ کوئی شخص اسے گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی کوشش نہ کرے ــــ اگر کرے گا تو نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔

عالی صاحب کی کرچی میں آپ کو ہر درج کا ناج ملے گا۔ تاریخ، جغرافیہ، اعداد و شمار، عمرانیات، معاشیات، بابیات، آثار قدیمہ، آثار جدیدہ۔ یا تو یہ نوٹ رکھتے تھے یا ان کا حافظہ ہی ایسا ہو گا۔ اخبار میں چھپا تو اس سفرنامے میں تصویریں بہت تھیں۔ لندن میں ہوں یا روما میں ہوں یا فرانس ہو۔ ہر ایک میں سوٹ پہنے، کیمرے کو گلے میں باندھے، دیکھتے دکھائی دیتے تھے۔ کتاب میں سے ہم نے زیادہ تر تصویریں خارج رکھوا دیں ــــ یہ گنجا نہ شوق ہے۔ یہ ثبوت تصویر سے دینا کیا ضروری ہے کہ آپ

واقعی لندن ٹاور ہی سے تھے۔ لوگ آپ کے بیان کو کافی سمجھیں گے۔ ایک وجہ شاید ہمارا حسد اور رشک کا جذبہ بھی ہو۔ ہم بہت جگہ معصوم آ رہے۔ کہیں ہماری تصویر نہ کھنچی، آخر کار کارٹون بنوائے گئے۔ وہی ہمارے کام آئے۔

اس سفرنامے سے معلوم ہوگا کہ قوم کی اصلاح اور مساوات کے نظاموں اور فلسفوں کے بارے میں ان کا شوق کوئی نیا نہیں ہے۔ ان کا مزاج لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا۔ اس رنگ میں بہت سی باتیں لکھ گئے جو مصلحت کے خلاف تھیں۔ ایک آدھ ملک سے تو پروانہ بھی آیا۔

ہم نے خدمت میں عرض کیا کہ سفر کرنے اور سفرنامہ لکھنے میں اوّلیت تو انہی کی تھی لیکن کتابی صورت میں ہمارے سفرنامے پہلے آئے اور پھر آتے چلے گئے۔ ہر سفرنامے پر یہ کھٹکا رہتا تھا کہ جیب ہو جاتے تھے۔ ایک آدھ بار کہہ بھی دیا کہ تم بہت دقیانوسی نکال رہے ہو۔ ہمارے حصے کی بھی داد سمیٹے جا رہے ہو۔ ہمارے سفرنامے کی کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی کہ ان میں کچھ نہیں ہوتا۔ مزاح محض بلفظ دیگر ہوتی ہے اور عسل نہانے ہوتے ہیں۔ اور یہ رسالہ وصد یہ ہم عمر کو یوں نہ چاہیے تھا۔ ہم یہ چشمی سے ٹال دیتے گئے۔ کبھی کہا تو یہ کہا کہ بھئی مسافر کی سمت کیا ہوتا ہے تمہارا سفرنامہ ہماری ایک ہی طرح کا ہوگا اور سفرنامے طباعت ہو جائیں گے۔

سفرنامہ اخباری صفحات پر بہر طرح چھپا ہوا تھا۔ اس طومار کو دیکھ کر ان کے انتظار میں بھول جاتے تھے اور ہماری توجہ چھاپنے کا ارادہ ملتوی کر دیتے رہے۔ کہنے لگتے تھے۔ آخر ہم نے اس طومار کو چھپوایا۔ اس کی کتابت اسی کراچی میں کرائی۔ یہ کام بہت کچھ ہوا اور یہ منزل ہے جو جس نظر آئی تو ان کا حوصلہ بھی بڑھا اور جی کی ... نے اس سے بہت مدد دی۔ بلکہ مخدوم محسن شاہ جہاں اور حیات باقی ہی رہنے۔ ورنہ یہ دفترات بھی ذہن میں ہی رہتا۔ ایک وجہ یہ ہوئی کہ حسن صاحب نے لکھنے کا آغاز کیا ... باقاعدہ سفرنامے لکھتے لکھتے ہوئی کہ اس کتاب کی اشاعت کا مقام بھی آ گیا ہے۔ ... اب جو سنگ میل ... لگا ہے ... شیخ نیاز احمد اور ارشد نیاز کی محنت کا دیر ... ڈال چکا ہے ... کی ضرورت نہیں۔ اس سال مبارک ۱۹۰۵ میں یہ کتاب مستطاب ہم زیور طبع سے آراستہ کر کے بارگاہ عالی میں نذر کرتے ہیں اور ان کو مبارک باد دیتے ہیں اور خود آرام کا سانس لیتے ہیں کہ ... ایک ... اب تو یہ ان سے آگے نکل آئے انشاءاللہ آگے ہوں گے اور زبان کے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ بہر حال آگے پیچھے ہونا ان کا اور دنیا کا مسئلہ ہے۔ ہم اجازت چاہتے ہیں۔

ابنِ انشا

ایران

خیاباں خیاباں

حاضری کھاسے جو کلکتہ تو لندن میں پٹن

انشاء اللہ خاں انشا ایک زمانے میں سخت خوشامدی تھے اور انہوں نے ایک گورے افسر کا قصیدہ کہا تو اس کے رہوار کی صفت میں یہ مصرع بھی فرمایا۔ اب سے پونے دو برس پہلے کا زمانہ۔ اس وقت لوگ ہنسے ہوں گے۔ ہنسنے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں اور...... اور رونے والے بھی۔

انیس سو ساٹھ کی ۱۲ جولائی کی صبح ایک گوری قوم کا بنایا ہوا رہوار ہمیں کراچی سے لے کر اڑا تو اس کی رفتار تقریباً چھ سو میل فی گھنٹہ تھی اور اس کا کپتان کہہ رہا تھا کہ ہم دو گھنٹے میں آپ کو تہران پہنچا دیں گے۔

تہران دُور دراز ایران کا دارالحکومت' جہاں کے قافلے ہندوستان پہنچنے میں چار پانچ مہینے لیتے تھے۔ بارہ سو میل دُور

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم

مجھے یہ اعتراف کرلینا چاہیئے کہ یہ میرا پہلا بیرونی سفر تھا پرانے سیّاح جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں میرے طفلانہ انداز سے خفا نہ ہوں۔

جہاز اونچا ہوتے ہی دو لڑکیاں مسکراتی ہوئی گھومنے لگیں "نئے" مسافر بار بار طلبی کا قمقمہ جلاتے تھے اور ان سے دیر تک انگریزی میں سوال و جواب کرتے تھے۔ وہ لڑکیاں پاکستانی تھیں اور اردو بولتی تھیں مگر وہ جہاز بوئنگ ۷۰۷ تھا۔ بوئنگ ۷۰۷ جو اصل میں پان امریکن کا تھا جسے عالمی سیاست کے جھونکوں نے پی۔ آئی۔ اے کی اڑانوں میں شامل کر دیا تھا۔ اس اڑن محل میں ایک سو تیس مسافر براجمان تھے اور جہاز کے پیٹ میں کوئی چالیس ہزار پونڈ سامان بھرا ہو تھا۔ دو پنکھوں میں تیرہ لاکھ پونڈ تیل۔ تیل جو ہم باہر سے منگاتے ہیں اور جسے اپنے ملک میں تلاش کرنے کے لئے بھی ہم امریکی اور روسی امداد کے محتاج ہیں۔ ہلکی ہلکی مغربی موسیقی نے انجنوں کی آواز

میں خوشگوار تناسب پیدا کر دیا تھا۔ جہاز کی دیواریں منقش تھیں اور فضا پہاڑوں کی طرح خنک اور رسیلی تھی۔

"ہم کتنے اُونچے ہیں"

"تیس ہزار فیٹ"

"یعنی ایورسٹ سے بھی اونچے"

"ہم اور اُونچے جا سکتے ہیں"

یہ جہاز تیل اور اسباب سمیت تین لاکھ پونڈ وزنی تھا اور اس کے جیٹ انجنوں میں دو ہزار سے پانچ ہزار میل اُڑنے کی طاقت تھی اور یہ تا لونا پی۔ آئی۔ اے کا جہاز تھا جو پاکستان کی قومی ہوائی کمپنی ہے مگر جہاز کے معاملے میں قومیت کا کیا ذکر جہاز تو گورا ہی بناتا ہے کیونکہ پاکستان میں ابھی ہم فولاد بھی تیار نہیں کر سکتے اور وہ اس لیے کہ ہم نے کبھی اقتصادی منصوبہ بندی پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور عمل اس لیے نہیں کیا کہ ہم آزاد مزاج، آزاد خیال لوگ ہیں۔ ہمیں جلسے کرنے اور نعرے لگانے اور لیڈروں اور وزیروں کے بنانے بگاڑنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ رہا بوئنگ ۔۔۔ کا معاملہ تو وہ ہم امریکہ یا کسی اور "اتحادی" ملک سے مانگ لیا کریں گے۔ بلکہ ہم تو روزانہ استعمال کی دوائیں بھی "دوست" ملکوں سے منگاتے ہیں کیونکہ دوائیں بنانے کے لیے سائنسداں ریسرچ کے طالب علم اور ڈاکٹر درکار ہیں جن کے لیے تعلیم گاہیں اور تجربہ گاہیں درکار ہیں جن کے لیے منصوبہ بندی اور طویل المیعاد محنت، مشقت کی ضرورت ہے سو یہ جھگڑے کی باتیں ہیں۔ ہم یہ پٹیاں یہ کیا جانیں!"

بوئنگ ۔۔۔ زندہ باد

یہ طیارہ کسی کا بھی ہو، کہیں سے آیا ہو، کسی شرط پہ آیا ہو، اس وقت تو مجھے یہ موسیقی سُناتا ہوا تیس ہزار فیٹ کی بلندی پر چھ سو میل کی رفتار سے اُڑائے لیے جا رہا ہے۔ رہی منصوبہ بندی اور محنت مشقت کی بات، تو وہ ہماری آئندہ نسلیں کریں گی نہیں تو امریکیوں یا روسیوں یا چینیوں کی آئندہ نسلیں ہماری آئندہ نسلوں کا خیال رکھیں گی۔

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

ایئر ہوسٹس مسکراتی ہوئی ہماری طرف آئیں۔ اُن کے سامنے پہیوں والی کشتیاں تھیں جن میں غیر ملکی شرابیں سگریٹ اور خوشبوئیں تھیں۔ بیرونی اُڑانوں میں یہ سامان کسٹم ڈیوٹی سے بری ہو کر بہت سستا ملتا ہے۔

ہم میں سے نقد پیسا سب نے وسکی کی ایک ایک بوتل اور ۵۵۵ کے سگریٹ خریدے اور اسٹیٹ بینک کو گالیاں دیں کہ زرِ مبادلہ بہت کم دیتا ہے ورنہ ہم خوشبوئیں بھی خریدتے۔ آخر خوشبو بھی زندگی کی

ضروریات میں سے ہے :

میں نیچے جھانکنے لگا۔ پتا نہیں آبِ رکنا باد کدھر ہوگا۔ شمال میں یا جنوب میں نیچے صحرا ہی صحرا نظر آتا تھا۔ بہت پہلے یہ علاقہ سیستان کہلاتا تھا۔ مکران کا ساحل اور ریگ زار یہاں آبِ رکن باد کدھر سے آیا یہ تو سیستان ہے، رستم و سہراب کا علاقہ۔

(یعنی خوب رستم و سہراب کو پاکستانی قومیت عطا کر ہی دی)

میرے برابر کراچی کے ایک تاجر، ایک وکیل اور ایک صحافی بیٹھے تھے۔ جہاز کی انی خوبیوں کے باوجود یہ تین کرسیوں والی سیٹ کا حساب بہت تکلیف دہ تھا۔ تاجر مطمئن سا تھا، وہ کئی بار یورپ ہو آیا تھا صحافی بھی کسی سرکاری درباری اخبار کا آدمی تھا اور دنیا بھر میں گھوم چکا تھا کیونکہ اس کا اخبار حکومت سے دبتا تھا اور حکومت اس کے اخبار سے دبتی تھی اور اس لیے وہ کسی سے نہیں دبتا تھا۔ وکیل نیا سا مسافر تھا، جیب سے بٹوا نکال کر پونڈ اور سفری چیک شمار کرتا تھا اور رہنمائے یورپ کے صفحات پر سستے ہوٹلوں اور گھٹیا نائٹ کلبوں کے ناموں پر نشانات لگاتا تھا۔

"یار یہ سالا ایکس چینج اب کھلا تو جان میں جان آیا۔ اِدھر تو اس سلڑی گورنمنٹ نے مار ہی دیا تھا۔ بولتا تھا کہ کوئی باہر مت جاؤ۔ ٹورسٹ ہونے کا ملک کو کیا فائدہ ہے، ایکس چینج بچاؤ۔ یہ کرو، وہ کرو۔ بولو سالا سارے سال کماؤ۔ جرا مہینہ بھر بھی اُٹھانے کو یورپ بھی نہ جاؤ۔ کیا یار امیر گریب کو برابر سمجھتا تھا۔ یہ لوگ مگر اب کچھ ہوش آگیا ہے۔"

وکیل بپھر گیا۔ اُسے صرف ڈیڑھ سو پونڈ ملے تھے۔ وہ آرٹ کا دلدادہ تھا جو اسے پاکستان میں نہیں ملتا اور دو برس سے گویا بھرا بیٹھا تھا۔

"امیر غریب کو برابر سمجھتا ہے یہ لوگ، کیا مطلب ہوا اس کا!" اس نے پوچھا۔

تاجر بولا "جو کمائے وہ بھی نہ جائے۔ جو نہ کمائے وہ بھی نہ جائے۔ کھیرا ہم پالیٹکس کا بات نہیں کرتا۔ بھائی صاحب۔ جا کر دیکھا۔ دیکھو یہ لونڈیا اچھی لگاسی ہے۔ لندن جہاج ٹھہرے تو اس کا ڈیوٹی آف ہوگا۔ اُترنے سے پہلے ڈیٹ کرنا۔ امریکہ میں ملاقات کا ٹائم طے کرنے کو بولتے ہیں۔ ہی ہی ہی"

وکیل مسکرایا اور بے ساختہ لڑکی کو سوالیہ انداز سے دیکھا۔ مگر صحافی ایک دم بگڑ گیا۔

"بھائی صاحب ایئر ہوسٹس بھی تو ہماری آپ کی پاکستانی بہن ہے۔ اس سب بکواس کا کیا مطلب ہے۔ یعنی ہماری لڑکیاں کام نہ کریں۔ نرسیں بنیں تو آپ حقیر جانیں۔ دفتر جائیں تو آپ نفرت کیے بغیر نہ رہیں

نہ دیں۔ ایئر ہوسٹس ہنیں، تو آپ ڈیٹ کی تجویز کریں۔ آخر یہ سب کیا نان سنس ہے۔ آخر آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔
" ہم کدھر پڑھا لکھا ہے بھائی۔ اپنا تو تیل کا کاروبار ہے۔ اور کبھی کبھی بنولے کا سٹہ بھی کر لیتا ہے۔ تم کو مجا نہیں کرنا۔ مت کرو۔ ہمارے مجاق میں کیا ہرج ہے۔ ڈیٹ کرنا کیا برا ہے۔ ممکن ہے دل مل جائے۔ دو آدمی کھش ہوئے تو اپن بھی کھش ہوں گے۔" صحافی نے بھی تقریر شروع کر دی۔ وہ قومی کردار پر بات کرنے لگا اور چھت میں اور دیواروں میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر زور زور سے جاز میوزک کی چیخیں مارنے لگے اور وکیل نے لڑکی کو پاس بلا کر اپنی طرف سے فصیح و بلیغ انگریزی میں اُلٹے سیدھے سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔

میں نیچے دیکھنے لگا۔

نیچے ایران تھا۔ مولدِ دارا یوش و دارا کی جنم بھومی) ہزاروں برس کی تہذیب اور فارسی ادب۔ فردوسی، سعدی، حافظ اور طاہرہ قرۃ العین۔

طاہرہ قرۃ العین کے خیال پر پھر بری آگئی۔ موت زندگی پر ہر منزل میں کس کس طرح حملے کرتی ہے۔ میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور خیال کی سی تیزی کے ساتھ اپنی موت کے اور باقی سب مسافروں کی موت کے نقشے آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ آج سے آٹھ برس پہلے میرے بڑے بھائی لیاقت علی خاں مرحوم کے معاملے کی تفتیش کرنے چلے تھے۔ اس وقت ان کی بیگم سخت بیمار تھیں اور لحظہ لحظہ ان کی موت کا امکان بڑھ رہا تھا۔ مگر۔ مگر جہلم کی پہاڑیوں پر اڑتے اڑتے ان کا فوجی جہاز موت کی آغوش میں گر گیا اور ان کی بیگم مزید آٹھ برس زندہ رہیں۔ اب اگر یہ جہاز نیچے گر جائے تو ہم کیا کریں گے۔ شاید ہم ایک دم کھڑے ہو کر چیخیں مارنے لگیں گے۔ اور پھر ہم سب اس رفتار اور اس بوجھ کے صدمے سے زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے اور پھر جہاز دھماکے سے پھٹ کر ہمیں دور دور بکھیر دے گا۔ اور بعد میں اگر ہمارے ہمارے عزیز ادھر پہنچ بھی گئے تو ہماری لاشیں شناخت ہونے میں بڑا گھپلا ہو گا۔ پتا نہیں میرے نام کی قبر پر کون صاحب براجمان ہوں گے۔

اب میں نے سوچا جہاز چھوٹا اور مسافر کم ہوں تو لاشیں شناخت ہونے میں زیادہ دقت نہ ہو۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے موت سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ میں نے والدہ کی عطا کردہ حمائل شریف کوٹ کی جیب سے نکالی اور ہاتھ میں مضبوط پکڑ لی۔ اور پانچوں کلمے آزمائشی طور پر جلد جلد پڑھے۔ میں نے برسوں سے پانچوں کلمے ایک وقت نہیں پڑھے تھے۔

سامنے والی منزل میں تین آدمی زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ

آپس ہی بیہودہ لطیفے سنا رہے ہوں۔ وہ غٹاغٹ بیئر پی رہے تھے۔ اور ہنس رہے تھے۔ ان میں سے دو اچھے خاصے افسر تھے۔ ایک بکار سرکار جا رہا تھا اور ایک رخصت پر۔ ایک کی مونچھیں الگ الگ پھڑک رہی تھیں۔ وہ ایک مطمئن آدمی معلوم ہوتا تھا۔

یہ صبح کا وقت تھا۔ ہم کراچی سے سات یا آٹھ بجے چلے تھے۔ ہمیں ابھی ناشتہ کرایا گیا تھا۔ جہازی ناشتہ اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے سفر اتنا لمبا ہو کہ دوسری صبح ہو جائے اور پھر ایسا ہی ناشتہ ملے۔

ایک بار پھر موت کا خیال آیا مگر عیر جنسی آئی یعنی ملک کے اندر ہوائی سفر کے دوران میں تو آپ کو خوف نہیں آتا جب کہ چھوٹے چھوٹے ڈکوٹے اور وائی کاؤنٹ ہوتے ہیں اور اب جب یہ مضبوط محل کا محل ملا تو ایک دم فلسفی بن گئے۔ مگر نہیں گھر گھر ہے اور پردیس پردیس۔ بہرحال تو یہ ضرور کرلینی چاہیئے۔ خواہ نیچے اتر کر دہی تو یہ والے گناہ پھر دہرائے جائیں۔

ہم تہران پہنچ گئے۔

تہران کا ہوائی اڈہ بہت خوبصورت ہے۔ اس کا نام مہرآباد ہے۔ عمارت کے اوپر استقبال کے لیے بہت کشادہ چھتیں ہیں کسٹم کا انتظام ہم سے بہت بدتر ہے۔ مگر کسٹم والوں کی وردیاں بڑی شاندار ہیں۔ فوجیوں کی وردیاں بھی زرق برق نظر آتی ہیں۔ ایک میانہ قد کا جنرل سنہری روپہلی وردی پہنے کر و فر سے ہماری طرف آیا۔

"آیا شما سفیر کبیر پاکستان ہستید" (کیا آپ پاکستان کے سفیر ہیں۔ ہم نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے نظر دوڑائی تو فرسٹ کلاس سے ایک پاکستانی عہدیدار اتر رہے تھے جو اس وقت وزارت خارجہ میں ڈائریکٹر جنرل تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ہمارے قریب ہی پہنچ گئے اور جنرل موصوف نے انہیں بڑے جوش سے سلوٹ کیا۔ وکیل مرعوب ہو گیا۔ میں بھی بہت مرعوب ہوا۔ میرے دل میں اہل ایران کے لیے خیرسگالی کے جذبات امنڈنے لگے۔ افوہ یہ لوگ ہمارے ایک عہدیدار کے لئے ایک جنرل کو بھیجتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ ہمارے افسر ایران کے مہمان نہیں ہیں بلکہ عراق جا رہے ہیں۔ اور یہاں صرف مختصر قیام ہے۔

ہمارے پاکستانی افسر نے ہماری بھی رہنمائی کی۔ کسٹم والوں نے ایرانیوں کو بداخلاقی سے روک لیا۔ ہم کو بڑی خوش اخلاقی سے خوش آمدید اور الوداع کہا۔

راستے میں میں نے پاکستانی افسر صاحب سے اردو میں خراج عقیدت پیش کیا۔

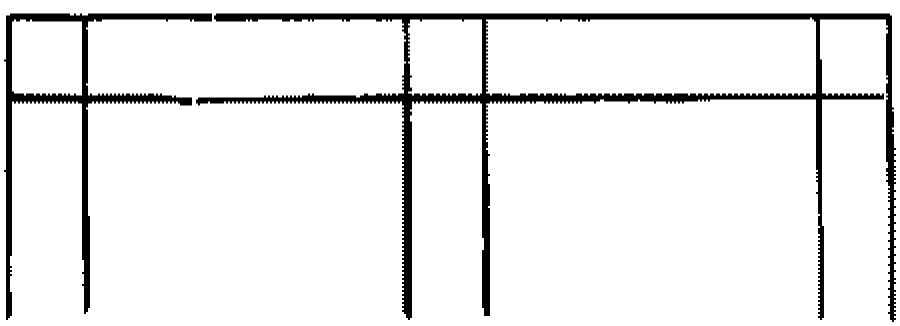
"جناب!" میں نے کہا "آپ تو واقعی بہت بڑے آدمی ہیں کیا یہ جنرل آپ کو بہ اعتبار عہدہ لینے

لینے آئے ہیں۔ آپ تو سفیر کبیر نہیں ہیں۔ بہرحال۔!" "ارے بھئی! یہ ایران ہے۔ تم ادیب لوگ ہماری ایرانی تہذیب سے واقف ہو کر بھی اسے نہیں سمجھتے۔ بابا نہ میں سفیر ہوں نہ یہ حضرت جنرل ہیں! ہاں یہ ایک جنرل دوست کے ایسے وردی سی قسم کی چیز ضرور دی ہیں۔"

میں نے ان کی وردی پر غور سے نظر ڈالی۔

"بس وردی ہی وردی ہے"۔ ہمارے افسر مسکرائے "اچھا آپ اس چکر میں نہ پڑیے۔ شہر دیکھیے!"

شہر نہایت خوب صورت ہے۔ ہوائی اڈے سے شہر تک کا راستہ تو گویا ایک طویل باغ کی طرح ہے۔ دورویہ سرو کے بوٹے لگے ہوئے۔ سڑک شیشے کی طرح چمکتی ہوئی۔ شہر کی دوسری سڑکیں بھی مصفا اور کشادہ موٹریں بے حد تیز رفتار سے دوڑتی ہیں۔ یہ تہران جدید ہے تہران قدیم لوگس سا تھا۔ گلیاں اور دھول اور گندگی۔ کہتے ہیں کہ موجودہ شاہ ایران کے والد رضا شاہ پہلوی نے ایک دن ایک کاغذ اٹھایا اور اس پر سیدھی سیدھی سڑکوں کے خطوط ڈالے کچھ اس طرح۔



اور کہا شہر کو یوں کر دیا جائے اور شہر یوں ہی کر دیا گیا۔ نہ کسی کو رٹ پیش کرنے دیا گیا نہ فوجداری نہ دیوانی۔ بس نقشہ بنا شہر بن گیا۔ اور وہاں سے ایرانِ جدید کی ابتدا ہوئی۔ میں نے سوچا، صاف مضبوط لمبی سڑک اور رٹ پیٹیشن میں کس کا انتخاب کیا جائے مگر کیا یہ مسئلہ اتنا ہی سادہ ہے۔

(اس کا جواب مجھے روس اور برطانیہ اور امریکہ دیکھنے کے بعد بھی نہیں ملا۔)

اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ پتا نہیں کراچی میں کیا بجا ہوگا۔ ساڑھے نو یا ساڑھے دس۔ کیونکہ مغرب کی طرف جاؤ تو وقت گھٹتا رہتا ہے۔

"بفرمائید، بفرمائید!" ہمارے ہوٹل کے آگے ایک دربان جھک جھک کر کہہ رہا تھا۔

ہمارے پاکستانی افسر آگے چلے گئے تھے۔ وکیل ہوائی اڈے پر رہ گیا تھا۔ میں اور صحافی باقی رہ گئے تھے۔ صحافی انگریزی زیادہ جانتا تھا۔ میں نے از خود قیادت سنبھال لی۔ قیادت کا معاملہ ایسا ہی ہے کبھی مل جاتی ہے اور کبھی حاصل کی جاتی ہے۔

"چہ می خواہید" میں نے پوچھا۔ میں سمجھا یہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ پوچھیے یا جواب دیجیے۔

"بفرمائید" اس نے دوبارہ کہا اور جھک کر ہمارے بکس اٹھا لئے۔ معلوم ہوا کہ بفرمائید ایک وسیع المعنی لفظ ہے جو آئیے۔ فرمائیے۔ خوش آمدید۔ بیٹھیے۔ جیسی ہزارہا صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مرد سوٹوں اور خواتین اسکرٹ پہنے ہوئے کیا مجال ہے جو مصور چغتائی صاحب کا پیش کردہ ایرانی لباس کہیں نظر آیا ہو۔ گھٹنوں سے اونچا اسکرٹ اور کھلا منہ۔ گورے گورے رنگ۔ بھرے بھرے جسم اور بڑی بڑی آنکھیں۔ ۱۹۳۵ء میں رضا شاہ اوّل نے برقع پہننا جرم قرار دے دیا تھا اور علما نے ایران اپنی اپنی مسندیں سنبھالے بیٹھے رہے اور بھری بھری پنڈلیاں اور گورے گورے بازو ننگے ہو گئے۔

رضا شاہ اوّل زندہ باد

بڑی سڑکوں کو خیاباں کہتے ہیں۔ خیاباں پہلوی۔ خیاباں فردوسی۔ زیادہ تر سڑکیں ایرانی نژاد مشاہیر کے ناموں پر ہیں۔ اسلامی مشاہیر کا چکر یہاں نہیں چلتا جو ہم نے اپنے شہروں میں چلا رکھا ہے کہ جہاں لبسی بسائی اور طارق روڈ، خالد بن ولید روڈ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں ایرانی وغیر ایرانی کا فرق بہت واضح ہے۔ ہائے بیچارے علامہ اقبال۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہمیں ایک دم وطن یاد آنے لگا اور ہم سیدھے اپنے سفارت خانے پہنچے جو خیابانِ پہلوی پر واقع ہے۔ سفارت خانے والے پاکستانیوں سے تنگ معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے ہمارے نام اور پتے بھی نہ پوچھے ہمیں مزدوری کے متلاشی سمجھ کر کنّی کاٹنے لگے۔ صحافی بہت جھلایا، اس نے فوراً اپنے سابقہ تجربات کے حوالے دئیے۔ غیر ملکیوں کے اخلاق کی تعریف اور اب مثالیں دے رہا تھا کہ ایک پاکستانی دوست مل گئے اور ہمارے سب شکوے دُھل گئے۔

ہمارے پاس چوبیس گھنٹے تھے۔ کل صبح ہمیں عراق جانا ہے۔ جہاں ہم عراقی وزیر اعظم جنرل عبدالکریم قاسم کے مہمان ہو کر ان کے انقلاب کی دوسری سالگرہ میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ تہران دیکھنے کے لیے آج ہی کا دن ہے۔

ہم نے تھوڑی دور تک پیدل چلنے کی ٹھانی۔

موسم خنک تھا۔ موٹریں زن زن کرتی ہوئی دوڑ رہی تھیں لوگ خوبصورت، اور غریب نظر آتے تھے جو امیر نظر آتے تھے وہ بہت تیزی سے گزر جاتے تھے۔

ایک چائے خانے میں دو آنے والی چائے منگائی۔ میلی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے پینی شروع کی

بعد میں فارسی بگھارنے لگا۔

"از پاکستان ایم" (ہم پاکستانی ہیں) "قیام یک شب می خواہیم" (ایک رات ٹھہرنا ہے)

"می خواہیم" سے ہوٹل والا سمجھا کہ ہم وہیں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔

"سرائے نیست" (یہ سرائے نہیں ہے) وہ جلدی سے بولا "در رستوران است جائے مجوز قیام رو جائے دیگر بکنید" جائیے میاں اور کہیں (اور ٹھہرو)

میں نے اپنے فارسی کے اُستاد کو بہت کوسا جنہوں نے ہمیں جدید فارسی اس لیے نہیں پڑھائی کہ وہ فارسی زبان کو حافظ و سعدی پر ختم سمجھتے تھے۔

سامنے ایک فوٹو چوکھٹے میں لگا ہوا تھا۔ یہ ایک تندرست انسان کی ہستی کی تصویر تھی جس نے عربی لباس پہن رکھا تھا۔ گھنی گھنی داڑھی۔ عمدہ ناک نقشہ۔ اس تصویر کے گرد ایک نقرئی ہار پڑا تھا۔

"ایں کیست" (یہ کون ہیں) میں نے پوچھا۔

"علی مرتضےٰ مولائے کونین علی مرتضےٰ" جواب ملا۔ ہم نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

میں نے باہر نکل کر ویسے ہی دو تصویری کارڈ خریدے مگر وہ کراچی نہ پہنچ سکے۔

ہم نے بس میں بیٹھ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک شہر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک نوعمر خاتون برابر آ بیٹھیں ہم آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ قرعہ فال میرے نام نکلا۔

"ما از پاکستان آئیم" میں نے کھنکار کر کہا۔

"بفرمائید۔ بفرمائید" وہ سراپا اخلاق بن کر بولیں۔

"چہ ساعت است" (وقت کیا ہے) میں نے سوال کیا۔

انہوں نے میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور اگلے اسٹاپ پر اُتر گئیں۔

شاہ ایران کا محل بیچ شہر میں واقع ہے۔ ایک لوہے کا دروازہ جنگلے دار اور نیچی نیچی فصیل نما دیواریں اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم اس کے آگے کھڑے دیکھتے رہے۔ برابر میں ایک نوجوان ایرانی بھی کھڑا تھا۔ ہم نے پھر ٹانگ اُڑائی۔

"عمارت خوب است"

"از خون ماست۔ از خون ما است۔ از خون ایرانیان است" (ہمارے خون سے بنی ہے۔ یہ ایرانیوں کے خون سے بنی ہے۔) وہ تقریباً بڑبڑانے لگا۔ وہ طالب علم تھا۔ کہیں کہیں ایسے لوگ تخریب پسند کہلاتے ہیں۔ مگر یہ ہوتے سب جگہ ہیں۔ سوائے انگلستان کے۔ جہاں ملکہ معظمہ کے شاندار بکنگھم پیلس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا مگر یہاں اعتراض

بھی ہوتا ہے اور گرمی بھی چلی جاتی ہے۔

تہران ایران کا سب سے پرانا شہر نہیں ہے اور دارالخلافہ تو بہت نیا ہے۔ قاچاری بادشاہ آغا محمد خان قاچار نے اُسے پہلی بار دارالخلافہ قرار دیا نہ جانے ان کی کیا مصلحت ہوگی۔ خیر دارالخلافوں کا کیا ہے۔ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔

"ہما ایران بہ بینیم آغا ایران ملک خوب است" (پورا ایران دیکھو ایران خوب ملک ہے) ایک بوڑھے نے ہمیں اجنبی جان کر کہا۔ "وقت کم است"۔ میں نے سیدھی سیدھی اُردو بولی۔ بوڑھے کے سفید چہرے پہ جھریاں مسکرائیں اور اردو بولنے لگیں۔

"میاں تم ایک دن میں کیا دیکھو گے۔ یہ ایران ہے۔ زمانۂ تاریخ سے بھی پہلے کا مخزن۔ تم تہران کی سادہ سڑکوں پہ موٹروں اور بسوں میں گھوم گئے۔ خوبصورت اور مہنگے ریستورانوں میں کھانا کھا گئے اور گھر جا کر شیخی بگھاروگے کہ تم خسرو، نوشیرواں اور سعدی و حافظ کا ایران دیکھ آئے اور پھر تم ایرانی مسائل پہ اپنی رائے ہم کو دیا کروگے۔ آؤ میری آنکھوں میں میرے چہرے کی جھریوں میں ایک جھلک دیکھ لو"

مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگا۔ وہ سوکھی اور گہری جھیلوں کی طرح تھیں جن کے سوتے خشک ہوگئے ہوں اور جن کے گرد کھڑے ہوئے سرسبز پہاڑوں کو پالا مار گیا ہو۔

"ونڈرفل" صحافی چلّایا۔ "ونڈرفل۔ دیکھو بھائی کیا خوبصورت موٹر جاتی ہے اور کیا پیارا جوڑا بیٹھا ہے چلو یار اس کے پیچھے ٹیکسی دوڑائیں"

صحافی پاکستانی قومی کردار کی بات بھول گیا تھا۔ میں اس موٹر کو ایک ساعت کے لیے دیکھ سکا۔ وہ ایک لمبی کیڈلک تھی جس پہ نہایت پیارا بنفشی رنگی پینٹ چمک رہا تھا۔ اس کے آگے ایران کا قومی نشان اُڑ رہا تھا، اس پرچم میں آڑی آڑی پٹیوں پر سفید سبز اور سرخ رنگ ہے اور بیچ کی پٹی پر سنہرا شیر بنا ہوا ہے۔ جس کے ہاتھ میں تلوار اور جس کی پشت پر طلوع آفتاب کا منظر ہے۔ ہلال ستارہ۔ یہ سب اسلامیت یا عربی اسلامیت کے مظاہر ہیں۔ ایران میں تو فردوسی کا سکّہ چلتا ہے۔ فردوسی۔ ملک الشعراء ایرانی زبان کا باوا آدم جس نے شاہنامہ لکھا اور فارسی زبان و تہذیب سے عربی الفاظ اور اسلامی سورماؤں اور مشاہیر کے نام نکال دیئے۔ شاہنامے میں خیالی سورماؤں کے قصوں میں وہ اُن کے پرچموں کی تفصیل بھی بیان کرتا ہے اور یہ شیر اور سورج وہیں سے ایرانی پرچم پہ لائے گئے ہیں۔

ایران۔ ہمارا دوست ہمسایہ۔ اسلامی ملک جہاں دو کروڑ مسلمان بستے ہیں اور جو سنٹو میں ہمارا ساتھی بھی ہے اس کی آبادی ہم سے پانچ گنا کم مگر مسائل دس گنا زیادہ ہیں۔ پہلے اس کا نام فارس تھا اور اس کی زبان آج تک فارسی کہلاتی ہے۔ موجودہ شہنشاہ کے والد رضا شاہ اوّل نے ۱۹۳۵ء میں اس کا سرکاری نام ایران رکھ دیا۔ اصلاحات

کی رو میں بعض اوقات ملکوں تک کے نام بھی بدل دیئے جاتے ہیں۔ ایران کے معنی آریاؤں کا گھر۔ فارس اُس کے ایک صوبے کا نام تھا جس کا سردار سائرس بہت طاقتور آدمی تھا اور اسی نے پورے ملک کا نام پارس یا فارس رکھ دیا۔ انگریز اور انگریزی کی بدولت ہم اسے پرشیا پرشیا ہی کہتے رہے مگر رضا شاہ کے آہنی عزم نے اپنے ملک کا نام بھی تو بیالیا۔

اپنی ثقافت اور مذہب کے معاملے میں بھی ایرانی عربوں سے بغاوت کر گئے۔ ثقافت میں انہوں نے خالص ایرانی شعار اختیار کیے خواہ وہ ماقبل اسلام سے لیے جائیں، زردشت اب بھی ایک طاقت ور استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سائرس داریوش آج بھی ایرانی تاریخ کے ہیرو ہیں۔ مذہباً ۹۵ فیصد ایرانی شیعہ ہیں۔ ایرانی مزاج کی نزاکت اور شستگی کی تہوں میں ذہنی آزادی اور خود مختاری کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں جو کبھی نوشیرواں کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں کبھی محمد علی باب کی شکل میں کبھی رضا شاہ پہلوی کی تحریک میں کبھی مذہبی اختلافات کی شکل میں، ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم مصدق نے بھی برطانوی پنجۂ اقتدار سے نکلنے کے لیے تیل کی صنعت قومیالی تھی۔ مگر اس بار ایرانی مزاج کی چنگاریوں نے خود اپنے آپ کو جلا لیا۔ تین برس بعد پھر غیر ملکیوں کو مراعات مل گئیں۔ ایران میں تیل کے چشموں سے روزانہ کوئی نو لاکھ کنستر بھر کر غیر ملکی نفع اندوزوں اور مقامی استحصال پسندوں کی نذر کیے جاتے ہیں۔

اور اس بوڑھے کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہوتی جاتی ہیں جو مجھے پورا ملک دکھانا چاہتا ہے۔

"نانا بابا" میں نے بوتی ٹوٹی جھریوں سے کہا "میں ایک نوکر پیشہ مجبور زباں بند آدمی ہوں۔ پھر میں اردو کا شاعر بھی ہوں جو عاشقانہ کلام نہ لکھے تو لوگ اسے شاعر ہی نہیں مانتے۔ میں پورا ایران کیا دیکھوں گا۔ مجھے تو یہ صاف چکنی سڑکیں یہ عالیشان محلات یہ آراستہ عجائب گھر یہ لمبی لمبی موٹریں اور یہ سرخ و سپید ایرانی لڑکیاں ہی کافی ہیں۔ اگلی بار آؤں گا تو مذہبی اور تاریخی روایات سے مجبور ہو کر اصفہان، مشہد اور قم کی زیارت کر لوں گا اور سعدی و حافظ کے مزاروں پہ جاؤں گا۔ ایک غزل کہی ہے میں نے حافظ کی زمین میں، وہ خوش الحانی سے سناؤں گا اور اپنے عہد سے کی ترقی کی فکر میں فال بھی نکال لوں گا۔ مجھے تمھارے بوسیدہ کپڑوں، تمھاری بھوک، تمھارے افلاس، تمھارے جاگیردارانہ نظام کی پیچیدگیوں سے کیا تعلق۔ میرے اپنے وطن کے مسائل بہت سے ہیں۔ جب میں اُن کے معاملے میں بولتا ہوں تو یار لوگ پروپیگنڈا کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں اور افسر لوگ کسی تنقید کسی نعرے کو اپنے اختیارات پر حملہ سمجھ کر میرا ٹینٹوا کاٹنے کی تجویز کرتے ہیں۔ آؤ سنو۔ میری آواز ایسی بُری نہیں۔ سنو لسان الغیب حافظ شیرازی کیا فرما گئے ہیں۔

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید

وہ لمبی کار بہت دُور جا چکی تھی۔ اِدھر خیابانِ پہلوی کے دوسرے سرے پر کئی میل دُور شہر کے کنارے کوہِ شمران تھا جہاں گرمی کے موسم میں تہران کے لمبی کاروں والے باشندے ہوا خوری کو جاتے ہیں۔ ہم نے پھر ٹیکسی لی اور کوہِ شمران کی طرف چل دیئے۔ اسی راستے پر ہمارے سفیر کا گھر بھی ہے۔ اگر انہوں نے گھاس ڈالی تو ایرانی اور پاکستانی بین الاقوامی مسائل پر تبادلۂ خیال کریں گے اور ایرانی مشروبات پئیں گے۔ ہم نے جھریوں والے چہرے کو بھول جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

خیابانِ پہلوی پہلے ایک چوڑی سڑک کی طرح نظر آتی رہی جیسی وہ ہے، اگر چند ہی لمحے میں منظر پورے ایران میں بدل گیا۔ یہ سرزمین میرے نظریاتی وطن سے کچھ مختلف ہے۔ ہم نے ایک برِّصغیر کے دو کونوں پر قبضہ کیا اور ایک نیا نام رکھا۔ پاکستان۔ پاک سرزمین۔ کشورِ حسین۔ نشانِ عزمِ عالی شان۔ منزلِ مراد۔ پاکستان امد اُنہوں نے اپنی ہزار سالہ عرب روایت سے بغاوت کر کے اسے پھر ایران کہا۔ ایران۔ آریاؤں کا گھر۔ آریا جو ایشیائے کوچک سے نکل کر چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ سفید فام آریا جو آج تک عربی تہذیب سے برِّصغیر ہند و پاکستان اور ایران میں آمیز نہیں ہو سکے۔ ایک نصب العینی وطن اور ایک خاص نسلی ملک میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں۔ پھر پاکستانی ہیں۔ شاہ صاحب پہلے ایرانی ہیں بعد میں شیعہ سنی وہابی، زردشتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے شعر کی تلوار سے ملت اور وطن میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

مگر ان کی آواز ایرانیوں اور عربوں تک نہیں پہنچی۔

ٹیکسی ڈرائیور کبھی تیز چلاتا تھا کبھی بہت سُست۔ ہم نے آگے ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا سی تھیں۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

"چہ حال است۔ شما بخیر ہستید؟" کیا حال ہے۔ اچھے تو ہو)

وہ سمجھا نہیں۔ اس نے گاڑی ایک طرف ٹھہرائی اور پنسل کاغذ نکال کر دیا۔ پھر وہ اُونگھنے لگا۔ میں نے یہی فقرہ بڑے بڑے حرفوں میں لکھا۔

"ہا ہا ہا" وہ ہنسنے لگا۔ "آب جو خوردہ ام۔ مترس۔ خیلے ہوش دارم" (میں نے بہت پی رکھی ہے۔ ڈرو مت میں ہوش میں ہوں)

"شما کرد ہستید؟" (تم کُرد ہو) میں نے پوچھا۔ میں نے سوچا اس کی خوشامد کی جائے تاکہ ہم زندہ رہیں۔

" ترجمہ ستم۔ ترجیح" وہ زور سے بولا۔

ہمیں بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ ترک تھا۔ واہ رے ہندوستان کی فارسی۔ ہم تو یہاں تیل بھی نہ بیچ سکیں گے۔

گاڑی پھر چلی اور پھر ایران کا منظر کھلا۔ ایک دن قیام کے خوف نے تصورات کی آنکھیں کھول دیں اور میں یادوں اور کتابوں کی بیساکھیوں پر چلتا ہوا سرزمین ایران میں گھومنے لگا۔ میرے خیال میں آریاؤں کی یلغار کی تاریخ سے پہلے کا زمانہ بھی کیا ہوگا۔ نہ معلوم یہاں کون کون سی قوم بستی تھی جسے آریاؤں نے مار دیا یا نکال دیا اور اب وہی آریا ایرانی کہلاتے ہیں اور جذبہ حب وطن سے سرشار ہیں۔ ابھی دو سو برس پہلے یورپی آبادکاروں نے ریڈ انڈین قوم کو تہس نہس کر کے ممالک امریکہ کی بنیاد ڈالی اور جو ریڈ انڈین بچ گئے وہ صحراؤں اور پہاڑوں میں محصور کر دیئے گئے اور آج سفید فام امریکی بھی جذبۂ حب وطن سے سرشار ہیں اور دنیا بھر کی قوموں اور ملکوں میں خود اختیاری کی حفاظت کے نعرے لگاتے ہیں۔ آخر یہ وطنیت کیا ہے۔ تاریخ کے بنجر دھاروں سے جو حقیقتیں ابھرتی ہیں اُن کے آگے حق و انصاف کے زرّیں جامد اصولوں کی کیا قیمت ہے۔

جلد میاں باتیں مت بناؤ ایران دیکھو۔ شمال میں کوہستان البرز ہے جس کے دوسری طرف بحیرہ کیسپین پھیلا ہوا ہے۔ ہماری کہانیوں میں کوہ قاف کی پریاں اسی پہاڑ پر سے اُڑتی ہوئی آئی ہیں اور بحیرہ کیسپین کے نیلے پانی پر روسی جہاز اور ایرانی جہاز اپنی اپنی دفاعی مشقیں کرتے رہتے ہیں۔ دفاع کا لفظ تو آج استعمال ہو رہا ہے۔ اب سے دو ڈھائی ہزار برس پہلے بھارت ورش کے ایک مشہور سیاستداں جناب چانکیہ نے اپنے مہاراجہ کو عالمی سیاست پر درس دیتے ہوئے کہا تھا۔

مہاراج اپنے ہمسائے پر حملے کے لیے تیار رہیئے۔

کیونکہ اپنی حفاظت بڑی ضروری ہے۔

مہاراج ہمسائے کو طاقت ور نہ ہونے دیجئے کہیں وہ آپ پر حملہ نہ کر دے۔

کیسپین کا رنگ نیلا ہے یہ رنگ میں نے خود صاف طور پر دیکھا ہے جب میں روس سے ترکستان آ رہا تھا۔ اور اس کے کناروں پر مچھلیوں کے انڈے پائے جاتے ہیں ان کا نام ہے کیوی یار۔ سرخ اور سیاہ انڈے جو ایران یورپ اور روس اور امریکہ میں بڑی مہنگی غذا سمجھے جاتے ہیں اور جنہیں سفید خواتین کی بیگمات اور انگریز بیبیں بہت پسند کرتی ہیں۔

وہ دیکھو جنوب میں کوہ زاگروس ہے جس کے دامن میں شیراز ہے۔ شیراز۔ ترک شیرازی والا شہر۔ اور

زیگروس سے مغرب کی سمت جاتے ہوئے قبرستان کے میدان ہیں جن کے آگے آبادان اور مسجد سلیمان ہیں جہاں تیل نکلتا ہے جو ایران کی قومی دولت ہے اور جس کی خاطر ایران نے اسی صدی میں فرنگیوں کے ہاتھوں بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ ان چشموں کی تہوں میں لاکھوں مزدوروں کا پسینہ بہہ رہا ہے۔ انہی چشموں نے ۱۹۴۱ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے شعلوں کو اس طرح ہوا دی تھی کہ رضا شاہ پہلوی کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا اور انہی چشموں میں وزیر اعظم مصدق کے قومی عزائم دفن ہیں۔

اور ایک دم فضاؤں میں گھل مل کر بیک نظر پورے ایران کا احاطہ کرد تو دو کروڑ کی اس وسیع آبادی اور اس قدیم تہذیب والے ملک میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے۔ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو حافظ اور سعدی اور فردوسی کے کلام سے اس طرح مزے لیتے ہیں جیسے ہمارے اردو جاننے والے! انہیں غزلوں اور قصیدوں اور مثنویوں کی بجائے مختلف نعرے یاد ہیں مطالبات یاد ہیں اور وہ شکوے یاد ہیں جو سینکڑوں سال کی غریبی اور تنگ داماں نے انہیں تحفے میں دیئے ہیں۔ میں کان کھول کھول کر سنتا ہوں مگر مجھے جدید ایرانی شاعری میں بلبل کی وہ صدائیں نہیں سنائی دیتیں جو اردو شاعری یہاں سے مانگ کر لے گئی ہے۔ وہ گلاب وہ سنبل وہ نرگس و نسترن وہ سب کہاں ہیں جن کے لیے ہم اردو کے شاعر بارہ سو میل دور بیٹھے قافیے پر قافیہ اور ردیف پر ردیف کہے جاتے ہیں۔

میں پھر خیابان پہلوی پر اُتر آتا ہوں۔ موٹر چل رہی ہے۔ صحافی دونوں طرف جلد جلد دیکھ رہا ہے جیسے دو رویہ مناظر کو پی جانا چاہتا ہو۔ ہاں یہ شہر بہت جدید ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ مگر شہر کے باہر کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکمران کے زمانے میں بہت سی جدتیں ہوئی ہیں۔ تہران، تبریز، شیراز، مشہد اور اصفہان میں تعلیمی اور فنی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ بینک جاری کیے گئے ہیں۔ سڑکیں ریلیں بنائی گئی ہیں مگر اس بوڑھے آدمی کے چہرے کی جھریاں صرف اس کی عمر زیادہ ہونے کی داستان نہیں سناتیں۔ یہاں کے سب سے بڑے اخبار سرکاری ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی خاندان شاہی کو ہوتی ہے۔ سب سے لمبی کاریں وزراء اور شہزادے استعمال کرتے ہیں۔

سفیر صاحب مسکرا رہے ہیں۔ ان کے گھر کافی پارٹی ہے۔ پارٹی میں ایرانی عمائد اور دانشور شریک ہیں۔ سفیر صاحب کسی بات پر مخالفانہ تبصرہ نہیں کرتے۔ سفیروں کا کام مسکرانا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنا ہے۔ عمائد بھی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور بار بار بفرمائید بفرمائید کہتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر گرمجوشی سے ہم خیالی اور دوستانہ کا اظہار کرتے ہیں۔

میں نے ایک ادیب سے باتیں کیں۔ وہ پاکستان رہ چکا تھا بلکہ ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ اس کے لہجے میں خلوص اور الفاظ میں صداقت تھی، وہ پکا قوم پرست ایرانی تھا۔ ایران کے تہذیبی ماضی پر فخر کر رہا تھا۔

اس نے ہمیں بظاہر شاہ ایران کی دلسوزی اور اصلاحات کی تفصیل داستان سنائی مگر وہ بجھا بجھا سا تھا۔ اسے ایران کے مستقبل سے خوف تھا۔ روس کی طویل سرحدوں سے اس کے طاقت ور نظام زندگی کے آثار ایران تک پہنچ رہے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں اتحادیوں نے ایران پر قبضہ کر لیا تھا وہ داستان کبھی بھی دہرائی جا سکتی ہے۔

"ہم اندرونی طور پر بھی مضبوط نہیں ہیں" اس نے کہا۔ ہماری کوئی فکری منزل نہیں ہے۔ تزئین بجائے خود نصب العین نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ایک جذبہ ہے، ایک عشق ہے جو اپنے ملک، اپنے وطن کے لیے پیاری و ساری رہتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ ہم کدھر جائیں اور کیوں؟"

ہم رات کو پھر ملنے کا پروگرام بنا کر رخصت ہو گئے۔ ہوٹل پہنچ کر میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ایک قبول صورت خاتون نے دروازہ کھولا۔ میں چونک گیا۔ جھٹ قدم باہر نکال لیے۔

"بفرمائید" وہ قبول صورت خاتون مسکرائی۔

"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے" میں نے سوچا۔ یہ کمرہ دوسرا ہے یا یہاں خاتون کمرے کے ساتھ ملتی ہے یا یہ کسی کی کوئی چال ہے۔ میں کوئی ایسی انٹرنیشنل شخصیت بھی نہیں ہوں۔!

"چہ می خواہید" (آپ کیا چاہتی ہیں) میں نے بڑے احترام سے پوچھا، حالانکہ مجھے کہنا چاہیے تھا۔ چہ می خواہی"۔

وہ ہنسی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ حضرت بالکل نووارد ہیں۔ "کلفتم"، وہ بولی اور میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کمرہ صاف کرنے آئی تھی۔ اس نے میری گھبراہٹ کم نہ ہوتے دیکھ کر جھاڑن سنبھالی اور باہر نکل گئی۔

معلوم ہوا کہ ایران میں خادمہ کو کلفت کہتے ہیں۔ اردو کے فارسی داں غور فرمائیں۔ شام ہم فروشگاہ فردوسی گئے۔ فروشگاہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ ایسی دکانیں پاکستان میں نہیں ہوتیں۔ کئی منزل کی عمارت تھی۔ شاید پانچ منزل کی۔ پوری عمارت ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ یہاں ہر قسم کا سامان ملتا ہے۔ ہر قسم کے لیے الگ الگ درجے ہیں۔ کتابیں۔ فرنیچر۔ مصوروں کے شاہکار، سلائی مشینیں، سلے سلائے کپڑے جو زیادہ تر امریکی اور برطانوی کمپنیوں کے تھے۔ بہترین نفیس عطر جو ایران میں نہیں بنتے۔ ایک برآمدے میں ریستوران ہے۔ نہایت تجربہ کلف اور خوبصورت خریدار خواتین و حضرات یہاں سستاتے ہیں۔ ہم بے کچھ خریدے سستاتے اور پاکستان میں ایک ایسے ہی ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے قیام پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے تاجروں اور حکومت کو برا بھلا

کیا۔ چند ماہ بعد خبر چھپی کہ ایران باہر کا مال امپورٹ کرتے کرتے غیر ملکی زرِ مبادلہ ختم کر چکا ہے اور وہاں ایک معاشی بحران کے بعد وزارت بدل گئی ہے۔

سات کو ہمارا ادیب دوست ہم سے آ ملا اور ہم دیر تک تہران کی روشن سڑکوں پر گھومتے مستقبل کے اندھیروں اُجالوں پر گفتگو کرتے رہے۔

جب ہم رخصت ہوئے تو وہ جذباتی ہو گیا۔ "ہم ایرانی اندرونی طور پر بڑے مغرور ہوتے ہیں مگر میں تمہیں بتا دوں کہ تم ہم سے بہت بہتر حال میں ہو۔ تمھارے پاس آج تیل نہ سہی۔ تیل کل مل جائے گا۔ یا تم باہر سے منگاتے رہو گے۔ بڑی بات یہ ہے کہ تمھارے پاس ایک نصب العین ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے اور جو امپورٹ بھی نہیں کیا جا سکتا۔" وہ اُداس ہو گیا۔ اب دیکھو ہماری حالت کیا ہے۔ تم تو دو برس غلام رہے۔ ہر لیتی ہر خامی کا الزام انگریزی حکومت پر رکھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے ہو۔ مگر ہم تو صدیوں سے آزاد ہیں اور ہمارے ملک کی اکائی بھی قائم ہے۔ مگر ہم کہاں ہیں۔ ہماری آبادی کا کل نوتی صدی حصہ نوشت و خواند جانتا ہے۔ وبائیں، بیماریاں عام ہیں اور زلزلے الگ ہماری لیس ماندہ معیشت پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا نظامِ حکومت روز بروز حادثوں اور تبدیلیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ پتا نہیں شاہی جمہوریت کا تجربہ ہمارے ہاں اب تک کیوں کامیاب نہیں ہوا۔ حکومت کے معاملے میں ہمارے عوام کا تصور شاہ پرستی پر منحصر ہے اور شہروں کی آبادی جمہوریت پسند ہے لیکن جمہوریت کا تجربہ کسی کو نہیں۔ انتخاب ہو تو ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر جھگڑے فرو ہوتے ہیں اور پھر بھی خونیں انقلاب آتے ہیں۔ تم نے جنرل رزم آرا کا نام سُنا ہوگا۔ وہ وزیرِ اعظم ہو گیا تھا اور پھر قتل کر دیا گیا، پھر اس کے قاتل قتل ہوئے اور پھر قاتلوں کے قاتل۔ روز بنتی بگڑتی حکومتیں آرام سے جم کر کام نہیں کرتے پاتیں۔ تم ادیب ہو نا! میں بھی ادیب ہوں۔ ہمارے ہاں کاپی رائٹ کا قانون ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے ایسے قوانین نہیں جو تمھارے ملک میں یا دوسرے ملکوں میں کبھی سے نافذ ہیں۔ ہمارے ضابطۂ فوجداری کی عمر شاید بیس سال ہے اور ضابطۂ دیوانی کی عمر اس سے بھی کم ہے۔ اس سے پہلے قاضی لوگ اپنے اپنے فقہی عقائد کی بنا پر عدالتیں چلاتے تھے اور تم انتقادیات کی بات کرتے ہو۔ ارے بھائی ہمارے ہاں کبھی وزارت انتقادیات کا تصور ہی نہیں تھا۔ ابھی بارہ تیرہ برس پہلے ایسی وزارتیں ایسے محکمے قائم ہوئے ہیں۔ یہی حال پیر کے قوانین کا ہے۔ سب دس دس بارہ بارہ برس کی عمر رکھتے ہیں۔ مہنگائی تمھارے ملک سے کئی گنا زیادہ ہے اور قوانین میں اس کا علاج نہیں۔"

مجھے انڈین ہائی کورٹ اور قانونی رپورٹیں یاد آئیں۔ اب سے تیس چالیس برس پہلے تو ہمارے ہاں ہزاروں نظائر جمع ہو چکے تھے۔ ہزاروں اہم اور مثالی فیصلے ہو چکے تھے۔ یہ کیا کل دبیل کا ایران ہے۔

دوسری صبح جب میں قدیم ایران سے رخصت ہوا تو مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر پہلے سے زیادہ فخر تھا۔

اس اشاعت میں بابِ ایران بالکل ویسا ہی ہے جیسے روزنامہ جنگ" کراچی/راولپنڈی بتاریخ ۱۳ مئی ۱۹۶۳ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد سفارتِ ایران کراچی نے راقم کے خلاف ۲۹ مئی ۱۹۶۳ء کے روزنامہ جنگ" کراچی میں ایک احتجاجی مراسلہ شائع کیا جو اس باب کے آخر میں دیدیا گیا ہے۔ مصنف سرکاری ملازم تھا۔ سفارتِ ایران نے اُسے آئندہ ویزا کے لئے فہرستِ سیاہ میں شامل کردیا اور شہنشاہِ ایران کے دورِ حکومت میں پھر کبھی ایران نہیں جاسکا۔ حکومتِ پاکستان نے الگ کارروائی کا آغاز کردیا جس سے بمشکل جان چھوٹی۔

جب یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں پہلی بار چھپ رہی تھی تو کاپی ابنِ انشاء مرحوم کی نگرانی میں جوڑی گئی۔ ابنِ انشاء مرحوم نے اپنی دانست میں ایران و پاکستان کے بہترین روابط اور مصنف کو مزید پریشانی سے بچانے کی خاطر اس مضمون سے کچھ حصے حذف کردیئے اور چند فقرے اور سطریں بڑھادیں تاکہ سفارتِ شہنشاہیِ ایران اور حکومتِ پاکستان کا عتاب دوبارہ نازل نہ ہو۔ چونکہ مصنف ابنِ انشاء مرحوم کا دیوانہ اور دوست تھا اس لیے مرحوم کی اس حرکت پر بعد میں کچھ لکھ بھی نہیں سکا۔ بہرحال ابنِ انشاء نے ان مخصوص حالات میں اپنی طرف سے مصنف کے حق میں ہی سوچا تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اب مضمون بالکل اپنی اصلی حالت میں شاملِ اشاعت ہے

(مصنف)

روزنامہ جنگ کراچی میں، مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۶۳ء

"میں آپ کی توجہ آپ کے مؤقر جریدے مورخہ ۱۳ مئی (سنڈے ایڈیشن) میں شائع شدہ ایک "سفرنامہ" (عنوانِ بالا) کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مضمون نگار مسٹر جمیل الدین عالی نے ۱۹۶۰ء میں تہران میں صرف ۴۸ گھنٹے قیام کیا تھا۔ تعجب ہے کہ اس مختصر قیام کے دوران انہوں نے اتنی بہت سی معلومات کیسے حاصل کرلیں۔ زیرِ بحث مضمون میں بعض انتہائی قابلِ اعتراض جملے ہیں جو نہ صرف شرانگیز ہیں اور حقائق پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ایران، ایرانی حکومت اور سربراہِ مملکت کے وقار کو بھی ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ ایران پاکستان کا ایک گہرا اور مخلص ترین دوست ہے اور اس کے خلاف ایک ذمہ دار شخص سے اس طرح کے رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس قسم کے طرزِ عمل کا نتیجہ دونوں ممالک کے خوشگوار تعلقات پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایرانی اخبارات پاکستان یا پاکستان کے صدر کے خلاف کبھی کوئی بات شائع نہیں کرتے توہین کرنے اور برا بھلا کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نیز یہ کہ ایران میں ایک افسر سے لے کر عام آدمی تک کوئی شخص بھی پاکستان کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ ایرانی اخبارات بھی اس سلسلے میں پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ ایران سے متعلق مضامین شائع کرتے وقت زیادہ توجہ سے کام لیا جائے گا۔"

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ نذرنگار

پریس اتاشی، ایرانی سفارت خانہ کراچی

عراق

دجلہ بہ دجلہ

۱۳ رجولائی انیس سو ساٹھ کی صبح ہم تہران سے بغداد کی طرف چل پڑے۔ یہ سفر بھی ہوائی تھا کیونکہ عالمی واقعات کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ سہل انگاری، خوف، خطرات غرض سب کو اس رفتار میں مدغم ہو جانا پڑتا ہے۔

نو یا دس بجے صبح کا وقت ہے۔ تہران کا ہوائی اڈا مہرآباد آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ ہمارا طیارہ وائی کاونٹ ہے یعنی وہی طیارہ جو ہم مغربی پاکستان میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ طیارہ عراقی قومی کمپنی کی ملکیت ہے مگر گوروں کے ملک سے آیا ہے "آزاد" ایشیا کا کوئی ملک اپنے ہوائی جہاز نہیں بنا سکتا۔ یہ ایک ان لکھا عالمی قانون ہے جسے سب جانتے ہیں۔ اس کے باوجود گوری قوموں کی اقتصادی غلامی سے آزاد ہونا نہیں چاہتے بلکہ اپنے جھگڑے پیدا کرنے اور اُلجھانے میں لگے رہتے ہیں۔

جہاز کے ایک طرف موٹے موٹے خوبصورت حروف میں لکھا ہوا تھا

الخطوط الجویۃ العراقیہ

عراق کے بارے میں سنا تھا کہ بہت پس ماندہ ملک ہے اور پچھلے کئی سو برس سے ترکوں، انگریزوں اور پھر خود اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں اس کی حالت اور بھی دگرگوں رہی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عرب قوم نے اپنی قومی حمیت ابھی مکمل طور پر تباہ نہیں کی ورنہ صرف IRAQ AIR LINES لکھا ہوا نظر آتا یا دوسری طرف عربی حروف میں وہی انگریزی کا لفظ ہوتا۔ عراقی ایر لائنز

کیونکہ اپنے پیارے پی۔ آئی۔ اے اُردو میں بھی یہی لکھتے ہیں۔ پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز اس کا اردو ترجمہ ہے۔ (کاش دیلمۃ زندہ باد)

مجھے یاد آیا کہ تہران میں بھی ہر جگہ فارسی نظر آتی تھی۔ ٹیلیفون کو تلفن کہتے ہیں۔

ڈاک کو بست، جو پوسٹ کا مفرس ہے، پریس کو چاپ --- یہ چھاپ سے کتنا قریب ہے ۔ روزمرہ کے سب کام فارسی میں ہوتے ہیں اور حاکم اور افسر خواہ رعایا کے ساتھ دوسری کتنی ہی ناانصافیاں کرتے ہوں مگر کسی کو اپنی قومی زبان بولنے کی بنا پر حقیر اور ذلیل نہیں گردانتے ۔ میں نے سوچا خدانخواستہ اگر ہمارے ملک میں حکومت قومی زبان بولنے لگے تو عوام کے خوش ہونے سے پہلے پہلے خواص اور حکام نہ جانے کیا تختہ پلٹ دیں ملک بھر کی انتظامی مشینری رُک جائے، وکیل عدالتوں میں گھبرا جائیں، لائسنس جاری ہونے بند ہو جائیں، محکمہ ڈاک تار معطل ہو جائے اور مغرب زدہ خاندانوں کی فلرٹ کنواریاں اپنے عاشقوں کے سامنے گونگی نظر آئیں ۔ اچھا، حکومت اور عوام کو تو چھوڑو، ذرا فلرٹ کنواریوں اور بیگمات کا تصور کرو ۔ اب تو جب رمبا سمبا ناچتے ناچتے "محبوب" کے ہاتھوں کی گرفت ان کے گرد سخت ہو جاتی ہے تو وہ سسکی بھر کر کہتی ہیں :

OH! YOU PIG

اب اگر اُردو رائج ہو جائے تو وہ کیا کہیں گی ۔

"اوہ ! تم سور کے بچے"

ظاہر ہے کہ اُردو میں سور کے بچے کے معنی سور کا بچہ ہی ہوتے ہیں کیونکہ ہماری ایشیائی روایات میں ابھی تک سور کو مقام محبوبی نہیں مل سکا ہے پس وہ عاشق فوراً بُرا مان جائے گا لہٰذا اے حکام اور بڑے خواتین! اس ملک کی مغرب زدہ کنواریوں اور بیگمات کے جذبات کا خیال رکھنا اور کم از کم اپنے جیتے جی اس غیر مہذب زبان کو اس کا مقام نہ ملنے دینا ۔

اے میاں لکھنے والے تم نے انگریزی تقریروں میں انعامات حاصل کیے، انگریزی میں نوکری کا امتحان دیا اور انگریزی میں ہی کام کر کے روٹی کھاتے ہو اور موقع ملنے پر باتیں بناتے ہو ۔ مگر یہ بات تو اقبال نے بھی کہی تھی :

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

شاید میرے ساتھی صحافی کو میری آنکھوں سے یہ خیالات صاف نظر آرہے ہیں، وہ بڑی اچھی انگریزی بولتا ہے اور انگریزی کا عاشق بھی ہے مگر وہ ایک نیا پاکستانی ضرور ہے ۔

"صرف انہی ملکوں پر کیا منحصر ہے میرے بھائی" اس نے کہا " دنیا کے کسی بھی آزاد ملک میں کوئی

دوسری زبان کو گھاس نہیں ڈالتا یہ سعادت صرف ہندوستان اور پاکستان کے حصے میں آئی ہے اور اب تو ہندوستان میں بھی انگریزی کا قلع قمع ہو رہا ہے۔ تمہیں اس کی وجہ بتاؤں کہ یہاں کیوں کوئی قومی زبان نہیں پنپ سکتی، اچھا یہ مت پوچھو میں تمہیں یہ ایک فقرے میں بتاؤں کہ ایران، عراق، اور شرقِ اوسط کے تمام ملکوں میں کیوں اپنی اپنی قومی زبانیں رائج ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہنسو گے تو نہیں" اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اصرار کیا۔

"نہیں"

"اس کی وجہ یہ ہے پیارے کہ ان علاقوں میں آئی۔ سی۔ ایس کا وجود نہیں ہے۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس بس آگے بات مت کرو" وہ زور سے بولا

خدا جانے یہ صحرائے عرب ہے یا ابھی مغربی ایران کا ریگستان چل رہا ہے نیچے جھانک کر دیکھو تو ریت ہی ریت نظر آتی ہے اور اوپر نظر کرو تو آفتاب نظر نہیں آتا بلکہ ایک گدلی گدلی سی روشنی دھوئیں میں سے چھنتی معلوم ہوتی ہے۔

"یہ کیا قصہ ہے" ہم پوچھتے ہیں "آفتاب کیوں نظر نہیں آتا جب کہ دن کا وقت ہے اور بادل بھی نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ گرد کی تہیں ہیں جو ہزاروں فٹ بلندی تک چلی جاتی ہیں یہ جولائی کا مہینہ ہے اور ان میدانوں میں گرما کی گردیں مسلسل اڑتی رہتی ہیں اور آفتاب کو چھپا لیتی ہیں میں نے سوچا رات کو چاند بھی دھندلا جاتا ہوگا۔ عربی فارسی کے ادب میں چکور زیادہ نظر نہیں آتی یا آتا۔

بغداد۔ عروس البلاد جو کئی سو برس تک عالم اسلام کا مرکز رہا ہے۔

ہوائی اڈہ معمولی سا ہے، درجۂ حرارت ۱۲۲ پھر بھی گرمی کراچی سے کم معلوم ہوتی ہے یہ گرمی خشک اور مسلسل ہے جو اندیشہ کاغذ پر درجۂ حرارت دیکھنے سے ہوا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔

ہوائی اڈے پر استقبالیوں کا ہجوم ہے کیونکہ ہمارے جہاز میں ہم ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے وی آئی پی آئے ہیں کچھ تہران سے چلے ہیں اخباروں کے مالک، وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ عہدیدار، کچھ مشرق بعید کے ممالک سے براہ تہران بغداد آئے ہیں۔ یہ پورا طائفہ جنرل عبدالکریم قاسم کے انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کرنے آیا ہے بہت سے لوگ فرسٹ کلاس میں آئے ہیں جس کا کرایہ ٹورسٹ

سے تقریباً دو گنا ہوتا ہے۔ سنا ہے کہ تمام ممالک کے دو سو اور دو سو مندوب جمع ہوئے ہیں سب کا کرایہ جنرل صاحب نے عراقی خزانے سے عطا فرمایا ہے۔ ۸ دن کی مہمانی ہے ہر وفد کو ایک موٹر گھومنے کے لیے ملے گی اور اس کے بھی وی آئی پی حضرات کو فی کس ایک کار الگ۔ ہم پورے عراق میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔

یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ دو برس پہلے جنرل صاحب موصوف نے شاہ فیصل اور ان کے چچا شہزادہ عبداللہ اور ان سب کے پپا جناب نوری السعید کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور آج تک خود بھی تلوار کے بل پر حکومت قائم کیے بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا بھر کے اہم لوگ اتفاق سے آج میں بھی ان میں شامل ہوں آ کر دیکھیں کہ دو برس میں انہوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اللہ بخشے شاہ فیصل مرحوم کو نوجوان ناتجربہ کار تھے لیکن نوری السعید صاحب بھی یہ نہیں کرتے تھے کہ کبھی کبھار ہم غریب غربا کو کرایہ دے کر دجلہ کی کشتیوں اور بجروں میں سیر کرانے ہی بلا لیا کریں۔

ہمیں لینے ایک عرب عیسائی بشیر فرجو آئے ہیں جن کے ساتھ ہمارے وی آئی پی ساتھیوں کے لیے ایک میجر بھی ہے۔ میجر بہت نوجوان ہے معلوم ہوتا ہے انقلاب سے پہلے یہ سب لفٹننٹ تھا اور انقلاب کے گھپلے میں ایک دم ڈبل ترقی پا گیا۔

"وفاداری بشرط استواری ہی ترقی ہے۔"

کسٹم والے بجائے سامان کھولنے یا بے شمار فارموں پر دستخط کرانے کے جھک جھک کر معانقہ کرتے ہیں اور مرحبا مرحبا کہتے ہیں۔

"اہلاً و سہلاً" کسٹم کا اعلیٰ افسر ہر ایک کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ ہم بھی وی آئی پی اسٹائل اختیار کر لیتے ہیں ہونٹ دبا کر مسکراتے ہیں گردن تقریباً ٹیڑھی اور بالکل سخت کر لیتے ہیں۔ میں جیب سے ریشمی رومال نکال کر اپنی بھوؤں اور مونچھوں کی گرد صاف کرتا ہوں، اور تازہ سنترے کے عرق کی فرمائش کرتا ہوں۔ اندر کی جیب سے میرا نیا پارکر قلم پھدک پھدک کر باہر آتا ہے اور کسٹم والوں کے خالی فارموں کو آنکھ مارتا ہے۔ بشیر فرجو بھاگ بھاگ کر چھوٹے موٹے کام انجام دے رہے ہیں، وہ ایک بھاری بھرکم سے آدمی ہیں ہر دو منٹ میں ان کا سانس پھول جاتا ہے۔ ان کے گداز چہرے پر ایک چھوٹی سی ناک ہے جس کے نیچے دو مکھی جیسی مونچھیں تیزی کے ساتھ ہلتی رہتی ہیں۔

صحافی نے حسب عادت بغداد، عراق، عراق اور باقی دنیا، باقی دنیا اور عراق اور جنرل قاسم کی

تازہ سیاست اور دنیا بھر کی تازہ سیاست سے لے کر عراق کی سیاست تک کے موضوعات پر بے جانے بشیر فرجو سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ وہ انھیں جنرل قاسم کا ذاتی نمائندہ سمجھ رہا ہے جو انھوں نے خاص ہمارے استقبال کے لیے مامور کیا ہے۔ بشیر فرجو گھبرا رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں ـــــ اور اب بغداد کا منظر کھلتا ہے۔

تو یہ بغداد ہے۔ خلیفہ منصور عباسی کا بنایا ہوا اور ہلاکو خاں کا مٹایا ہوا بغداد۔ ہارون الرشید کا بغداد۔ نوری السعید اور جنرل قاسم اور پتا نہیں کس کس اور جنرل کا بغداد۔

"اہلاً و سہلاً"

"مرحبا!"

بوڑھا دجلہ چپ چاپ ہماری ایئر کنڈیشنڈ کار کو تیزی سے گزرتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ دجلہ میرے اور میرے ساتھی صحافی کے رعب میں کیا آئے گا اس نے کئی ہزار سال قبل مسیح سے لے کر۔ بابل کے حکمرانوں سے لے کر۔ مجھ تک بہت سے آنے جانے والے دیکھ رکھے ہیں۔ وہ سکون اور وقار سے اپنے رُخ کی طرف بہے جاتا ہے۔

عام عراقی شہری پرانے عربی جُبّے دستار اور قبا سے آزاد ہیں۔ کھلے گلے کی قمیصیں اور پتلونیں۔ بُش شرٹیں کم نظر آتی ہیں۔ افسروں اور معززین کا لباس سوٹ ہے۔ خواتین بازاروں میں کم نظر آ رہی ہیں۔ لیکن پردہ یا بُرقع کہیں معلوم نہیں ہوتا۔ وہی اسکرٹ اور کھلی آستینوں کے بلاؤز۔ اس شہر کے دو کونوں پر امام ابو حنیفہ اور غوث اعظم عبدالقادر جیلانی کے مزارات ہیں اور شہر کے بیچ میں کھلی آستینوں کے بلاؤز اور اسکرٹ پہنے اور بال کٹائے سُرخ رنگ کی عراقی خواتین اور بار اور نائٹ کلب۔

ٹورسٹ بیورو زندہ باد! اور اسلام! اسلام!

عراقیوں کے رنگ سرخی مائل ہیں۔ دھوپ کی تمازت سے جلے ہوئے لوگ جذباتی سے اور خوفزدہ لگتے ہیں۔ موٹریں بڑی زیادہ ہیں چھوٹی کم سڑکوں پر ٹینک اور توپوں سے لدی ہوئی گاڑیاں اور فوجیوں سے بھرے ہوئے ٹرک بے تکلف گھوم رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ ٹریفک بھی چل رہی ہے۔ ہمارا ڈرائیور ایک مٹا تازہ عراقی ہے۔ خوش باش۔ ایرانیوں جیسا مکلف نہیں۔ دھڑا دھڑ سگریٹ پیتا ہے اور ......

...... ہمیں بھی پیش کرتا ہے جسے ہم نخوت کے مارے قبول نہیں کرتے۔ اتنی تعداد میں ٹینک دیکھ کر ہمارے چہروں پر ہراس طاری ہو گیا ہے جسے ہمارے ترجمان صاحب بشیر فرجو بھانپ لیتے ہیں۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں، آج کوئی واردات نہیں ہوئی" وہ کہتے ہیں۔

"ہاں شاید کل سالگرہ کی تیاری کے لیے مشقیں ہو رہی ہوں گی" ہم اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

"جی نہیں۔ مگر جی۔ ہاں۔ یہ مشقوں کا ہی سلسلہ ہے" وہ گھبرا جاتے ہیں۔

ڈرائیور بھی ہماری گفتگو میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ مگر وہ انگریزی نہیں جانتا۔ وہ بشیر فرجو سے عربی میں کچھ کہتا ہے۔ مگر وہ سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ میرے دل میں علم و فضل کے اُبال اُٹھتے ہیں۔ میں فوراً عربی بولنا چاہتا ہوں۔ مگر کچھ نہیں سوجھتا۔

"اهدنا الصراط المستقيم" میں سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

"نعم" ڈرائیور شوق سے جواب دیتا ہے۔ نعم۔ جی ہاں۔ درست۔ اچھا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"ما از پاکستان آئیم" میں دل میں فارسی کا فقرہ بنا کر اسے عربی میں ڈھالنا چاہتا ہوں۔ پہلا لفظ کیا ہوگا۔ انت هذا اگر بات بنتی نہیں۔ مجھے مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے۔ میں نے کئی بار قرآن پڑھا ہے۔ بچپن میں تو چند پارے بھی حفظ کیے تھے، مگر میں انگریزی فرفر بولتا ہوں اور قرآن کی زبان نہیں جانتا۔ اور میں پاکستان کو اسلامی نصب العین کے خطوط پر بنتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور اسلامی عربی تاریخ و فلسفہ انگریز مصنفین کی کتابوں میں پڑھ کر کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں بقراطی جھاڑتا ہوں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

سڑک ایک تنگ گلی کے آگے مڑ جاتی ہے۔ ہم اتر کر تنگ گلی میں آتے ہیں۔ ایک کنارے پر ایک چھوٹا سا چوبی دروازہ ہے اس پر لکھا ہے۔ فندق الخیام۔

فندق کے معنی ہیں ہوٹل۔ تو یہ ہوٹل خیام ہے۔ صحافی سخت بُرا مان رہا ہے کہ ہمیں گھٹیا جگہ ٹھہرا رہا ہے۔ وہ مجھے اس احتجاج میں اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے مگر اب دروازہ کھل گیا ہے اور اندر سے خوشبودار برفیلی ہوائیں آرہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ فندق الخیام درجہ اول کے ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہے اس میں کوئی باغیچہ نہیں۔ چاروں طرف سے بند کئی منزلہ عمارت ہے، پوری کی پوری عمارت ایرکنڈیشنڈ ہے۔

ہم ایک خاصے بڑے ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ جس کے بیچ میں ایک مدور ستون ہے اور اس کے گرد نہایت عمدہ چمڑا لپٹا ہے اور چاروں طرف کی گولائی ایک چمڑے کے آرام دہ صوفے میں بدل گئی ہے۔ باوردی بیرے مختلف ٹھنڈے مشروبات اور شرابیں لیے مہمانوں کی تواضع کر رہے ہیں۔

مجھے اور صحافی کو ایک مشترک کمرہ ملا۔ جس کا وہ بُرا مان رہا ہے۔ کمرہ نہایت کشادہ اور آرام دہ ہے۔

ساتھ ہی غسلخانہ ہے۔اضافی ایرکنڈیشنر ہے۔ لکھنے کی میزیں اور خوبصورت برقی لیمپ مگر وہ وی آئی پی ہے مگر میں اس کی تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہے مگر وہ جس اخبار کا نمایندہ ہے منٹ بھر میں عراقی سیاست کے چیتھڑے اُڑا سکتا ہے۔وہ آناً فاناً عالمی سیاست کے پس منظر میں کسی بھی ملک،کسی بھی حاکم کا پردہ چاک کر سکتا ہے (سوائے اپنے اخبار کے مالک کے)

"السّلام علیکم" کوئی گویا چیخ مار رہا ہو۔

ہم مڑکر دیکھتے ہیں تو میر خلیل الرحمٰن مالک و مدیر روزنامہ "جنگ" سیڑھیوں سے تقریباً بھاگتے ہوئے اُتر رہے ہیں۔ میر صاحب ہمارے وفد میں شامل تھے لیکن ایک دن بچانے کے لیے وہ سیدھے کراچی سے آئے ہیں۔

میر خلیل الرحمٰن کو دیکھتے ہی جان میں جان آئی اور صحافی گو دوسرے اخبار کا رکن تھا مگر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔

بشیر فرجو نے میر صاحب کی خاطر داری زیادہ شروع کر دی مگر وہ پریشان ہیں۔ میں گھر تار دینا چاہتا ہوں۔صحافی رپورٹ لکھنے کے لیے ٹائپ رائٹر مانگ رہا ہے اور میر صاحب نماز پڑھنے کے لیے جانماز۔ ہمارے چوتھے ساتھی اور بزرگ لاہور کے پروفیسر شریف علی گڑھ والے ہیں۔ وہ کچھ نہیں مانگ رہے ہیں۔پتا نہیں بشیر فرجو کس بات سے پریشان ہیں۔ ہماری فرمائشوں سے یا پروفیسر کی خاموشی سے۔

"کل صبح چھ بجے سال گرہ کی تقریبات شروع ہوں گی۔آپ صاحبان کو پانچ بجے جگا دیا جائے گا!" سب کو ایک چھپا ہوا پروگرام مل جاتا ہے۔پورے آٹھ دن کا پروگرام جس میں دن کو صرف آدھا گھنٹہ آرام کے لئے اور رات کو چار گھنٹے سونے کے لیے بچتے ہیں۔ان دنوں میں آپ ایک دو دن کی رخصت پر بابل، کربلا، کوفے بصرے جا سکتے ہیں۔ ہم نے بابل، کربلا اور کوفے کے لیے اپنا نام لکھوایا۔ مگر اتنے سویرے اُٹھنے کے خیال سے جھلا گئے اور پھر بشیر فرجو نہایت نرمی سے سمجھاتے ہیں چونکہ انقلاب ٹھیک صبح چھ بجے شروع ہوا تھا،اس لیے تقریبات بھی اسی وقت سے شروع ہوں گی۔ اللہ رے حساس تاریخیت۔

اور دوسرے دن ٹھیک صبح چھ بجے تقریبات شروع ہوگئیں۔

ایک بڑے سے میدان میں ـــــ شاید اس کا نام میدان التحریر ہے۔ایک اُونچا چبوترا اور اس کے گرد اسٹیڈیم کی طرز پر سیکڑوں نشستیں۔ سامنے ایک لمبی اور چوڑی سڑک ہے۔چبوترے پر جنرل

عبدالکریم قاسم فوجی لباس میں کھڑے ہیں اور دائیں بائیں وزراء سفرا غیر ملکی مندوب اور اُن کے پیچھے سیکڑوں کی تعداد میں فوجی۔

سامنے کی سڑکیں بالکل خالی ہیں۔ عمارتوں کے دروازے، نیچی منزل کے مکانوں، فلیٹوں کے دروازے، موڑوں سے کھلتے ہوئے راستے، دائیں بائیں گلیاں سب بند ہیں۔ چھتوں پر دُور دُور تک فوجی کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سڑکوں کے ناکوں پر ٹینک کھڑے ہیں جن کے اردگرد اسٹین برین گنوں سے مسلح فوجی پہرے داری کر رہے ہیں۔ تماشائیوں کا نام تک نہیں کسی مکان کسی دکان کی کھڑکی تک نہیں کھل سکتی۔ چبوترے کے سامنے والی اُونچی عمارت پر جنرل قاسم کا ایک چالیس فٹ لمبا بُت آویزاں ہے۔ بت شاید پتھر کی مورت کو ہی کہہ سکتے ہیں (یا محبوب کو) لیکن میں اسے تصویر بھی نہیں کہہ سکتا۔ گتا کاٹ کر جنرل قاسم کی شبیہہ تیار کی گئی ہے اور اتنا بڑا اور بھاری گتے کا کام تصویر نہیں کہلا سکتا۔

سائرن کی آواز آتی ہے۔ یہاں کے انقلاب کی آواز ہے۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، جنرل قاسم چاروں طرف گھوم گھوم کر مسکراتے ہیں۔ وہ ایک جوان آدمی ہیں۔ میانہ قد۔ مضبوط جسم۔ مگر اُن کی آنکھیں خوف زدہ یا کم از کم وحشت زدہ معلوم ہوتی ہیں۔

اب ایک فوجی بینڈ گزرتا ہے۔ اس کے جوان ایک اچھی طرز پر کچھ گا رہے ہیں۔ میرے پلے صرف دو مصرعے پڑتے ہیں۔

عاش الزعیم عبدالکریم (لیڈر عبدالکریم زندہ باد)

"شعب عراق شعب عظیم" (عراق کے عوام عظیم عوام ہیں)

یہ طرز بہت اچھی ہے اور بھاری آوازیں ان الفاظ کو مؤثر بنا رہی ہیں۔ ہم لوگ آداب سے مجبور ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ اور جنرل قاسم ہاتھ ہلا ہلا کر ہماری تالیوں کا جواب دے رہے ہیں۔

اور اب اہل تقریب کے جلوس شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ سڑک کے ایک طرف کوئی تین میل کی لمبائی میں ہزارہا مرد اور عورتوں اور بچوں کے جلوس مرتب ہیں اور ان کے دونوں طرف فوجیوں سے بھری ہوئی گاڑیاں بھی ـــــ عراقیوں کی وفاداری متزلزل ہونے میں دیر نہیں لگتی ـــــ

دیکھنا یہ ایک چھوٹا سا گروہ کس کا آیا ہے۔ یہ لوگ تھکے تھکے سے چل رہے ہیں۔ ان کے جبے سیاہ ہیں اور سروں پر سفید عمامے ہیں یا کچھ اور!

یہ قریب آئے تو دیکھا کہ عراقی ہائی کورٹ کے جج صاحبان ہیں اور ان کے پیچھے ملک بھر کے مجسٹریٹوں کے نمائندے مجسٹریٹ۔ وہ سب جنرل صاحب کو سلام کرتے ہیں اور عاش عاش کا نعرہ لگاتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

(اے آنکھوں والو۔ دیکھو اور عبرت پکڑو)

اور ان کے ساتھ ساتھ ایک بھدا موٹا توند سنبھالتا ہوا فوجی افسر لفٹ رائٹ کے انداز میں جاتا ہے۔ گویا وہ ان سب کا افسر ہے۔

یہ کرنل مہداوی ہے جو فوجی عدالت کا صدر رہا ہے۔ اور شاید اب بھی ہے۔

اور یہ نسبتہً بڑا گروہ کس کا ہے۔ یہ لوگ شرمائے شرمائے سے ہیں۔ اور ہم تماشائیوں کی طرف سے رُخ پھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ٹیڑھے ہوئے جاتے ہیں۔ ان کے لباس ناہموار ہیں اور ان کے آگے ایک لمبا دُبلا پتلا شخص بڑی بے چینی مگر کسی قدر فخر و غرور کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ ہے ملک الشعرا الجواہری اور یہ حضرات "اتحاد الادبا" کے اراکین ہیں۔ (اتحاد الادبا کا صحیح انگریزی ترجمہ ہے، رائٹرز گلڈ)۔

میں نے میر خلیل الرحمن کی طرف دیکھا جو سُن بیٹھے تھے، ان کی آنکھیں گویا جم سی گئی تھیں اور ان کے ہاتھ میں سنگترے کے شربت کا گلاس پورے کا پورا بھرا ہوا تھا اور پھر میں نے صحافی کو دیکھا جو فٹافٹ اپنی ڈائری میں جلوس کی تفصیل لکھ رہا تھا اور بشیر فرجو بڑی مستعدی اور شوق سے اس کی مدد کر رہے تھے۔ اور پھر میں نے پروفیسر شریف کی طرف دیکھا وہ بالکل خاموش اور پُرسکون تھے۔ وہ تاریخ اور فلسفے کے آدمی ہیں۔ میں نے سوچا کہ دجلہ اور پروفیسر شریف ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔

وکیلوں، اُستادوں، تاجروں، مزدوروں، خواتین کی انجمنوں، بوائے اسکاؤٹس کے جلوس درجہ بدرجہ گزر رہے تھے، صنعت کاروں کے جلوسوں کے آگے ٹرکوں پر لدی ہوئی چھوٹی چھوٹی مشینیں اور کسانوں کے جلوس کے آگے گندم جو اور کھجوروں سے لدی ہوئی لاریاں۔ ایک بڑی لمبی لاری میں ایک باورچی بڑی بڑی نانیں تیار کرتا جاتا تھا اور سب مل کر پکارتے تھے۔

عبدالکریم۔ عبدالکریم

اور عبدالکریم قاسم دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک مٹھی سی باندھتا تھا اور ان کی طرف رُخ کر کے زور زور سے ہلاتا تھا۔

ایک موٹی بھدی اور ایک نرم و نازک اور شبک سی ایکٹرس کی قیادت میں فن کاروں کا جلوس بھی آیا۔ اس کے ساتھ سازندے تھے جو پیاری پیاری عراقی دھنیں بجا رہے تھے۔

ان کے پیچھے بابل و نینوا کی تہذیب کے نمایندے آئے۔ پرانے لباس پرانے ہتھیار جیسے ہم ہالی وڈ کی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ ان کی قیادت ایک وجیہہ اور لحیم و شحیم آدمی کر رہا تھا جو سفید گھوڑے پر سوار تھا اور جس کی داڑھی چڑھی ہوئی تھی۔

بشیر فرجو نے بتایا کہ یہ شہنشاہ حمورابی ہے۔ حمورابی حضرت عیسیٰ سے کوئی دو ہزار سال قبل بابل و نینوا کے علاقوں میں حکومت کرتا تھا۔ حمورابی کے متعلق میں نے پڑھا تھا کہ وہ افریقہ اور ایشیا کے معلوم حکمرانوں میں سے پہلا حکمران ہے جس نے ملک گیری کے دستور و قوانین بنائے تھے۔

ایک اور میجر صاحب نے فرمایا کہ یہ حمورابی نہیں ہے بلکہ بخت نصر ہے ——— بخت نصر بھی اسی دور کا ایک عظیم شہنشاہ گزرا ہے اور اس نے بھی دستور و قوانین بنائے تھے۔ بہرحال یہ گھوڑے کا سوار بابلی تہذیب کا نمایندہ تھا۔

شہنشاہ حمورابی یا بخت نصر نے چبوترے کے قریب پہنچ کر نیام سے تلوار نکالی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا علم احتراماً نیچے جھکایا۔ تلوار زور سے ہلا کر اس نے کہا

زعیم۔ زعیم۔ زعیم عبدالکریم

زعیم عبدالکریم نے اسے نہایت مشتہ فوجی انداز میں سلیوٹ کیا۔

میں گھبرا سا گیا۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اس پر ۱۴ جولائی کی تاریخ تھی۔ میں نے جلدی سے بشیر فرجو سے پوچھا "کون سا سن ہے۔ یہ کونسی صدی ہے؟"

"سن انیس سو ساٹھ عیسوی" انھوں نے کہا۔ وہ حیران سے نظر آئے "یہ بیسویں صدی ہے۔ کیوں آپ پریشان سے نظر آتے ہیں"

جلوسِ انقلاب بہت دیر تک چلتا رہا یہاں تک کہ دھوپ تیز ہونے لگی اور ٹھنڈے شربتوں کی مسلسل فراہمی بھی بڑھتی ہوئی حدت کو نہ روک سکی۔

اب مندوبین نے پہلو بدلنے شروع کیے۔ لوگ آپس میں چپکے چپکے جنرل کریم قاسم کو برا بھلا کہنے لگے۔

"یہ ہم سے کرایہ وصول کر رہا ہے" میرے ساتھ بیٹھا ہوا اطالوی بولا۔ اطالوی ہم جیسے جلد باز

جذباتی اور بے تکلف ہوتے ہیں۔

"اگر تقریبات کی یہی شان رہی تو ہمیں اپنی صحت پر زیادہ توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا" کسی انگریز نے گھما پھرا کر بات نکالی۔

جنرل قاسم بے تکان چبوترے پر ٹہل رہے تھے اور جب کوئی جلوس چبوترے کے سامنے سے گزرتا وہ سیدھے ہو کر سلیوٹ کرتے۔ ہم نے اپنے ملک میں تو یہ دیکھا تھا کہ سلیوٹ لینے والا ایک ہی حالت میں گھنٹوں چبوترے پر کھڑا رہتا ہے لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ جنرل صاحب موصوف جلوسوں کے درمیان وقفوں میں ٹہل بھی لیتے تھے اور آس پاس کے لوگوں سے بات چیت بھی کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ہماری طرف بھی رُخ کرتے تھے اور ہمارے ساتھی احتراماً تالیاں بجاتے تھے۔

"کیوں بھائی یہ قصہ کب تک چلے گا—؟" میر خلیل الرحمٰن نے دس بارہ فوٹو کھینچنے کے بعد اس طرح پوچھا گویا میں عراق کا افسر تقریبات ہوں۔

میں کچھ نہ بولا۔ میں نے جنرل قاسم کی طرف دیکھا۔ اُس وقت ان کا رُخ ہماری طرف تھا۔ ان کی خوف زدہ اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے ایک شعلہ نما تحریر نکلی۔

"میر صاحب سے کہدو کہ ابھی عرب میں یہ قصہ بہت دن چلے گا۔ کل یہاں شاہزادہ عبدل اللہ اور نوری السعید کھڑے تھے اور آج میں ہوں اور کل کوئی اور آئے گا شاید کرنل عارف اور پھر کوئی اور یہ عرب نشاۃ ثانیہ کا دور ہے اور میں اس طول طویل سلسلے کی ایک کڑی ہوں۔ میں نے اس ملک میں صدیوں بعد ملوکیت کا خاتمہ کر دیا ہے میں ابن عوام ہوں۔ عامی۔ عام آدمی۔ میں نہ ہاشمی ہوں نہ قریشی۔ نہ میں کسی فیصل کا بیٹا ہوں نہ بھائی نہ چچا۔ میں عراقیوں کی ذہنی آزادی کا مظہر ہوں جو انگریزوں اور انگریزوں کے حاشیہ نشینوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اور عرب میں انقلاب ووٹوں اور اسمبلیوں کے ذریعے نہیں آتا۔ ہمارا ووٹ تلوار کی نوک پر ڈالا جاتا ہے۔ عرب انقلاب سے بہت قیمت لیتا ہے اور— اور پھر— پھر اس کی بہت قیمت دیتا ہے۔"

جنرل قاسم کی شدت مسرت سے ہمیں خوف آتا ہے۔ وہ ہر لمحے کو پوری طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں جیسے ایک غریب بھوکے بچے کو نرم تازہ تازہ چوزے کی ایک ٹانگ مل جائے یا جیسے ملکہ قلوپطرہ کسی حبشی غلام کو نواز رہی ہو جو صبح قتل ہو جائے گا۔ جنرل قاسم دن میں تین تین چار چار بار نئی آبادیوں، مسجدوں، مدرسوں، کارخانوں کا افتتاح کرتے ہیں اور گھنٹہ گھنٹہ بھر تقریر کرتے ہیں۔ ہم لوگ دھوپ میں جلتی

ہوئی کاروں میں بند بیس بیس میل اِدھر اُدھر دوڑے دوڑے پھرتے ہیں۔ عام طور پر ہمیں جلتی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنا پڑتا ہے جن پر سورج بڑی بے رحمی سے گرم گرم شعاعیں پھینکتا رہتا ہے۔ ہر تقریب میں سب سے پہلے فوجی بینڈ وہی ایک گیت گاتا ہے۔

"عاش الزعیم۔ عبدالکریم

شعب عراق۔ شعب عظیم"

"اس آدمی کو معلوم ہے کہ بہت جلد قتل ہو جائیگا" ہمارے مدبر ساتھی کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے دنیا دیکھ رکھی ہے ملک ملک کے حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں سے باتیں کی ہیں۔

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا قتل درست ہوگا یا اس کے جانشین اس سے بہتر ہوں گے۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو لیکن اصل میں یہ ایک مخصوص تاریخی عمل ہے۔ عراق میں تاریخ ایک الگ ڈگر پر چل رہی ہے۔ تم اسے تاریخ کا عراقی راستہ کہہ سکتے ہو۔"

جنرل قاسم پر دو برس میں کئی بار قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں ایک بار موصل میں بغاوت بھی ہو چکی ہے جسے انھوں نے فضائیہ کی وفاداری کے بل پر کچل دیا تھا ورنہ وہ علاقے ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ چند ماہ پیشتر ان پر ایک مضبوط اور وسیع حلقے نے حملہ کیا تھا۔ ہمارے ہوٹل کے قریب ہی ایک بازار ہے جہاں سے ان کی کار گزر رہی تھی — سامنے والے فلیٹ سے پانچ آدمیوں نے جھک کر مشین گن چلانی شروع کر دی۔ ڈرائیور اور حفاظتی دستے کے کئی آدمی مارے گئے اور خود ان کی ٹانگوں، بازوؤں اور پسلیوں میں گولیاں اتر گئیں مگر یہ چند ماہ ہسپتال رہ کر پھر زندہ واپس آ گئے۔ ان کی سیاست سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی وہ کمیونسٹوں کی ہمت بڑھاتے ہیں کبھی قوم پرستوں کی، کبھی مذہبی جماعتوں کی۔ ان کے دشمن بہت ہو گئے ہیں۔ دوست کم ہوتے جاتے ہیں۔

جنرل صاحب اپنی تقریروں میں عرب قومیت، عرب اتحاد پر زور دیتے ہیں۔ وہ صدر ناصر کو ملتِ عرب کا لیڈر نہیں مانتے بلکہ پچھلے سال تک خود کو زعیم اوحد کہلواتے تھے یعنی واحد لیڈر۔ اب بھی ان کی تقریروں میں کبھی کبھی صدر ناصر پر چوٹیں ہوتی ہیں۔ وہ دل کھول کر الجزائر کے انقلابیوں کو روپیہ اور ہتھیار بھیجتے ہیں وہ اسرائیل کے جانی دشمن ہیں اور عام طور پر اپنی تقریروں میں کھل کر اسے برا کہتے ہیں — یہ ہر عرب لیڈر کا شعار ہے — اور ایک وسیع تر عرب حکومت، برابر کی حصہ داری میں یہ ان کا خواب ہے۔ شاید یہ سب عربوں کا خواب ہے۔ زرخیز ہلال۔ شمالی افریقہ سے لے کر یمن تک ایک حکومت

مگر ــــــ اس کے باوجود وہ اپنی حفاظت سے مطمئن نہیں۔ انھیں ہردم اپنی جان کا خوف ہے۔ ہر جلسے ہر تقریب میں کھلے طور پر ان کے ساتھ ساٹھ ستر مسلح فوجی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ اپنی برین گن کی لبلبی پر ہوتے ہیں۔ یہ فوجی ہر وقت ان کے گرد کمان کی طرح حلقہ بنائے رکھتے ہیں خواہ کسی مسجد کا افتتاح ہو خواہ کسی عصرانے عشائیے کی تقریب ہو جہاں اسلحہ اور وردی کا ننگا مظاہرہ سلیقہ مندی کے خلاف لگتا ہے۔ مگر

جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہاں اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانے میں چند عمدہ اصلاحات اور تعمیرات ہوئی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تیل کے چشموں پر سے انگریز کی بالادستی ختم کر دی ہے اور اب انگریزوں کو اپنے نفع میں عراقیوں کو بھی ان کے حق کے مطابق شریک کرنا پڑا ہے۔ ہاں یہ کہا جاتا ہے مگر ہم برصغیر ہند و پاک کے رہنے والوں کو اس پر یقین نہیں آتا" بھولے عراقی" ہم سوچتے ہیں " پتا نہیں ان کو حساب کتاب کے گھپلے میں کس نے پھنسا دیا۔ انگریز نے۔ انگریز بھلا یوں آسانی سے مرنے والی چیز ہے۔ انگریز آفتاب کی طرح لازوال ہے۔ انگریز امر ہے۔ کہنے کو تو ہم بھی غیر ملکیوں اور اپنے بچوں سے یہی کہتے ہیں کہ انگریز چلا گیا اور ہم آزاد ہیں مگر اے ایمان والو! اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر سوچو آنکھیں کھول کر دیکھو اور بتاؤ کہ کیا انگریز واقعی ہمارے معاشرے سے چلا گیا ہے۔ پس یہ بےچارے عراقی تو ہم سے بھی زیادہ پس ماندہ ہیں۔ ان کے وزیر ان کے افسر ہمارے وزیروں اور افسروں سے بہت کم تربیت یافتہ ہیں۔ پتا نہیں برطانوی وفد نے انھیں کیا کیا نقشے دکھائے ہوں گے۔ بغداد میں آج بھی تمام تقریبات میں انگریز شرکا کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ ہاں بےچارے بھولے بھالے انقلابیوں نے اپنے ملک کا ظاہر بڑی حد تک درست کر لیا ہے اور روسی ٹینک روسی توپوں نے غیر ملکی انقلاب کا ٹریڈ مارک ضرور بدل دیا ہے۔ مشرق میں تبدیلی بھی آتی ہے تو کسی نہ کسی مغربی گوشے سے۔ ــــ

وقت ملتا بھی ہے تو گرمی کی وجہ سے ہمیں بغداد دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ شامیں اور راتیں عصرانوں اور عشائیوں میں گزارنی پڑتی ہیں۔ ہوٹل خیام ناشتے اور کھانے کے اوقات میں اقوام متحدہ کا منظر پیش کرتا ہے۔ پچیس تیس ملکوں کے مندوب یہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ یورپی اور افریقی اور جنوبی امریکی خوب شرابیں پیتے اور سور کھاتے ہیں اور زور زور سے قہقہے لگاتے ہیں۔ ہم انگریز کے تربیت یافتہ ہنستے بھی ہیں تو گھٹ گھٹ کر۔ سب مندوبوں میں جاذب توجہ لی لی ین ہے۔ للین۔ وہ ایک لمبی سفید فام

رو کی ہے جو بظاہر تقریبات کی رپورٹ لکھنے میں مصروف رہتی ہے وہ عام طور پر سنا دے کپڑے پہنتی ہے۔ اس کے بال لمبے آنکھیں غلافی اور ہونٹ موٹے موٹے ہیں۔ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔

"یہ ناصر کی جاسوس ہے" عراقی بیرے ہمیں بصیغۂ راز بتاتے ہیں۔

"یہ امریکی جاسوس ہے" کیوبا کا مندوب کھل کر کہتا ہے۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ دُنیا کا ہر غیر کمیونسٹ امریکی جاسوس ہوتا ہے۔

للین اتنی پیاری ہے کہ ہمیں اس کے جاسوس ہونے سے ڈر نہیں لگتا۔ اس کے انداز گفتگو میں ایشیائی حجاب اور تکلف ہے، وہ آسانی سے دوست نہیں بنتی مگر جب بات کرنے بیٹھتی ہے تو مزے مزے کی حکایتیں سناتی ہے۔ اس کا ترجمان ایک ٹھگنا عراقی نوجوان ہے جو اس کے ساتھ کھڑا ہو کر بونا سا لگتا ہے مگر وہ کم بخت اس پر ریجھی ہوئی ہے۔ اس کی خبر مجھے صحافی، نے دی جو کئی دن سے چپکے چپکے للین کی جاسوسی کر رہا ہے۔

"یہ باہر ہال میں آکر اس کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتی" وہ بڑی شان سے سوال کرتا ہے "جب کبھی ہم جلوس سے واپس آتے ہیں یہ اسے اپنے کمرے میں لے جاتی ہے اور گھنٹوں ڈنوں وہیں رہتے ہیں"

"کل رات پورے بغداد میں آتش بازی چھوٹے گی اور جنرل قاسم کا سرکاری عشائیہ ہوگا" بشیر فرجو یاد دلاتے ہیں "آپ لوگ سینما وغیرہ کا پروگرام نہ بنائیے گا۔ یہ تقریب سب سے زیادہ اہم اور دھوم دھام کی ہوگی"۔

کل تو ہم ایک اور دھوم دھام کی اہم تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک سرکاری عشائیہ تھا۔ بغداد کے شاہی محل کے باغ میں کئی سو آدمی جمع تھے اور ایک مندوب کے بقول عین اس جگہ جہاں شاہ فیصل اور ان کے خاندان پر گولی چلائی گئی یا جہاں وہ لوگ گولی کھا کر گرے۔ ایک لمبی میز آراستہ کی گئی تھی۔ اس کی آراستگی دیکھ کر سب ادھر ہی کھانا لینے آتے تھے اور جب ہجوم بڑھ گیا تو ایک عراقی ترجمان نے خوشی خوشی سب کو بتایا۔

"دو برس پہلے یہیں ملوکیت کے نمائندوں کی لاشیں پھڑک رہی تھیں اور خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج اسی مقام پر انقلاب کے بیٹے اپنی آزادی کا جشن منا رہے ہیں"۔ اس تقریر میں رجز کا انداز

آگیا۔ اور وہ انگریزی بولتے بولتے عربی بولنے لگا۔ وہ ایک خونی داستان تھی۔ نسلوں اور صدیوں کی سیاست کی داستان۔ اور پھر انقلاب کی داستان۔ غیر ملکی خواتین سسکیاں بھرتی ہوئی میز سے دور ہو گئیں۔ عراقی اور قریب ہو گئے اور ہم گویا سکتے کے عالم میں۔

اسی بغداد کے بانی خاندان عباسیہ نے جب امویوں پر فتح پائی تو ان کے بچے کھچے سرداروں نے صلح کر لی اور وہ دعوت پر بلا لیے گئے۔ کھانا شروع ہی ہوا تھا کہ کسی شاعر نے کوئی انتقامی رجز پڑھ دیا۔ اور عباسیوں نے خیموں کی چوبوں سے امویوں کو مار مار کر فرش کر دیا اور پھر ان کی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر آرام سے کھانا کھایا اور اللہ جل جلالہٗ کی منقبت کی جس نے حق و باطل میں انصاف کر دیا تھا۔

اللہ جل جلالہٗ

اور اس عباسی سردار کا نام جاننا چاہو تو جان لو کہ وہ عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن عباس تھا یعنی وہ رسول اللہؐ کے چچا کا پرپوتا تھا اور اس نے اپنی شام فتح اسّی جوان اور بوڑھے اموی سرداروں کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر ضیافت کھا کر منائی تھی۔ یہ بے چارا جنرل قاسم تو ابن عوام ہے۔ معمولی آدمی۔ اس نے تو شاہی خاندان کے کُل پانچ سات آدمی قتل کیے ہیں۔ اور اب تو ان کی لاشیں بھی ہماری میز کے نیچے نہیں ہیں۔ آؤ یہ عراقی کباب اُٹھاؤ دیکھو اس میں سے عربی تاریخ کی خوشبو آتی ہے۔ ممکن ہے آج یہ میز قتل گاہ پر لگی ہو۔ ممکن ہے یہ جوشیلا عراقی جھوٹ کہتا ہو۔ لیکن ایسا ہونا ان علاقوں میں بعید از قیاس نہیں ہے۔

اور دوسرے دن دجلہ کے کنارے آتشبازی چھوٹنے لگی اور اس میں سینکڑوں بجرے موسیقاروں اور رقاصوں کو لے کر گھومنے لگے۔ دجلہ کے کنارے ایک وسیع و عریض باغ میں عشائیہ کا اہتمام تھا۔ جنرل قاسم اسی سادہ فوجی لباس میں مندوبین اور عمائدین سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ انگریزوں اور پاکستانیوں کے سوا کسی نے فدنے کالے یا سفید کپڑے کا ڈنر سوٹ نہیں پہنا۔ انگریز تو مطمئن ہیں مگر ہم پاکستانی یہ صورت حال دیکھ کر کٹے کٹے سے جاتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے بے تکلف مندوب دوست ہمارے تحت ڈلروالی قمیصوں اور ہمارے چکنے کوٹوں کی سطح پر انگلیاں پھیر پھیر کر آنکھیں مٹکاتے ہیں اور مذاق کرتے ہیں۔ ہم مہذب پاکستانی گھر میں اور باہر قومی لباس پہننے سے شرماتے ہیں۔ مگر خیر گھر تو گھر ہے۔

"اوہ۔ معاف کیجیے گا۔؟ آپ شاید دولت مشترکہ کے نمائندے ہیں۔ کبھی ۱۹۴۷ء میں دنیا کے اخبارات کا معیار کتنا گھٹیا تھا۔ خبریں چھاپ دیں کہ دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک پاکستان کے نام سے پیدا ہو گیا ہے" ایک بے تکلف آوازہ کستا ہے۔

ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہتا ہے کہ کوٹ پھاڑ کر پھینک دوں اور اپنے گلے میں پھنسی ہوئی کالی پٹی سے اپنا دم گھونٹ لوں مگر مجھے اپنے ملک واپس جانا ہے۔ جہاں یہ لباس پہنے بغیر میں ہائی سوسائٹیز کے استقبالیوں اور عشائیوں میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جہاں نہ صرف اس واقعے کا ذکر کرنے سے میرا مذاق اُڑے گا بلکہ شاید میرا مستقبل بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

"زندہ باد ملکہ معظمہ قیصرہ ہند و پاکستان"

"زندہ باد لارڈ مکالے"

"زندہ باد مغربی تعلیمی نظام"

"زندہ باد آل برطانیہ ثم طبقۂ بلند پاکستانیہ"

اے طبقۂ بلند پاکستانیہ جس کا اصلی نام میں نہیں لے سکتا۔ اے میرے آقا میری روٹی، میرے کپڑے، میرے تمدن، میری زبان میرے دل و دماغ کے مالک، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملک سے باہر نکل کر اس حقیر فقیر بے تقصیر پر کیا گزر رہی ہے۔ یہ عرب چینی جاپانی یورپین بلکہ یہ ... نودولتے امریکی بھی ڈنر جیکٹ پہنے بغیر ایک سرکاری تقریب میں رات کا کھانا کھا رہے ہیں اور میرا مذاق اُڑ رہا ہے اور میرے ملک میرے تمدن پر غلامی کا الزام لگ رہا ہے۔ یقیناً مجھے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہے جو آپ کے فیاض اور عظیم ہاتھوں میں ہے۔ لیکن برائے خدا آج کی شام میری دستگیری کیجیے۔ کوئی مسل ایسی چلائیے کوئی آفس آرڈر ایسا جاری کیجیے، کوئی قانون ایسا بنائیے کہ آج کی شام میرا جھکتا ہوا سر کسی جھوٹے پیچ فخر سے پھر اونچا ہو جائے۔ نصب العین کے بل پر میں خود اپنا سر اونچا کر لیتا ہوں، اپنے کوٹ پر لگی ہوئی نرم مٹی خاک کو چٹکیاں مار کر جھاڑتا ہوں۔ عربوں، یورپینوں، چینیوں، جاپانیوں، امریکیوں کو سامنے جمع کرتا ہوں اور میر خلیل الرحمٰن مالک و مدیر روزنامہ جنگ کے نکالے ہوئے اداریوں اور "قومی" خبروں کے پلندوں کی دیوار بنا کر اس پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور پھر نہایت خوش الحانی سے جوش و خروش کے ساتھ گاتا ہوں۔ مجھے اپنے کپڑوں سے ضرور شرم آ رہی ہے ـــ مگر میں اپنے ملک کی وسعت، عظمت اور جمہوری مزاج پر فخر کر رہا ہوں۔

پاک سرزمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد
پاک سرزمین کا نظام
قوتِ اخوتِ عوام

مگر ایک دم کوئی آہنی ہاتھ میری تنی ہوئی گردن پر گھونسا مار کر اسے نیچا کر دیتا ہے اور روزنامہ جنگ کے تودے میرے قدموں کے نیچے سے کھسک جاتے ہیں اور میں دھڑام سے گر جاتا ہوں اور لارڈ مکالے کے روحانی بیٹوں کے ارشادات اور فرامین کے بوجھ میں دب کر سسکیاں بھرنے لگتا ہوں اور دور سے سارے پاکستان کے اخباروں کے مدیر اور کالم نویس اور کارٹونسٹ میرے حال پر قہقہے مارتے نظر آتے ہیں اور ان پر ان کے قارئین قہقہے مارتے نظر آتے ہیں اور ان پر نئی نسلیں قہقہے مارتی نظر آتی ہیں اور پھر اپنے وطن کی ڈنر سوٹ والی شامیں اور جاز اور چاچاچا کے ہنگامے سب کے قہقہوں کو دبا لیتے ہیں۔

چاچاچا — CHA CHA CHA !,

او یو سوائن — O YOU SWINE,

ڈونٹ یو کس می — DON'T YOU KISS ME,

آئی ہیو این اَدَر بوائے — I HAVE ANOTHER BOY,

ہُو از فل آف سیکس اینڈ جوائے — WHO IS FULL OF SEX AND JOY,

چاچاچا — CHA CHA CHA !

آؤ آؤ کنگ کی ری اول اور نائٹ کنگ کول اور ایلوس پریسلے اور قریب آؤ تم ہمارے نئے آقا ہو۔ تمھاری آواز ہر مہذب گھر میں سنی جاتی ہے آؤ اور اس پاک سرزمین شاد باد کی گھٹی گھٹی لے کو اپنی بلند آوازوں سے دبا لو۔ کم از کم یہ گاڈ سیو دی کوئین سے زیادہ تازہ اور طاقتور ہیں۔

"اوہ۔ اوہ۔ ونڈرفل۔ امیزنگ" ایک میز کی طرف سے آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

ایک بہت لمبی چوڑی میز کے گرد یوروپین خواتین جمع ہیں اور بیچ میں ایک تودے کا تودہ پڑا ہے۔

ہم اپنی پلیٹ لے کر دوڑے دوڑے پہنچتے ہیں۔

یہ تو دو ایک دم پختہ اونٹ ہے۔ اس کے پیٹ میں دنبے ہیں۔ دنبوں کے پیٹوں میں مرغ ہیں۔ اور مرغوں کے پیٹ میں انڈے یہ خالص عربی کھانا ہے۔

عاش الزعیم عبدالکریم

"یہ حضرات پاکستانی مندوب ہیں" بشیر فرجو ہمیں جنرل قاسم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

"پاکستان۔ اہلاً و سہلاً۔ پاکستان" جنرل صاحب کہہ کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ عرب ب کی آواز اور انہیں

کر سکتے۔ عربی میں 'پ' نہیں ہے۔ وہ پاکستان کو باکستان کہتے ہیں۔

"استید خلیل الرحمٰن" بشیر فرجو کہتے ہیں۔ وہ سب کو پکار رہے ہیں۔ میں تیسرے نمبر پر خوش کھڑا ہوں کہ اب مجھے بھی سید کہا جائے گا۔ میں مغل بچہ ہوں اور گو میری والدہ سیدانی ہیں مگر میری ننھیال والے ددھیال والوں پر ہمیشہ فوقیت سادات جتاتے رہے ہیں اور مجھے اپنے سید نہ ہونے کا شدید احساس رہا ہے عربی میں سید مسٹر کی جگہ استعمال ہوتا ہے مگر ہے تو لفظِ سید۔

مگر میری باری نہیں آتی۔ میر صاحب اس رسمی تقریب میں بھی اپنی صحافیت سے مجبور ہو کر جنرل صاحب سے اُلجھ گئے ہیں۔

"یور ایکسی لنسی" وہ فرماتے ہیں: "ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہمیں اس تقریب میں اپنا مہمان بنایا۔ مگر کئی دن سے ایک سوال ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

"ضرور پوچھیے۔" جنرل صاحب جواب دیتے ہیں۔ بشیر فرجو پہلے ہی اعصابی آدمی ہیں، وہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ کہیں ان کی کسی بات پر حرف نہ آتا ہو۔

"معاف فرمائیے گا۔" میر صاحب کہتے ہیں: "ہم نے اتنے دن میں آپ کی بے شمار تقریریں سُنی ہیں۔ ہر تقریر میں آپ عرب اتحاد، عرب قومیت، عربوں کی سربلندی پر زور دیتے ہیں بلکہ آپ نے پرسوں عرب بھارت تعلقات کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اب تک آپ نے کسی تقریر میں اسلام کا ذکر نہیں کیا۔ ہمارا آپ کا رشتہ تو اسلامی ہے، ہم تو عرب نہیں ہیں۔ ہمارے لیے آپ کی سیاست میں کیا جگہ ہے؟"

پروفیسر شریف میر صاحب کے کوٹ کا دامن چپکے سے کھینچتے ہیں

جنرل صاحب مسکراتے ہیں: "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ایسا سمجھا۔" اب وہ عربی بولنے لگتے ہیں اور بشیر فرجو کا سانس جلد جلد ترجمہ کرنے میں پھولنے لگتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ ہمارا اور آپ کا رشتہ اسلامی ہے مگر اصل میں اسلام ہمارا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ تو آپ کا ہے کہ آپ ایک غیر مسلم آبادی میں رہ چکے ہیں۔ ہمارا مسئلہ عرب قومیت کا ہے۔ اتحاد کا مسئلہ کیونکہ عربوں کا زوال ان کے اتحاد ٹوٹ جانے سے ہوا تھا اور ان کا اقبال دنیائے عرب کے متحد ہو جانے میں مضمر ہے۔ ہماری قومیت ترکی انگریزی اور فرانسیسی انتداب کے بوجھ سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ ہمیں وہ شیرازہ پھر جمع کرنا ہے۔"

ترکی انتداب: یہ کیا بات ہے۔ ہم سابق ہندی مسلمان تو ترکی خلافت کے لیے جانیں دیے بیٹھے

اور یہ عرب بھائی اسے ترکی ملوکیت۔ ترکی امپیریلزم کہتے ہیں۔ ہائے علی برادران۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو! میر صاحب میری طرف جھکے "یار جلدی بتاؤ کیا ہے وہ شعر ڈاکٹر اقبال کا۔ ہاں وہ جس میں کاشغر کا ذکر آتا ہے":

مجھے گھبراہٹ میں شعر یاد نہ آیا۔

"اجی وہی" میر صاحب کو یاد آ گیا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

میر صاحب نے بشیر فرجو کو اس کا ترجمہ۔ بڑی تفصیل سے سمجھایا اور بشیر فرجو نے جنرل قاسم کو نہایت اختصار سے۔

جنرل صاحب پھر مسکرائے۔ انھوں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ شاید ہم لوگ انھیں بالکل بیوقوف معلوم ہوئے۔ انھوں نے میر صاحب کو گرمجوشی سے گلے لگا لیا اور ہم سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملائے اور ہم اسلام اور عرب قومیت اور ہندی اسلامیت سے ناواقفیت کے نشے میں سرشار دجلہ کے کنارے ٹہلنے لگے۔ سامنے روشن بجرے اور کشتیاں گزر رہی تھیں قریب سے دیکھنے پر رقاصوں کے لباس نظر آئے۔ سب کے لباس سفید تھے اور قدیم وضع کے تھے۔ جنرل صاحب کے خوش مذاق انھیں کنارے کے قریب لائے اور کسی نے چھت پر سے کبھی جنرل صاحب پر اور کبھی دریا میں بہتے ہوئے بجروں پر فلڈ لائٹ ڈالنی شروع کر دی۔ ہمیں بتایا گیا کہ آج کی شام بغداد قدیم، عباسیوں کے بغداد میں بدل دی گئی ہے۔ سب لباس اور طریقے عباسی اختیار کیے گئے ہیں۔ آج کی شام الف لیلہ کی ایک شام ہے۔ عراقی تیل کی آمدنی دجلہ کی سطح پر بہہ رہی ہے اور ہمارے ٹکٹ خرید رہی ہے اور اونٹ اور دنبے اور مرغ بھون رہی ہے اور ہوٹل خیام کے کمرے ہمارے لیے ایر کنڈیشن کر رہی ہے۔ اور رقاصوں کی مسکراہٹ میں شمپین کا رنگ گھول رہی ہے۔ ہائے پاکستان۔ باہر آ کر کتنا یاد آتا ہے۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود میرا وطن اس مجوبہ ملک سے بہت ۔۔ ہے۔ عراق عراقیوں کو بہت پیارا ہوگا۔ ہونا بھی چاہیے۔ اپنا وطن اپنا ملک سب کو پیارا ہوتا ہے۔ عراق مجھے بھی پیارا ہے کہ مسلم ہے اور ملی بھائی ہے اور انقلاب مزاج بھی اور اب ترقی پسند بھی مگر میرا پاکستان آج کے عراق سے کہیں زیادہ سلجھا ہوا اور منظم ہے۔

مورخ طبری کے ساتھ چند لمحے

یکایک سامنے والے بجرے میں سے ایک مقطع صورت باریش بزرگ نے جھانکا اور ہمیں آواز دی۔

"آؤ آؤ! میں تمہیں بغداد دکھاؤں"

ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے اردگرد کوئی نہیں رہا۔ فضا دودھیا سی ہوتی جاتی ہے۔ صحافی للین کے اشارے پر اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ پروفیسر شریف عراق کے نامور عالم اور بزرگ علامہ شبیبی سے گلے مل رہے ہیں اور میر خلیل الرحمان نے اپنا کیمرہ نکال لیا ہے۔

"آپ کون ہیں" میں زور سے پوچھتا ہوں۔

"میرا نام ہے طبری۔ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری"

او ہو یہ بڑے میاں مورخ طبری ہیں جن کی یہ موٹی موٹی سات جلدوں والی تاریخ سے مدتوں دنیا نے خوشہ چینی کی ہے۔ میں نے یہ نام سن رکھا ہے۔ میں میر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے دوڑا کہ ان کا کیمرہ وہیں رہ گیا۔ بجرا کنارے سے آلگا۔ اور ہم کود کر اس میں بیٹھ گئے۔ اور اب بجرا دجلہ کے دھندلکوں میں اس بغداد کی طرف روانہ ہوا جس کے ذکر سے تاریخ عراق وعرب بلکہ تاریخ اسلام آج تک روشن ہے۔

جولائی کی اس گرم دوپہر میں دریائے دجلہ پر ہمارا بجرا روانہ ہوا تو ہمیں گویا ایک دم گھونٹ دینے والے ماحول سے نجات مل گئی جو جنرل عبدالکریم قاسم کی پرشور تقریبات اور تقریروں نے پیدا کر رکھا تھا۔

ہمارے رہبر مورخ طبری تھے جن کے ہاتھ میں پتوار تھی۔ اور بجرے میں مورخ ابن خلکان اور بہت سے دوسرے مورخین چپو ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ دونوں طرف بیسویں صدی کا بغداد دھندلکوں میں چھپتا جا رہا تھا۔

"ہاں تو پھر کس عہد کا تماشا دیکھو گے" مورخ طبری نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا" کچھ واقعات اور صدیاں میرے ہاتھ میں ہیں اور کچھ میرے ساتھیوں کے ہاتھ میں اور ہم مل جل کر پوری تاریخ بغداد کی سیر کرا سکتے ہیں"

میر خلیل الرحمان نے مجھ سے کھسر پھسر کی: کیا ہم وقت کی پچھلی سمتوں میں جا رہے ہیں" وہ پریشان ہو کر بولے" یار چلنے میں تو کوئی ہرج نہیں مگر واپسی اپنی مرضی سے ہوگی یا یہ بڑے میاں ہمیں کسی بادشاہ کے دربار میں چھوڑ آئیں گے"

"کیوں" میں ان کی بے چینی نہ سمجھ سکا" فرض کرو ہم پیچھے ہی پیچھے چلتے رہیں تو کیا ہرج ہے۔ ممکن ہے کسی مقام پر کوئی ایسا گروہ مل جائے جو ہمیں بابل و نینوا کی تہذیب میں لے جائے۔ اس زمانے کی بڑی تعریفیں سنی ہیں میر صاحب۔ مزا آجائے گا۔ شاید واپسی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ آخر اب بھی ہم اپنے حال سے کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں"

"نہیں بھائی" میر صاحب نہ مانے" جی حضور علامہ صاحب بس ذرا جلدی جلدی سب کچھ دکھا دیجیے۔ بات یہ ہے حضور کہ ہمیں ماضی سے بہت لگاؤ ہے مگر حال اور مستقبل بھی بہت عزیز ہے بزنس بزنس ہے"

یکایک بجرا ایک عظیم الشان بندرگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ہم کنارے پر کود کر ایک ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں جو مورخوں، راویوں، افسانہ پردازوں، لطیفہ بازوں اور داستان نویسوں کا گروہ ہے۔ مورخ طبری اور مورخ ابنِ خلکان نے ہمارے ہاتھ پکڑ رکھے ہیں۔ مگر ہم رہ رہ کر ایک دوسرے سے چھوٹ جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے چیخ پکار اور تلاش کے بعد ملتے ہیں۔

۱۴۵ھ یا ۷۶۲ء میں خلیفہ منصور عباسی پر کوفے میں باغیانہ حملے ہوئے تو اس نے دارالسلطنت ہی بدلنے کی سوچی اور اس مقام کا انتخاب کیا اور کہا — "یہ فوجی چھاؤنی کے لیے بہت اچھا مقام ہے اس کے ایک پہلو میں دجلہ رواں ہے۔ یہاں سے چین تک ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ ہمیں ہر قسم کا سامان معیشت بحری راستے سے وصول ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تمام سامان خوراک جزیرہ اور آرمینیا اور آس پاس کے علاقوں سے ہمیں پہنچ سکتا ہے۔ دریائے فرات بھی ہمارے قریب واقع ہے اس کے ذریعے شام اور رقہ اور آس پاس کے علاقوں سے ہر قسم کی پیداوار وصول ہو سکتی ہے"

اور پھر منصور نے اس قطعہ زمین پر ایک نقشے کے مطابق روئی کے بنولوں سے لکیریں ڈلوائیں اور ان پر تیل چھڑکا اور پھر ان میں آگ لگوا کر ایک بلندی سے معائنہ کیا کہ تعمیر کے بعد شہر کیسا نظر آئے

گا۔ اور یہ منصور عباسی دوسری صدی ہجری میں گزرا ہے اور کراچی کے لالوکھیت اور گولی مار اور پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کے معمار اس چودھویں صدی ہجری میں گزریں گے مگر ان کی منصوبہ بندی اور ترتیب دیکھنے کے قابل ہوگی۔

منصور کے بغداد کا نام المدورہ بھی ہے یعنی گول شہر۔ اس کے تین طرف نوے فیٹ اونچی فصیلیں اور خندقیں ہیں اور ان میں چار دروازے ہیں اور ہر دروازے سے ایک سڑک "اسلامی دنیا" کی چاروں سمتوں میں جاتی ہے۔ اور یہ تمام سڑکیں گول شہر کے وسطی مرکز سے چلتی ہیں۔ ہم بارہ سو برس بعد واپس کو دیکھتے ہیں اور اپنے لائل پور کو منصور عباسی کے بغداد سے مشابہت دے سکتے ہیں۔ ہائے لائل پور کا انگریزی نام۔

ہاں تو یہ منصور عباسی کا بغداد ہے جس کی تعمیر میں دس لاکھ مزدوروں نے چار برس تک کام کیا اور انہی مزدوروں میں امام ابو حنیفہ بھی تھے جنہوں نے منصور کا پیش کردہ منصب قضاۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بغداد کا منصب قضاۃ یعنی عالم اسلام کی چیف ججی جس کی تنخواہ چار ہزار پاکستانی روپے ماہوار سے بہت زیادہ تھی اور جس کے ساتھ فری ہاؤس بھی ضرور ہوگا مگر جسے قبول کرنے سے امام ابو حنیفہ نے اس لیے انکار کر دیا کہ انہیں خلیفہ ابو جعفر منصور فاتح عراق و عرب و ایران کے طریق حکومت و سیاست سے نصب العینی اختلافات تھے اور اس کی سزا میں منصور نے انہیں مستری یا اوورسیر بنا دیا تھا اور ان کا کام یہ مقرر کیا تھا کہ وہ راج مزدوروں کو اینٹیں گنتی کر کے دیا کریں۔

ایسی ہی جولائی کی گرم دوپہروں میں امام اعظم ابو حنیفہ جن کے مقلدین کی تعداد دنیائے اسلام میں سب سے زیادہ ہوگی عالم اسلام کی چیف ججی کو ٹھوکر مار کر اینٹوں کی گنتی کرتے تھے جو ان کے قریب ہی گرم گرم بھٹوں سے نکالی جاتی تھیں اور ان کے آقا محمد رسول اللہ کا نام لینے والے مسلمان، منصور عباسی جیسے باجبروت حکمرانوں کی کیا حیثیت ہے، آج کے حکام کے سامنے بڑھ بڑھ کر جھوٹی گواہیاں دیں گے اور انصاف کا بول بالا کرائیں گے۔

امام ابو حنیفہ نے سو اینٹوں کو ناپ کر ایک لمبی سی لکڑی کا پیمانہ بنا لیا تھا جس کے سہارے وہ اینٹوں کی گنتی کر لیا کرتے تھے۔ خلیفہ منصور کا غیظ و غضب اور بغداد کا ایک سو بائیس درجہ حرارت ان کی طبّاعی کو نہ پگھلا سکا اور اس وقت سے دنیائے عرب میں پہلی بار اینٹیں اور بلاک شمار کرنے کا یہ طریقہ رواج پایا۔

[illegible] دیکھو کہ ہارون الرشید کے زمانے میں جبکہ بغداد کی تعمیر کو صرف پچاس برس گزرے ہیں [illegible] کی شان و شوکت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

یہ فرانس کے شہنشاہ شارلمین کے سفیر ہیں جو بغداد کی کشادہ سڑکوں اور عظیم الشان محلوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے بارگاہِ خلافت میں جا رہے ہیں۔ شارلمین قدیم یورپ کا سب سے زیادہ طاقتور شہنشاہ ہے لیکن وہ اور اس کے بہت سے وزرا اور درباری بھی معمولی حروف پڑھنا نہیں جانتے جبکہ اکیلے بغداد میں چودہ جامعات ہیں (اگر ایسی جامعات جن کا ترجمہ یونیورسٹی بھی ہو سکتا ہے اور کالج بھی)۔

اس شہر میں دنیا بھر کی دولت و حشمت اس طرح سمٹ کر آگئی ہے کہ سڑکوں پر کوئی فقیر نظر نہیں آتا کیونکہ بیمار بے کار لوگ محتاج خانے پہنچا دیے جاتے ہیں۔ خلیفہ کی ملکہ زبیدہ کے دسترخوان پر کوئی برتن سادہ نظر نہیں آتا بلکہ سونے چاندی کے برتنوں پر جواہر، زمرد اور عقیق جڑے ہوئے اور اس کی جوتیوں کی نوکوں پر ہندوستان اور افریقہ کے سفید ہیرے زمین سے آسمان کو آنکھیں مارتے ہیں۔

—— پچھلے سال یہ حج پر گئی تھی تو سفر پر تیس لاکھ دینار سرخ خرچ ہوئے تھے۔ سونے کا دینار شاید ڈیڑھ سو پاکستانی روپے کے برابر ہوتا تھا —— اور سفرِ حج کے دوران میں اس نے مکہ معظمہ سے پچیس میل دُور ایک مقام سے مکے میں پانی لانے کے لیے نہر کھدائی تھی جس کے نشان تاریخ نہ مٹا سکے گی۔ نہرِ زبیدہ جو حجاز میں آج بھی رواں ہے۔

اور وہ سامنے کا محل ملکہ زبیدہ کی نند شہزادی علیہ کا ہے یہ خلیفہ ہارون الرشید کی سوتیلی بہن ہے۔ یہ حسن و خوبی میں زبیدہ کی ہمسر ہے مگر اس کے ماتھے پر ایک داغ ہے جس پر یہ ایک ٹیکا لگاتی ہے۔ اس ٹیکے کا نام اعلیٰ علیہ ہے۔ یہ ٹیکا بغداد سے ایران، ایران سے ہندوستان اور دوسری طرف مغربین اور یورپ پہنچے گا۔ جہاں خواتین اسے فیشن کے طور پر اختیار کر لیں گی اور یہ حسن اور امیری کی نشانی کہلائے گا۔ حالانکہ علیہ نے یہ ٹیکا اپنے ماتھے کا داغ چھپانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔

اور یہ جلوس کسی شہزادے یا وزیر یا سپہ سالار کا نہیں۔ جس کے آگے ایک خچر طلائی ساز سے لدا چلا جاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ سیکڑوں باوردی ایرانی، یونانی اور ترکی غلام ہیں۔ یہ شاعر ابو نواس کا جلوس ہے جس کے ایک ایک شعر پر اسے ہزاروں سرخ دینار مل جاتے ہیں۔ (ان دنوں ابھی بغداد میں کاپی رائٹ ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا۔)

اور دجلہ کے اس کنارے خلیفہ کے وزیر خاندان برامکہ کے محل ہیں جن کی چھتوں سے آتش بازیاں اور روشنیاں چاند کو چھو رہی ہیں۔ یہاں وزیر کی بیٹی بوران سے شہزادے مامون الرشید کی شادی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ سامنے والے محل میں بارات پہنچی تو اُسے سونے کے مرصع و عریض فرش پر بٹھایا

گیا جس کے چاروں طرف موتی اور یاقوت لگے ہوئے تھے۔ دولہا دلھن کے سامنے جڑاؤ سونے کی کشتی لائی گئی جس میں ایک ہزار موٹے موٹے موتی بھرے ہوئے تھے اور چشم زدن میں وہ پوری کشتی اُن پر سے نچھاور کرکے باہر پھینک دی گئی۔ ہائے مرزا غالب۔

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
جب بنا ہوگا اِس انداز کا گز بھر سہرا

مگر یہ ناؤ والا قصیدہ دلی کے بہادر شاہ بادشاہ کے بیٹے جواں بخت کی شادی پر کہا جائے گا جبکہ بادشاہ سلامت کی کل آمدنی بارہ لاکھ روپے سالانہ ہوگی اور مرزا غالب کو اس قصیدے پڑھائی سو روپے کا خلعت ملے گا۔ ۔ نوکری نوکری ہے۔

محل برامکہ کے وسطی کمرے میں جو فانوس تھا اس میں عنبر کی دو سو شمعیں جل رہی تھیں اور باراتیوں پر کچے مشک کی گولیاں نچھاور کی جا رہی تھیں۔ ہر گولی جس چھال کے کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ دراصل ایک الاٹ منٹ آرڈر تھا جس کے ذریعے گولی اٹھانے والے کو زمین کے مربعے، غلام، لونڈی عطا ہو رہے تھے۔

میں یہ حال سن کر غمزدہ ہوتا رہا کاش میں نہیں تو میرے دوسرے دوست اس شادی میں شریک ہو سکتے۔ اور دو چار گولیاں ان کے قبضے میں بھی آجاتیں۔ کلیم کے چکر سے تو نجات مل جاتی۔ یہاں کلیم کے بغیر مربعے دیتے ہیں۔ وہاں کلیم بھی کٹ جاتے ہیں۔ اپنا تو کلیم ہی نہیں کہ اس گولی پر طبیعت آئے۔

اور یہ ۹۱۵ء میں خلیفہ مقتدر باللہ کا دربار ہے۔ جس میں شہنشاہ بازنطین قسطنطین کی سفارت آئی ہے۔ باہر خلیفہ کا لشکر کھڑا ہے جس میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار گھڑسوار ہیں اور چاروں طرف سیکڑوں سفید و سیاہ خواجہ سراؤں کے جلوس ہیں اور جلوس کے پیچھے ایک سو شیر ببر زنجیروں اور بانسوں میں مقید چل رہے ہیں۔ بازنطین کا سفیر اور اس کے ساتھی اس تماشے کو خواب کی طرح دیکھ رہے ہیں۔ جیسے بارہ سو برس بعد مسلمان سفیر اور ان کے ساتھی یورپ و امریکہ کے جاہ و جلال کو خواب کی طرح دیکھیں گے۔

اور قصر خلافت میں داخل ہو تو پتا نہیں چلتا کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ اس محل میں اڑتیس ہزار ریشمی پردے لگے ہوئے ہیں اور بائیس ہزار ایرانی، مصری اور عربی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ سامنے ایک طرف دارالشجرہ ہے۔ یعنی درخت والا کمرہ، جس میں سیکڑوں من وزنی سونے کا ایک

درخت آویزاں ہے۔ اور اس کی شاخوں پر چاندی کی بنی ہوئی چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں جو ہوا کی سرسراہٹ سے طرح طرح کے نغمے گاتی ہیں۔ چا۔ چا۔ چا۔ یہ سلطنت بہت طاقت ور ہے۔ بلکہ ہمیں ایڈ بھی دے سکتی ہے۔ امداد خواہ قرضوں کی صورت میں ہو خواہ چاچا کے ریکارڈوں کی شکل میں۔

اور وہ سامنے کا محل دراصل ایک جامعہ ہے جس کا نام دارالحکمت ہے۔ اسے مامون الرشید نے ۸۳۰ء میں بنایا تھا۔ یہاں ایک عظیم الشان کتب خانہ اور دارالترجمہ ہے اور بڑے بڑے ہال ہیں۔ جہاں علما فضلا کے بیشمار منعقد ہوتے ہیں۔ پانچ پانچ سو اونٹوں پر لدی ہوئی کتابیں ہندوستان یونان بازنطین اور اطالیہ سے آتی ہیں، جن پر عباسی محققین دن رات کام کرتے ہیں اور دنیا بھر کے علمی خزینے عربی میں منتقل کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے دنیا پہلی بار سقراط اور ارسطو اور افلاطون کے افکار سے عربی ترجموں کے ذریعے فیضیاب کی جارہی ہے، یونانی سے براہ راست عربی میں ترجمہ کرنے والے کمیاب ہیں۔ اس لیے پہلے یونانی کتابوں کو آرامی میں منتقل کیا جاتا ہے۔ آرامی جو حضرت عیسیٰ کی زبان تھی۔ شمالی عرب کی زبان۔ اور پھر آرامی سے عربی میں ترجمے کیے جاتے ہیں۔ ان مترجمین کا آرگنائزر حنین بن اسحاق تھا۔ جس کے اسٹاف کو فی آدمی پانچ سو دینار یعنی ساٹھ ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی اور جب کتاب ترجمہ ہو جاتی تھی تو خلیفہ مامون الرشید کتاب کے وزن کے برابر الگ مترجم کو انعام دیتا تھا اور یہ مرتبین حدیث کے کتب خانے ہیں۔ سات سو دارالعلوم حدیث۔ اور یہ دسویں صدی عیسوی کا شہر بغداد ہے جس میں چودہ لاکھ آدمی بستے ہیں۔ اس میں ہزاروں مدرسے اور سیکڑوں اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں ہیں، جن میں انجینئرنگ کالج آرٹس کالج سے کم نہیں۔ شہر میں ستائیس ہزار حمام ہیں جن میں ہر وقت گرم و سرد پانی ملتا ہے۔ حمام میں الگ الگ کمرے ہوتے ہیں۔ ہر کمرے میں پانی کا ایک حوض ہے، جس کے بیچ میں گرم پانی کا فوارہ ہر وقت چلتا رہتا ہے، اس پانی کے ابخرات سے کمرہ گرم رہتا ہے۔ باہر کے کمروں میں ریستوران اور نائٹ کلب ہیں جہاں کھانا پینا ہوتا ہے۔ شاعروں اور مغنیوں کے کمالات سے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ نائٹ کلبوں میں لوگ اپنی داڑھیاں مشک اور عرق گلاب سے معطر کرتے ہیں اور زرق برق لباس پہنتے ہیں کپڑے عود و عنبر کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ شام کو یہ لوگ چوگان، ہاکی، تیراندازی میں حصہ لیتے ہیں اور صاحب استطاعت حضرات شکار پر جاتے ہیں جو خلیفہ وقت کے تقرب کا باعث ہے۔ ہائی اسپورٹس: ہائی سوسائٹی۔ ہائے عوام۔ وائے عوام۔

اور وہ دیکھو وہ طبقہ غلمانوں کا ہے جو زیادہ تر یونانی، بربری اور ارمنی ہوتے ہیں اور جو خلفا

اور امرا کی بے شمار کنیزوں اور داشتاؤں کی نقل و حرکت کی نگرانی کے علاوہ ان کی بیگمات کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے باخبر رہتے ہیں اور اپنے آقاؤں کو بھی باخبر رکھتے ہیں۔ یہی غلمان ہیں جو ہیجڑے کہلائیں گے اور برصغیر ہندو پاک کے بازاروں اور گلیوں میں انگلیاں نچا نچا کر گایا بجایا کریں گے۔ اس طبقے کو آرگنائز کرنے اور اس کے اصول و ضوابط مرتب کرنے کا سہرا خلیفہ امین عباسی کے سر ہے جو ہارون الرشید کا بیٹا تھا اور جسے اس کے بھائی مامون الرشید نے خلافت سے ہٹا دیا تھا۔

اور دائیں ہاتھ کے محلات لونڈیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ لونڈیاں جو قانوناً تو اپنے مالکوں کی پابند ہیں مگر جن میں سے بعض نے بڑی بڑی بیگمات کا تختہ الٹ دیا ہے۔ یہ عظیم الشان عمارت خاتون تودر کی ہے جس کی قیمت خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک لاکھ سُرخ دینار لگی تھی۔ یہ لونڈی موسیقی، ریاضی، طب فقہ، نجوم، فلسفے اور دیگر ادبی علوم میں کامل تھی اور اس نے اپنے آقاؤں سے لاکھوں دینار انعام پائے تھے۔

حسین لونڈیاں امرا اور خلفا کے لیے بڑی محنت سے پالی جاتی تھیں تاکہ وہ بڑے لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو جائیں اور بعد میں ان کی لیاقت کا امتحان لے کر ان کی بڑی بڑی قیمتیں مقرر کی جاتی تھیں۔ یہ ایک باقاعدہ تجارت تھی۔ شاید یہی تجارت بیسویں صدی میں بھی ہو گی۔ لیکن اس کے تمام نام بے طرح بدل جائیں گے۔ یاد تک نہیں آئیں گے۔ یاد دلائے گئے تو مہذب لوگ مذاق اُڑائیں گے۔

اس بغداد میں ہزاروں آدم جی اور داؤد اور سہگل بلکہ فورڈ اور راک فیلر تک ہیں۔ ایک جوہری ابن الجصاص پر خلیفہ نے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سرخ دینار کا جرمانہ کیا جو اس نے بائیں ہاتھ سے ادا کر دیا۔ اور اس کی دولت میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔

اس بغداد کے تجارتی قافلے ایک طرف ہندوستان ملایا اور چین اور دوسری طرف فرانس اور تیسری طرف شمالی مغربی افریقہ کے دُور دراز گوشوں تک جاتے ہیں۔ گھریلو صنعتوں کا دَور دورہ ہے تاکہ روزمرہ کے استعمال کا مال کم سے کم امپورٹ ہو۔ بونس واؤچر کا خیال ابھی کسی کو نہیں آیا ورنہ یہ اسلامی سلطنت کئی صدیوں پہلے صرف امپورٹ کے بوجھ سے دب کر اس طرح پارہ پارہ ہو جاتی کہ ہلاکو خاں کو ادھر کا قصد کرنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔

اس قرون وسطیٰ کے بغداد میں سیکڑوں ہسپتال کھلے ہوئے ہیں جہاں علاج کا خرچ نہیں لیا جاتا۔ یہاں عطائیوں کو پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ عام آدمیوں کو دوائیں بیچنے کی اجازت

ہے۔ وہ اساتذوں کو امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ اور طبیبوں کو بھی۔ ۳۱۹ء میں خلیفہ المقتدر نے ڈاکٹر سنان بن ثابت کو چیف میڈیکل آفیسر مقرر کیا اور شہر کے ڈاکٹروں کے امتحان لئے تو ہزاروں میں میں سے صرف ساڑھے آٹھ سو طبیب امتحان میں کامیاب ہوئے اور یوں دارالخلافہ عطائیوں سے خالی کرالیا گیا۔ معلومہ دنیا میں سب سے پہلا ہسپتال جس میں بستر ہوں، خلیفہ ہارون الرشید نے قائم کیا تھا جس کا نام مستشفیٰ تھا۔ امام رازی نہ صرف پوری دنیائے اسلام بلکہ قرونِ وسطیٰ کی تمام معلوم دنیا کا سب سے زیادہ ذہین اور جدت پسند طبیب اور مفکر گزرا ہے۔ وہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے درمیان بغداد کے سب سے بڑے ہسپتال کا بانی تھا۔ اس نے شفاخانے کے لیے مناسب مقام اس طرح تلاش کیا کہ شہر کے مختلف مقاموں پر گوشت کے پارچے لٹکائے اور جہاں گوشت سب سے کم سڑا وہیں ہسپتال بنایا۔ اسی بغداد میں رازی نے علم طب پر وہ کتابیں تصنیف کیں جو صدیوں تک عربوں، ایرانیوں، ترکوں اور یورپ والوں کے لیے نشانِ راہ کا کام دیں گی۔ رازی نے دنیا میں پہلی بار چیچک اور خسرہ کے امراض پر کام کیا اور رسالے لکھے جن کے ترجمے صدیوں کے لیے معالجین کو روشنیاں دکھاتے ہیں۔

اور اگر تمہاری آنکھیں قصر خلافت کی "محترم" دیواریں توڑ کر اندر کی روشنیوں تک پہنچ سکیں تو وہ تماشے بھی دیکھ لو جو تاریخ کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔

خلفا اور وزرا کی عیاشیاں اور سازشیں اور اسلام کے نام پر قتل و خون اور لہو و لعب میں یہ محلات عجب تماشوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں اسلامی سادگی کا نمونہ تو کہیں نہیں ملے گا مگر اسلامی فتوحات اور مقبوضات کی آمدنی کے اثرات کی شان و شوکت ضرور نظر آتی ہے جس کی چکاچوند نے اسے اسلامی ثقافت کا نام دے دیا ہے۔ یہ عربوں کی نصرت عربوں کی شان و شوکت کا زمانہ ہے جو ترک ملازموں کے اقتدار کے آگے سر جھکا دے گی۔ پھر بغداد کے محلات اور عمارات اور خزانے اور کتب خانے اور یونیورسٹیاں اور تجربہ گاہیں اور ہسپتال اور مدرسے ہلاکو خاں کی یلغار میں ختم ہو جائیں گے۔

اس سے پہلے کہ ہلاکو خاں کی فوجیں دجلہ کے پانی میں بغدادیوں کا خون آمیز کرنے پہنچ جائیں، میر خلیل الرحمٰن اور میں مورخین اسلام سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ اٹھتے ہیں اور اپنے بیسویں صدی کے بغداد میں پہنچ جاتے ہیں جہاں عبدالکریم قاسم کی حکومت ہے جو خود کو ابن عوام کہتے ہیں اور جن کی حکومت ہمیں آج ہی رات کربلا لے جانے کا انتظام کر رہی ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

رات کے دس یا گیارہ بجے ہم کربلا کی طرف کو روانہ ہوئے تو گرم ہوا کے جھونکے ہماری ایر کنڈیشنڈ ادرینہ کار کو جھلسائے دیتے تھے۔ یہ رات کا وقت ہے اور ہم ٹھنڈی کار میں بھی حبس محسوس کرتے ہوئے پچاس ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُدھر جاتے ہیں جہاں تیرہ سو برس قبل حسینؓ ابن علیؓ اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے ہوئے گرمیوں کی شدت میں کوفے کی طرف انقلابی عزائم لے کر آ رہے ہیں کیونکہ وہ یزید کو خدا کا خلیفہ نہیں مانتے۔

اپنی جذباتی بے چینی کے باوجود شاید ہم ایک تاریخی تماشا دیکھنے جا رہے ہیں کیونکہ ہمارے پاس قیمتی تھرماس ہیں ان میں ٹھنڈا شربت بھرا ہوا ہے اور کربلا کے ڈپٹی کمشنر کو ہمارے آنے کی اطلاع ہے اور اس نے ہمارے لیے چائے اور کافی کا ضرور انتظام کیا ہوگا۔

سامنے کربلا کا چھوٹا سا شہر ہے۔ گوجرانوالہ نواب شاہ کی طرح —— تنگ گلیوں میں ہلکی ہلکی روشنیاں ہیں۔ جن میں مدھم مدھم سائے پیغام حسینی کی تلاش میں گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پیغام جو اسی گرم اور سخت زمین پر تیرہ سو برس پہلے شہیدوں کے خون سے لکھا گیا تھا اور جسے صدیاں آج تک کس اضطراب و جستجو سے ڈھونڈھ رہی ہیں۔

کربلا کی سرزمین پہ قدم رکھتے ہی ہم گوناگوں کیفیات سے دوچار ہو گئے۔

تاریخ اسلام میں رسول اللہ صلعم کی ذات کے بعد سب سے زیادہ ادب شاید شہادت امام حسینؓ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس ادب کا تاریخی مقام بھی ہے۔ اور ساتھ ساتھ تجزیاتی، اصلاحی اور جذباتی بھی۔ اور اس سب کا مجموعی اثر ہر مسلمان کے ذہن پر کسی نہ کسی صورت میں قائم رہتا ہے۔

مجھ پر کربلا میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے تاثر یہ ہوا گویا مجھ میں اور امام حسین میں تیرہ صدیوں

اور ہزاروں میل کی دُوری ایک دم غائب ہو گئی ہے۔ میں نے یہ صاف محسوس کیا جیسے اب چند لمحے بعد میں بالکل ان کے سامنے حاضر ہونے والا ہوں اور اس احساس نے میرے بدن میں ایک تھرتھری سی پیدا کر دی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی۔ اپنے گردوپیش سے خوف آرہا تھا۔ ایک دم میں نے سوچا کہ چونکہ باقی ساتھی آگے بڑھ چکے ہیں میں اچھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤں۔ اور ساٹھ ستر میل کی رفتار سے کار بھگاتا ہوا ان پریشان کن حدود سے نکل جاؤں۔

مگر مجھ میں اس اقدام کی سکت بھی نہ تھی۔ میرے رگ وپے سے گویا جان نکل چکی تھی اور پوری رُوح میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ ہاں میں نے کچھ تیز تیز اور مسلسل آوازیں سُنیں۔ جیسے کوئی شدت سے خفا ہو رہا ہے۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ میرا سوتا ہوا یا مرتا ہوا ضمیر ہے۔ جس میں اس وقت بلا کی طاقت آگئی ہے اور جو مجھے میری پوری عمر کی تاریخ یاد دلا دلا کر کچو کے دے رہا ہے۔

وہ سامنے میر خلیل الرحمٰن ہنیے سدھ کھڑے ہیں۔ اور ان کے برابر صحافی اور پروفیسر شریف اور ہمارے دفتر خارجہ کے ایک نمائندے، پروفیسر شریف بایک عراقی میجر ہماری ترجمانی کے لیے کیونکہ ہمارے مستقل ترجمان بشیر فرج جو نسطوری عیسائی ہیں۔ ہمارے ساتھ نہیں آسکے۔

روضہ امام حسین "سیدنا حسین" کے نام سے بھی مشہور ہے، اس کے سامنے ایک چھوٹا چوک ہے، جس پر تین طرف سے سڑکیں آکر ملتی ہیں یہاں کربلا کے ڈپٹی کمشنر ہمارا استقبال کرتے ہیں۔ اور ہم روضہ مبارک میں داخل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک بہت بڑا صحن ہے۔ جہاں کالے کپڑے پہنے ہوئے سیکڑوں مرد اور عورتیں عبادات میں مصروف ہیں۔ کچھ سو بھی رہے ہیں۔ بارہ بجے رات کا وقت ہے۔

اندر سے روضہ پوری طرح روشن کیا گیا ہے۔ اور ہمارے علاوہ کسی اور زائر کو مزار شریف کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں حفاظت کا سخت انتظام ہے۔ اور زائرین کی کثرت کے سبب بڑے بڑے کیو بنائے جاتے ہیں۔ تب کہیں جاکر گھنٹوں بلکہ بعض اوقات دنوں میں کٹہرے کے قریب ہونے کی باری آتی ہے۔ گیارہ بجے شب زیارت بند کر دی جاتی ہے لیکن ہمیں جنرل قاسم کی مہربانی کے سبب روضے کے اندر جانے کی رعایت دی گئی ہے۔ زرنگار منقش دیواریں قیمتی شیشے کی چھتیں، شاہنشاہوں، بادشاہوں کے پیش کردہ جھاڑ فانوس اور ان سب کے بیچ میں سونے کے کٹہرے کے اندر، ایک چوبی تعویذ جس کے ایک کونے میں حضرات علی اصغر اور علی اکبر بھی مدفن ہیں۔

تو یہ امام حسین علیہ السلام کی یادگار ہے۔ کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا سونا اور چاندی اور نگینے اس سادہ روش مجاہد کے مزار کے لیے جسے خود ہم مسلمانوں نے صرف اعلان حق کرنے کی پاداش میں قتل کر دیا تھا۔ مسلمان قوم گناہ بھی خوب کرتی ہے اور کفارہ بھی ادا کرنا جانتی ہے۔

مزار کے کٹہرے میں جالیاں ہیں۔ بے شمار جالیاں۔ ان میں دھاگے بندھے ہوئے ہیں۔ منتیں ماننے والے دھاگے باندھ دیتے ہیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ منت پوری ہو جائے تو واپس آکر دھا کھولیں گے۔

سب نے اپنے رومال نکالے اور کٹہرے سے رگڑے اور تبرک کے طور پر محفوظ کر لیے۔ میر صاحب کو شاید پہلے سے احساس تھا۔ اس لیے وہ ایک صاف اور نیا رومال ساتھ لائے تھے۔ میری درخواست پر انھوں نے آدھا رومال پھاڑ کر مجھے دے دیا اور میں نے دیکھا کہ اُن کا پُرانا رومال تر ہو چکا ہے اور وہ اپنے مسلسل بہتے ہوئے آنسو آستینوں سے پونچھ رہے ہیں۔ میں نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا جس کے بارے میں ہدایت تھی کہ صرف مزار حسینؑ پر کھڑے ہو کر کھولا جائے یہ ایک "غیر دانشورانہ" اور طفلانہ بات ہو گی۔ مگر میں نے اس پر عمل کیا۔ یہ خط میری بیوی کا تھا۔

"مجھے یقین نہیں کہ تم اس دربار تک پہنچو گے۔ لیکن اگر ایسا ممکن ہوا تو وہاں جالیاں پکڑ کر صرف ایک بار میرے نیاز و عقیدت کا ذکر کر دینا۔ اتنا کہہ دینا کہ کروڑوں دردمندان اہل بیت میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں صدق دل سے تمھاری وہ تمام ناانصافیاں اور خطائیں معاف کر دوں گی جو اب تک میں نے برداشت تو کی ہیں مگر بھولی نہیں ہوں۔"

کلید بردار بائیں جانب ایک کمرے میں لے گیا۔ اور ایک تختہ اٹھایا۔ اس تختے کے نیچے ایک گڑھا سا تھا۔

"یہ حسینؑ کا مقام شہادت ہے۔" وہ بولا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سینہ شق ہو گیا ہو۔ اور پھر حسینؑ کی آواز گونجنے لگی۔

"واللہ اس وقت مشرق سے مغرب تک میرے سوا کوئی شخص تم میں سے یا تمھارے سوا کوئی اور کسی نبی کا نواسہ نہیں ہے اور میں تو خاص تمھارے نبی کا نواسا ہوں۔ یہ تو بتاؤ کیا تم اس لیے میرے درپے ہو کہ میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا ہے یا تمھارے کسی مال کو ڈبو دیا ہے یا میں نے کسی کو زخمی کیا ہے۔ جس کا قصاص مجھ سے چاہتے ہو۔"

اور یہ آواز اُن لوگوں کے سامنے گونج رہی تھی، جو سب کے سب خود کو مسلمان کہتے تھے اور جن میں سے بہتوں نے حج کر رکھے ہوں گے اور بہتیرے پابند صوم وصلوٰۃ بھی ہوں گے اور بہتیرے قرآن خواں بھی ہوں گے۔ وہ قرآن جو ابھی نصف صدی بھی پُرانا نہیں ہوا تھا اور جو انھی حسینؓ کے نانا محمدؐ رسول اللہ کی معرفت دُنیا تک پہنچایا گیا تھا اور ان تمام آدمیوں، تمام مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو حسینؓ کے سوال کا جواب دے۔ ہاں اس سوال کا جواب بعد میں سنان بن انس نے اس طرح دیا کہ ان کا سر کاٹ کر ابن زیاد یا ابن سعد کے پاس لے گیا۔ اور یہ شعر پڑھے۔

"میرے اُونٹوں کو سونے چاندی سے لدوا دے۔
میں نے ایک جلیل القدر بادشاہ کو قتل کیا ہے۔
میں نے اسے قتل کیا ہے جس کے ماں باپ بہترین خلق ہیں۔
اور جو نسب کے اعتبار سے خود بھی بہترین خلق ہے"

میں نے سوچا کہ امام حسینؓ کا سوال اور سنان بن انس کا جواب بھی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ ہاں فرق اتنا ہو گا کہ حسینؓ کی آواز حق و انصاف کی چھوٹی چھوٹی صداؤں میں تقسیم ہو تی جائے گی اور سنان بن انس کے مطلوبہ سونے چاندی کے لدے ہوئے اُونٹ بینک اکاؤنٹس پرمٹوں، لائسنسوں عہدوں اور خطابوں میں پھیلتے جائیں گے۔ شاید انسانیت کا مقدر بھی یہی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

امام عباس علمدار کا مزار بڑا اجلالی ہے۔ اس کی محرابوں کی مرمت ہو رہی تھی۔ مقبرہ بہت کشادہ ہے اور اندر تعویذ کے گرد چاندی کی تھریج ہے۔ دوست، وفادار عباس جنھیں اپنے سالار حسینؓ کی شکست اور اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی مگر جو اپنے فیصلے اور ڈسپلن سے باہر نکلنے پر تیار نہ ہوئے اور اپنے سردار سے پہلے شہید ہو گئے۔

معلوم نہیں ایسے لوگ پھر پیدا ہونگے یا نہیں۔

کربلا سے نجف اشرف تک تیز کار ایک گھنٹے میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں حضرت علیؑ کا مقبرہ ایک عجیب شان رکھتا ہے۔ دبدبہ جلال اور جمال مزار مبارک کے گرد جالیوں کا کٹہرا اور کٹہرے میں سیکڑوں دھاگے اور قفل لگے ہوئے۔ بہت سے قفل بہت قدیم تھے۔ شاید ان کے لگانے والے بھی

واپس نہ آسکے۔ یہاں جالی میں دھاگا باندھنا یا قفل لگانا بڑی مشکل اور بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اوّل تو زائرین اندر ہی کب پہنچ پاتے ہیں اور جو پہنچ بھی گئے انھیں تیزی سے چلتی ہوئی قطار میں کب وقت ملتا ہوگا کہ سکون سے منت مانیں اور دھاگا باندھیں۔

پتا نہیں یہ بدعت تھی یا محبت یا خوف و عزائم کی کشمکش میں گوگو کے عالم میں تھا کہ ایک رہنما نے آگے بڑھ کر ایک ڈوری میرے ہاتھ میں دے دی اور میں نے اس کے دو ٹکڑے کر کے دو جالیوں میں باندھ دیے۔

ہم نے نجف اشرف سے آدھے گھنٹے کا سفر طے کیا اور کوفے پہنچ گئے جہاں ہمارے لیے ایک شاندار اور جدید ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہم نے کمشنر کوفہ کو جو ہمارے میزبان تھے اُردو کا محاورہ سکھایا اور کہا کہ ہم کوفے کا پانی نہیں پئیں گے، وہ خجل ہوکر مسکرائے اور کہنے لگے ہاں کوفہ تاریخی اعتبار سے ایک المناک جگہ ہے لیکن پانی سے گریز نہ کیجیے۔ کوفے کا پانی حضرت علیؓ نے بھی پیا ہے کیونکہ یہاں انھوں نے بہت دن خلافت کی ہے۔

مسجد کوفہ کے تاثرات عجب مرتب ہوئے۔ اس منبر کے پاس حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا صحن کے باہر بائیں ہاتھ کے اُونچے مینار پر ایک روایت کے مطابق بلالؓ بھی اذان دے چکے ہیں۔ دائیں ہاتھ کو مسلمؓ بن عقیل کا مزار ہے اور وہیں قریب ہی ہانی بن عروہ کا مزار ہے۔ تربت زین العابدینؓ بھی یہیں ہے۔ دالان سے ذرا آگے ایک طرف ایک قبہ ہے جس کا نام مقامِ آدم ہے۔ روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کے قدم اس مقام کو چھو گئے ہیں۔ مجھ ابنِ آدم نے ایک تصویر یہاں بھی کھنچوائی مسجد کوفہ بہت وسیع اور خوبصورت ہے لیکن اس کے حسن پر تاریخی عظمتیں غالب آگئی ہیں۔

یہاں حضرت علیؓ وہ خطبے ارشاد کرتے ہوں گے جن کی دانش و بلاغت کا جواب عالمی ادب میں بھی مشکل سے ملے گا۔ یہیں عبداللہ ابن زیاد نے شہادت حسینؓ کے بعد ہزار ہا مسلمانوں کو نماز پڑھائی ہوگی اور خطبوں میں یزید کا نام لیا ہوگا۔ اور لوگوں نے اس تمام صورت حال کو قبول کیا ہوگا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

"میر خلیل الرحمٰن تمھیں خدا کی قسم ایک تصویر اس مقام کی اور کھینچ لو" میں ہر مقام پر ان سے درخواست کرتا ہوں۔

مسجد کے پیچھے حضرت علیؓ کا مکان ہے۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا گھر ہے جو بانی

کے باپ یا ہانی نے حضرت علیؓ خلیفۃ المسلمین کو رہنے کے لیے دیا تھا۔ اس وقت حضرت کی حکومت سندھ سے افریقہ تک تھی لیکن نہ ان کے پاس اپنا ذاتی گھر تھا نہ انھوں نے قصر امارت بنوایا تھا یعنی ان کے رہنے کے لیے کوئی وہائٹ ہاؤس یا کوئی کریملن یا کوئی گورنمنٹ ہاؤس نہیں تھا بلکہ وہ ایک دوست اور معتقد شہری کے عارضیتاً دیئے ہوئے مکان میں رہ کر مشرق و مغرب پر حکمرانی کرتے تھے۔ اس مکان کے بیچ میں ایک چھوٹا سا صحن ہے۔ بائیں ہاتھ کو بیچ میں ایک نیم دائرے میں ایک بے چھت قبہ سا ہے گویا انتظار گاہ جہاں مشیر اور سردار اور گورنر ان کا انتظار کرتے ہوں گے۔ دائیں ہاتھ کو صحن کے دوسری طرف ایک تاریک اور بہت مختصر سا کمرہ ہے جہاں وہ شہادت کے بعد نہلائے گئے تھے۔ شاید یہ ان کا پرائیوٹ بیڈ روم ہو۔ اس سے ذرا آگے صحن کے دوسرے کونے میں ایک اور کمرہ جو ہمارے معیار سے کوٹھری جیسی جگہ ہے۔ یہ زنان خانہ تھا۔ ہم نا کردانِ ہند و پاک کے تہذیبی رشتوں کے پابند اس کمرے میں نہیں گئے کیونکہ یہ حریم علی تھا۔ عراقی زائرین حریم میں بے تکلف آ جا رہے تھے۔ ان کمروں کے سامنے ایک مختصر سا دیوان خانہ ہے جس کے اوپر چھت ہے۔ یہ گویا ان کا دفتر ہے جہاں پورے عالم اسلام کے سیاسی، مالیاتی، مذہبی اور دفاعی مسائل کے حل تلاش کیے جاتے ہوں گے۔ جبکہ نہ پنکھے تھے نہ کولر نہ ایر کنڈیشنر۔ حضرت علیؓ کا منصب یعنی انگریزی میں اسٹےٹس STATUS اور اس وقت کا فوجی انتشار ضرور اس امر کا مطالبہ کرتا ہوگا کہ وہ ایک بڑے محل میں قیام کریں لیکن وہ اسی دو بیڈ روم اور ایک آفس روم والے چھوٹے سے سخت گرم اور سخت سرد گھر میں رہے اور وہیں ان کی لاش نہلائی گئی۔

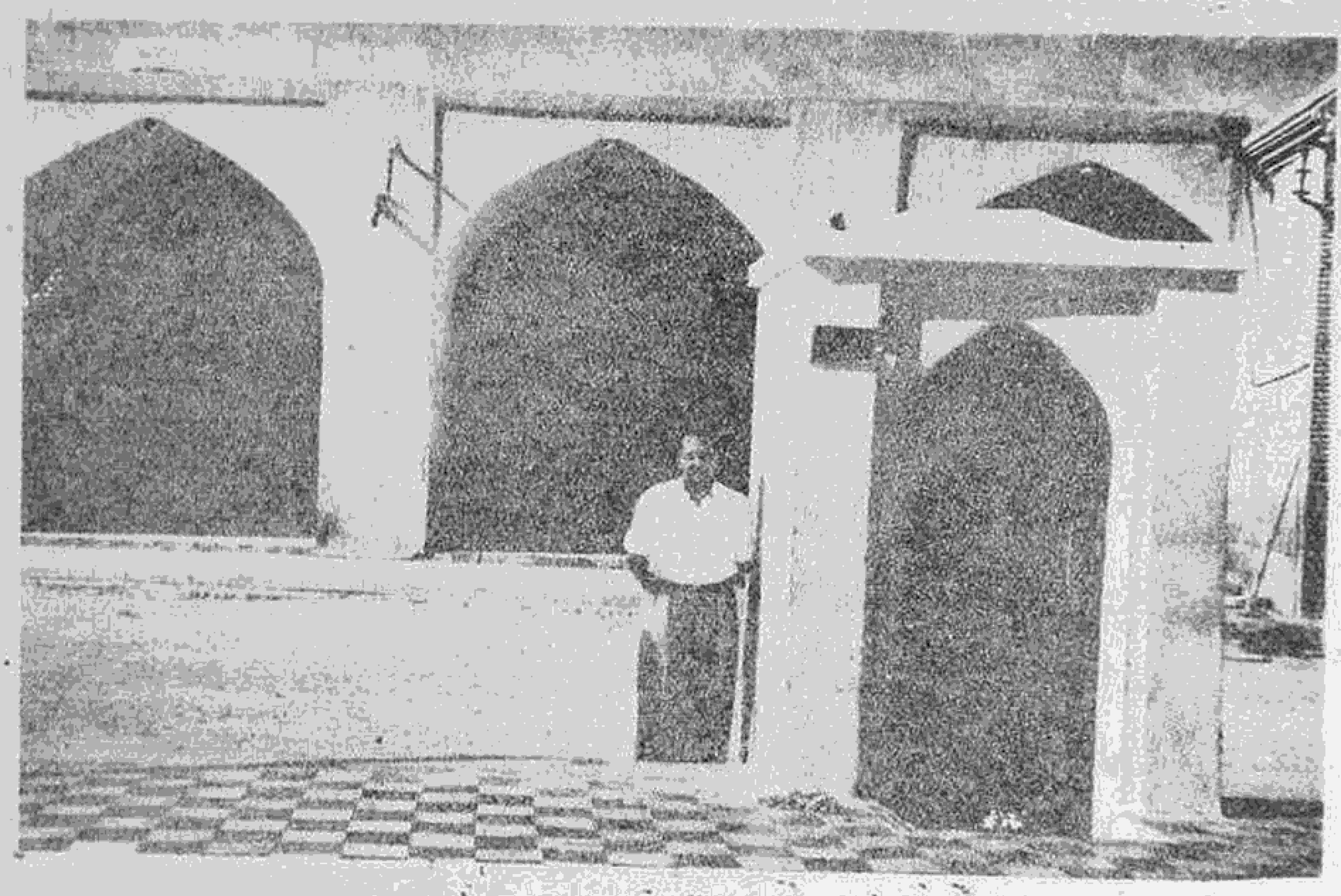
ہاں وہ چھوٹا سا گھر میری گنہگار آنکھوں اور مجرم روح میں سما گیا ہے خواہ اس بات پر بیسویں صدی کے صحافیوں، ادیبوں، سیاسی مفکروں، دانشوروں اور کوتوالوں کو کتنا ہی غصہ آئے۔

اور۔ اسی چھوٹے سے گھر کے عین سامنے بنو امیہ کے طول طویل اور بلند محلات کے کھنڈر ان کے عروج و زوال کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ محلات جن کے ذکر سے تاریخ کی آنکھیں چکا چوند ہوتی رہتی ہیں آج ویرانے کہلانے کے قابل بھی نہیں۔ ان کی دیواریں جو بہت اونچی اور منقش ہوں گی اور اعلیٰ درجے کے مسالوں سے بنائی گئی ہوں گی فرش میں پیوست ہو گئی ہیں اور فرش بنیادوں میں پیوست ہو گیا ہے اور بنیادیں ہیں کہ غاروں کی شکل میں روز بروز نیچے دھنستی جا رہی ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

ہاں بھائی ہم اب شہر کوفہ نہیں دیکھیں گے یہ جذبہ ہندی مسلمانوں کی میراث ہو یا کچھ اور مگر

ہمیں کوفے میں گھومتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ تاریخ میں ایسا کم ہوا ہے کہ ایک پورے شہر ایک پوری آبادی نے اپنے محترم، شریف اور مقدس اکابر کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو جیسا کوفیوں نے بار بار کیا۔ اس وقت ہمیں جدلیت اور فلسفہ سلطنت اور منطق و تجزیہ کے پیچاک میں مت اُلجھاؤ، تاریخی عوامل کے سبق نہ پڑھاؤ جذبات جب اُمنڈتے ہیں تو علم اور صبر کے تودے اس طرح پگھل کر بہہ جاتے ہیں جیسے کوفے کی گلیوں میں خود کوفیوں کے بلائے ہوئے حسینی سفیر مسلم بن عقیلؓ کا خون بہہ رہا تھا۔



مسجد کوفہ۔ مقام آدم اور مصنف

بابل کے کھنڈر

کوفے سے ہم بابل کی طرف چلے۔ ایک پکی سڑک پر کار تیزی سے مڑنے لگی۔ پتہ نہیں بابل کوفے سے کتنی دور ہے۔ موٹر سے کوئی دو گھنٹے کا راستہ ہوگا۔ بغداد سے اس کا فاصلہ کوئی پینتالیس پچاس میل ہے۔

"میر صاحب" میں نے کہا: "یہ بابل جانے کا کیا طریقہ ہے۔ ارے بھائی رتھ ہوتے جنہیں ساز و سامان سے آراستہ سفید گھوڑے بڑی شان کے ساتھ کھینچتے ہوئے چلتے۔ ایک دو منزل پڑاؤ ہوتا۔ راتوں کو مشعلیں جلتیں، شعرا اپنے رزمیے سناتے۔ مغنی تانیں لگاتے اور صبح پھر نفیریوں اور بوق و قرنا کی گونج میں سفر جاری ہو جاتا۔" "ٹھیک کہتے ہو میرے بھائی" میر خلیل الرحمٰن ایک آہ بھر کر بولے "مگر افسوس کہ میں سارے دن رتھ میں کھڑے رہنے کی بجائے بیٹھ کر ہی مسافت طے کرنا بہتر سمجھتا ہوں' دوسری مشکل یہ ہے کہ آج کل دس پانچ رتھ بنانے کا آرڈر بھی دیا جائے تو کوئی کمپنی تیار نہیں ہوگی اور سفید گھوڑے تو بالکل نایاب ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ وہاں سیر کرو گے یا ان کھنڈروں پر کوئی نئی سلطنت قائم کرنے کی سوچ رہے ہو"

بابل ___ جس کی قدامت اور عظمت کے بارے میں بے شمار کہانیاں، روایتیں، اندازے اور انکشافات کتاب مقدس کے اوراق سے لے کر ہیروڈوٹس یونانی سیاح جیسے عینی گواہوں اور بیسویں صدی کے جرمن ماہرین آثار قدیمہ کی کتابوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بابل! یہاں وہ کنواں تھا جس میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو کسی گناہ کی پاداش میں الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ نے ان فرشتوں کو اہل بابل کی عیاشیوں اور بد اعمالیوں کے انسپکشن یعنی معائنے کے لیے بھیجا تھا مگر بعد میں وہ خود اسی چکر میں پھنس گئے جیسے آج بھی بہت سے محکموں کے انسپکٹر پھنس جاتے ہیں ___ بابل جو انسانی تاریخ کے اولین بابوں میں

شمار ہوتا ہے۔ جہاں اٹھارویں صدی قبل مسیح یعنی اب سے تین ہزار سات سو برس پہلے شہنشاہ حمورابی نے سوسائٹی کے لئے وہ دستور اور قوانین بنائے تھے جن کے سبب وہ حمورابی قانون دہندہ کہلاتا ہے۔ حمورابی کی قانون سازی معاشرتی حقوق و فرائض کی پیچ در پیچ عمارت کی پہلی بنیادوں میں شامل ہے۔ تین ہزار سات سو برس پہلے بہت سے ملک تہذیب تو کیا انسانی آبادی سے بھی محروم تھے۔

مگر جو بابل ہم دیکھ رہے ہیں وہ بخت نصر کا بنایا ہوا بابل ہے کیونکہ حمورابی کا بابل سولھویں صدی قبل مسیح میں بیرونی حملہ آوروں نے بڑی حد تک تباہ کر دیا تھا اور پھر کمزور سلطنتوں کے عروج و زوال میں اسے۔ صدیوں تک اپنی عظمت رفتہ واپس نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی قبل مسیح کے طاقت ور شہنشاہ بخت نصر نے اسے دوبارہ بام عروج پر پہنچا دیا۔ بخت نصر نے چوالیس برس حکومت کی اور اس کے زمانے میں دجلہ و فرات کے درمیان اس اونچی فصیلوں والے شہر سے وہ تہذیب ابھری جس کی یادیں اور یادگاریں یورپ و امریکہ کی شان و شوکت سے آنکھیں لڑاتی ہیں۔

بخت نصر دہریہ تھا یعنی خدا یا دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا اور اسی لیے اپنی حوصلہ مندی اور طاقت کے باوجود اپنی قوم میں نامقبول ہوگیا۔ شاید یہی سبب تھا کہ اس کے بعد بادشاہی اس کے خاندان میں قائم نہ رہ سکی اور اس کی موت کے بعد بہت جلد شہنشاہ ایران سائرس نے بابل پر قبضہ کرلیا۔

ہاں یہ وہی بابل ہے جہاں ہندوستان سے واپسی پر سکندر اعظم نے مسلسل تین دن تین رات جشن منایا اور تین دن بیمار رہ کر مرگیا۔

اب وہ بابل کھنڈر ہے، آثار قدیمہ کا ایک گوشہ ہے اور ہم بیسویں صدی کے کمزور بے طاقت سیاح ان محلات کے ان حصوں میں گھوم رہے ہیں جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہاں کوئی پہرے دار نہیں جو ہمیں ان عشرت خانوں میں داخل ہونے سے روک دے کوئی محتسب نہیں جو ہماری گفتگو ہماری تنقید پر پابندی لگا سکے۔

مجھے بابل کے کھنڈروں میں گھومتے ہوئے ایک عجیب سی آزادی اور خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

ہمارا گائیڈ ایک مفلوک الحال عراقی ہے مگر وہ ایک صحت مند اور ہنس مکھ آدمی ہے، انگریزی صاف اور تیزی سے بولتا ہے۔

"ہاں بیٹا بخت نصر" وہ چوک میں کھڑے ہوکر آواز دیتا ہے "اب ہم سے بات کرو میں روز غیر ملکی سیاحوں کو تمہارے محلات کی سیر کراتا ہوں اور تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم اس ملک کے سب سے زیادہ باجبروت بادشاہ تھے، تمہاری آنکھ کے ایک اشارے پر موت اور دوسرے پر زندگی رقص کرتی تھی۔ اب بولو بیٹا۔ میں تمہارے دارالسلطنت کے دل میں کھڑا ہوکر تمہیں القاب و آداب کے بغیر پکار رہا ہوں کہاں ہیں، تمہاری سوار اور پیادہ فوجیں کہاں ہیں۔ کہاں ہیں تمہارے خفیہ اور باوردی محتسب۔ تم ایک مطلق العنان شہنشاہ تھے مگر تم مرگئے اور ختم ہوگئے اور تمہارا جاہ و جلال اور دبدبہ تمہارے ساتھ ختم ہوگیا اور میں ایک چھوٹا سا آدمی ہوں مگر میں زندہ ہوں اور زندہ رہوں گا۔ میں عامی ہوں۔ عام آدمی۔ تاریخ تم پر ہنستی اور مجھ سے شرماتی ہے۔"

بخت نصر کوئی جواب نہیں دیتا کسی سمت سے کوئی تیر نہیں چلتا جو اس کے سینے میں پیوست ہوجائے، کوئی تلوار کوئی خنجر نہیں جو اس کی زبان قلم کردے، یہ عراقی گائیڈ مخبوط الحواس سہی مگر اس کی زبان وقت کی زبان ہے جو کٹ نہیں سکتی۔ آج وہ شہنشاہ جس کے نام سے عراق، ورشام اور ایران کانپتے تھے ایک معمولی سے گستاخ گائیڈ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ہاں موت سب کو آتی ہے مگر وہ اچھی طرح یاد کیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کام دوسروں کے لیے بھی کیا ہو۔ کل میں امام حسین کی قتل گاہ بھی دیکھ آیا ہوں جن کی موت اس طرح ہوئی تھی کہ ان کی لاش کو سیکڑوں گھوڑسواروں نے تپتی ہوئی دھوپ میں روندا تھا اور بخت نصر کی موت اس طرح ہوئی ہوگی کہ بے شمار فوجوں کے پیچھے سیکڑوں کنواریاں ریشمی لبادے پہنے خوشبوئیں لگائے میٹھی میٹھی آوازوں میں گیت گاتی ہوئی اس کا تابوت کھینچ کر سونے چاندی سے لپے ہوئے مندر میں لے گئی ہوں گی اور لاکھوں روپے اس کی آخری رسموں پر خرچ ہوئے ہوں گے۔

مگر میں امام حسین کے مزار پر رویا اور روتا رہا اور بخت نصر کے محل پر مجھے ہنسی آتی ہے، اور شاید یہ ہنسی عبرت کا ایک ذریعہ اظہار ہے۔

اُونچے اُونچے مکاں تھے جنکے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی اُنکے خاک ہوئے

اور ان استخوانوں کی خاک پہ کھڑے ہوکر ہم شہر بابل کا تماشا دیکھتے ہیں۔

اس مقام کا سب سے زیادہ پُر اثر منظر باب عشتار کا ہے۔ عشتار گیٹ یا اُردو کے چٹخارے میں عشتاری دروازہ جو سرخی مائل پکی اینٹوں کا بنا ہوا کئی گز اونچا دروازہ ہے۔ یہ گویا وسطِ شہر میں ایک یادگار عمارت تھی جس کے بیچ میں سے ایک شاہراہ جلوس کوئی نصف میل تک سیدھی چلی جاتی ہے۔ دروازہ عشتار دیوی سے منسوب ہے۔ یہ دروازہ اژدہوں اور جوان بیلوں کی تصویروں سے مزین ہے جو اینٹوں پر کھودی گئی ہیں۔ یہاں سے جو شاہراہ جلوس سامنے جاتی ہے اس کے دونوں طرف کی دیواروں پر ببر شیروں کے ایک سو بیس نقوش کھود دیئے گئے تھے۔ خود باب عشتار پر ایک اندازے کے مطابق ساڑھے پانچسو اژدہوں اور بیلوں کے نقوش بنائے گئے تھے۔ دروازے کے اُوپر اس حصے پر جس کے قریب میں کھڑا تھا رنگ دار چمکیلی اینٹیں چسپاں ہیں۔ ان اینٹوں پر رنگ کی تہہ چڑھائی گئی تھی جو پونے تین ہزار برس گزر جانے پر بھی اسی طرح قائم ہے۔ تہذیب بابل پر کام کرنے والوں نے سلطنت بابل دنیا کے سیکڑوں آثار ان گنت کتابوں میں مذکور کیے ہیں جو جانوروں اور انسان نما جانوروں کی تصویروں اور وضاحتی علامتوں سے پُر ہیں۔ یہ علامتیں طرح طرح کے خوف و غم کی کہانیاں سناتی ہیں۔

باب عشتار کے جنوب مغرب شاہی محلات کا علاقہ ہے جو تیرہ ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک محل کے سامنے کھڑے ہو کر میں بڑی اتراہٹ کے مارے اِدھر اشارہ کرتے ہوئے تصویر کھنچواتا ہوں (اور بعد میں اس چھٹ پنے پر شرماتا ہوں)۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے بابل کی دولت و حشمت کے غلغلے اس طرح اُٹھے کہ ان کے ارتعاش آج بھی ہمارے ادب میں صاف سنائی دیتے ہیں۔ اس علاقے میں عمارتوں کے پانچ بڑے بڑے سلسلے تھے جن میں سے وسطی عمارت ایک بہت بڑا دربار ہال یا دیوان تھی، جس میں نیلی چمکدار اینٹوں کا کام تھا۔ اس وسیع عمارت کی بوجھل چھت بنانے والے انجینئرنگ کے ترقی یافتہ اُصولوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ شاید یہی وہ دیوان یا دربار ہے، جس کی دیوار پر عین جشن طیافت کے وقت ایک غیبی ہاتھ نے چمکتے ہوئے لفظوں میں زوالِ بابل کی پیشین گوئی لکھ دی تھی۔ اس روایت نے بعد میں بہت سی زبانوں کو اس مضمون سے ملتے جلتے محاورے دیے ہیں۔

اس دربار ہال کی دیوار پر زوالِ بابل کی غیبی پیشین گوئی کا نمودار ہونا شاید صرف ایک کہانی ہو مگر یہ کہانی وقت اور تاریخ کی سب سے زیادہ نمایاں اور مسلسل حقیقت ہے۔ ہر دور میں یہی ہوتا ہے کہ پہلے وقت کے ہاتھ نسلوں اور قوموں کے سامنے دیوار پر تنبیہی تحریریں لکھتے ہیں اور اگر وہ راستی پر نہ آجائیں تو ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ یہ تحریریں ہزار ہا برس سے لکھی جا رہی ہیں۔ اور انھیں دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں مگر پھر بھی کچھ نہیں سمجھتے۔

"کیا یہ بابل عظیم نہیں ہے۔ جسے میں نے اپنی شاہانہ نمود کے لیے بنایا ہے" یہ بخت نصر کی تحریر ہے۔ جسے جرمن ماہرین نے بالآخر پڑھ لیا ہے۔

ایک اور تحریر بھی وقت کے دھندلکوں میں سے اُبھرتی ہے جسے عیسیٰ پیغمبرؑ کا کلام کہا جاتا ہے۔

"اور وہاں صحراؤں کے درندے گھومیں گے۔ اور ان کے مکان
خوفناک مخلوقات سے بھر جائیں گے، ان گھروں کو اُلو اپنا مسکن
بنائیں گے۔ اور چرخ وہاں رقص کریں گے؟

ہاں یہ اس شہر کا حال ہے جو دو دریاؤں کے بیچ میں ایک بلندی پر واقع ہے اور جس کے گرد تہہ در تہہ فصیلیں اور دیوار اندر دیوار محلات اور مندر تھے تاکہ حملہ آوروں کی مزاحمت قدم قدم پر کی جا سکے۔ یہ شہر تقریباً ڈھائی ہزار برس قبل مسیحؑ سے لے کر سکندر اعظم کے زمانے تک پوری ہمعصر اور بعد کی دنیا کے لیے ایک مرقع حیرت بنا رہا۔ جہاں اکاری رسم الخط اور طرز تحریر پیدا ہوا، جہاں دنیا کی پہلی انسائیکلو پیڈیا ترتیب دی گئی۔ جہاں چھتوں پر باغ تھے۔ ہینگنگ گارڈن جہاں سڑکیں ایک دوسرے کو سیدھی اس طرح کاٹتی تھیں جیسے نیویارک کی سڑکیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ اس وقت یورپ اور امریکہ میں بسنے والی قومیں شاید کھالیں پہن کر ستر پوشی کرتی ہوں گی، جب بابل کے صنعت کار ریشم و سنجاب کے ملبوسات تیار کر کے ہندوستان اور مصر بھیجتے تھے۔ ایسے وقت میں اپنے موہن جوڈارو کی یاد آ کر ایک طرح اپنے وطن کی قدامت و عظمت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ موہن جوڈارو کے انکشافات مکمل ہونے پر شاید بابل و نینوا کی تہذیبیں نو دولتوں کی طرح لگیں گی مگر موہن جوڈارو پر ابھی تک لاعلمی اور قیاس کی کہر چھائی ہوئی ہے۔

تو یہ ہے بابل۔ سُرخ پختہ اینٹوں اور نیلی اور زرد چمکدار اینٹوں کا ویرانہ۔ بے شمار دیوی دیوتاؤں کا معبد۔ حمورابی اور بخت نصر اور سکندر اور سائرس کا بابل جب اس کی کھدائی کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا اور جرمن ماہرین، اینٹیں اور مجسمے کھلے چھوڑ گئے تو قریب کے گاؤں حلہ کے باشندوں نے بے شمار مسالہ اپنے چھوٹے چھوٹے گھر اور سڑکیں بنانے میں استعمال کیا۔ عشتاری دروازے کا بہت سا مال جرمن ماہرین لے گئے تھے جو انھوں نے برلن کے عجائب خانے میں استعمال کیا — اس عجائب خانے پر بھی جنگ عظیم میں بم باری ہوئی اور وہ تقریباً تباہ ہو گیا۔

ہاں یہ بابل ہے جو کسی مورخ یا مبصر یا اہل دل کے الفاظ میں پہلے شہر عظیم تھا اور اب صحرائے

عظیم ہو کر رہ گیا ہے۔

اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو۔

کھنڈروں کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو عجائب خانے کا کام دیتا ہے۔ یہاں قدیم تحریروں، روایتوں، نقشوں اور موجودہ آثار کی بنا پر قدیم شہر کا ایک نمونہ تیار کیا گیا ہے جسے دیکھنے سے عجیب عجیب اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ شہر کی ترتیب، وہ رکھ رکھاؤ، وہ دمدموں اور فصیلوں کی ترتیب اور مضبوطی۔ جب اس کی مضبوط سڑکوں پر شہسوار گھوڑے کدا تے ہوں گے تو کیا کسی کو خیال آتا ہو گا کہ ایک دن ہم اور ہم جیسے بے شمار سیاح شہر سے متعلق عجائب خانوں میں حیرت سے اس کا ماڈل دیکھا کریں گے۔

سلطنت بابل اور سلطنت نینوا کی رقابت کی کہانیاں، دونوں میں حربی اور فنی مقابلوں اور ان سب کے پیشرو آشوریوں کی تہذیب اور اس کے آثار و فنون لطیفہ کی داستانیں سیکڑوں کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ ان کتابوں میں بادشاہوں، دیوتاؤں اور جانوروں کے مجسموں کے مرقعے اور ان پر تفصیلی تحقیق کے نتائج درج ہیں مگر ان کا ذکر ایک باقاعدہ مورخ کا کام ہے۔ جو میں نہیں ہو سکا میں تو ایک چھوٹا سا آئینہ ہوں جسے اتفاقات نے عالمی گردش میں ڈال دیا ہے۔ بس وہی کچھ بیان کر سکتا ہوں، جس کا عکس میرے ذہن پر ابھرتا ہے۔ شیشے کے ٹکڑے اور انسانی ذہن میں یہ فرق ضرور ہے کہ شیشے پر گزرتے ہوئے نقوش مٹتے جاتے ہیں اور ذہن کی تہیں انھیں جذب کرتی رہتی ہیں۔

چلتے چلتے میں نے سوچا کہ اگر کبھی میرا گزر نیویارک سے ہوا اور اگر وہاں مجھے کسی گائیڈ نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ یا آزادی کا مجسمہ دکھاتے وقت لاف زنی کی تو بابل کا تجربہ یا مشاہدہ میرے کام آنا چاہیے۔ ایک طفلانہ جوش کے ساتھ میں بھاگا ہوا واپس گیا اور عشتاری دروازے سے ایک اینٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ لیا (جو قانوناً جرم ہے) پھر میں نے عجائب خانے کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بچے سے آٹھ آنے میں قدیم بابل کے ماڈل کا پکچر کارڈ خریدا اور یوں فاتحانہ موٹر کی طرف چلا جیسے حمورابی کی بجائے اس کی کتاب قانون کا مصنف میں تھا اور اب شہنشاہ بخت نصر کے تخت پر براجمان ہونے جا رہا ہوں۔

انجان مورخ کی رہنمائی

بابل سے ہم بغداد واپس چلے جہاں دو دن ٹھہر کر بیروت روانہ ہونا ہے۔
بغداد میں وہی ہنگامے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ڈنر پارٹیاں تقریریں، باہر گرمی اور اندر ہوٹل خیام کے ایرکنڈیشنڈ کمروں میں عالمی سیاست پر بحثیں۔

مگر اب سب بور ہوتے جاتے ہیں۔ اگر للین (لی لی ین) نہ ہوتی تو بغداد ہمارے لیے خالی ہوگیا تھا۔ للین کی جاسوسی کے قصے بہت عام ہوگئے ہیں مگر اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں کچھ ایسا جادو ہے کہ کسی کو اس سے کھل کر بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

ایک رات فوجی اکادمی نے ایک شاندار عشائیہ ترتیب دیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ کئی سو نئے افسران نے فوجی تربیت ختم کی ہے اور عشائیے کے بعد ان کی رسم حلف ہوگی۔ اس وقت کوئی ایک ہزار مہمان ہوں گے۔ جب جنرل قاسم نے تربیت یافتہ افسروں سے حلف لیا

"عاش زعیم عبدالکریم" سب افسروں نے یک آواز ہو کر کہا۔

اور ــــ اور اس کے بعد انھوں نے حلف اُٹھایا۔ عراق کی وفاداری کا اور خود جنرل قاسم سے ذاتی وفاداری کا ـــــ ان کی ذات سے وفاداری کا۔

"اللہ اکبر" ہمیں ترجمان پر یقین نہیں آیا۔

"ارے میاں حال میں کب تک گرفتار رہو گے" کسی نے آواز دی "حال میں بڑے چکر ہیں۔ اگر دیکھو اور سمجھو تو بولنے کو جی چاہتا ہے۔ بولو تو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ نہ بولو تو اندر ہی اندر گھٹ جاؤ۔ آؤ جدید عراق کو چھوڑو بس بہت دیکھ لیا۔ اب تم یہاں سے جانے والے ہو۔ آؤ ہم تمھیں قدیم عراق ۔۔ کھو آئیں"

میں پہلے ہی بابل دیکھ کر آرہا ہوں، اب پرانے کھنڈر اور تہذیبوں کے آثار دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یا شاید میں جدید نوجوان موٹی موٹی آنکھوں والی للین کو چھوڑ کر شیریں فرہاد کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مگر خسرو اعظم موت کے بعد بھی اتنا طاقتور ہے کہ مجھے شیریں یعنی للین سے چھڑا دیتا ہے۔ اور میں اپنی بھولی بسری یادوں کے انجان مؤرخ کی رہنمائی میں پھر قدیم عراق میں پہنچ جاتا ہوں۔

یہ طاق کسریٰ ہے۔ کوئی پچاس برس پہلے اس کا بایاں حصہ ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن یہ تصویر اس وقت سے پہلے کی ہے۔ جب یہ عظیم اور قدیم کمان ٹوٹ کر ختم ہوگئی تھی۔ کسریٰ چار سو برس قبل مسیح گزرا ہے۔ عراق میں بابل و نینوا اور آشوریوں کے آثار چھوڑ کر سب قدیم عمارتیں یا کسریٰ سے منسوب ہیں یا ملکہ سیمی رامس سے۔ سیمی رامس جو پہاڑی گڈریوں کے خاندان سے اٹھی تھی اور پورے میسوپوٹیمیا پر حکومت کر گئی۔

یہ وہ طاق کسریٰ ہے جس کے بارے میں صدیوں سے روایت چلی آتی ہے کہ اس کے ستون ہاتھی دانت کے تھے اور ان کے اوپر ہیرے جواہر جڑے ہوئے تھے۔ بات یہ ہے کہ مؤرخین اگر ہم عصر ہوتے تھے تو بادشاہ کی خوشنودی منظور ہوتی تھی اور بعد میں لکھتے تھے تو اپنے نفقر و فاقہ کی کمی خوش خیالیوں سے پوری کرتے تھے۔ یا شاید یہ ہوا ہو کہ جب عربوں نے خالد بن ولید کی قیادت میں مدائن پر قبضہ کیا اور ساسانیوں کی بے شمار دولت ان کے ہاتھ لگی تو رجز خواں عربوں یا ہزیمت خوردہ ایرانی شعرا اور داستان گو حضرات نے ان محلات کی شان و شوکت بیان کی تو ستونوں میں سفید پتھر یا سنگ مرمر کی جگہ جوش بیان نے ہاتھی دانت لا سجایا۔ ہاتھی دانت ایران و عرب میں نوادر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا ایسا بے دریغ استعمال قابل یقین نہیں معلوم ہوتا۔

مدائن ساسانیوں کا پایۂ تخت تھا اور اس کی فتح حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس طرح ہوئی تھی کہ دجلہ کے ایک طرف لاکھوں ایرانی (عجمی) مسلح کھڑے تھے اور دجلہ زور شور سے بہہ رہا تھا اور خالد بن ولید چند ہزار مسلمانوں کے ساتھ طوفان زدہ دجلہ میں اتر گئے۔ پہلے تو عجمیوں کو یقین ہی نہ آیا کہ ایسا طوفانی دریا پار کرنے کی ہمت ہی عربوں کو کیسے ہوسکتی ہے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ بے تاب موجیں اور پُر شور بھنور سر پھوڑ پھوڑ کر رہ جاتے ہیں اور مسلمان بڑھتے آتے ہیں تو وہ بجائے تیر چلانے یا کنارے پر جم کر ریلا روکنے کے ہتھیار چھوڑ کر بھاگنے لگے اور چلانے لگے۔

"دیواں آمدند۔ دیواں آمدند" (دیو آگئے۔ دیو آگئے)

مالِ غنیمت میں اور جو کچھ ملا سو ملا لیکن سب سے نادر ایک فرش ملا۔ اس کا نام فرشِ بہار یا صرف بہار تھا جس پر ایرانی شہنشاہ موسم خزاں میں بیٹھ کر شراب پیتے تھے۔ یہ فرش سونے کا ایک بہت بڑا تختہ تھا جس پر سونے اور ہیرے اور زمرد اور عقیق کے درخت اور ان کی شاخیں اور اُن کے پھل لگے ہوئے تھے۔ یہ وہی مالِ غنیمت تھا جسے مسلمان مجاہدوں نے لوٹنے کی بجائے اپنی فتح کی یاد میں محفوظ مدینے بھجوا دیا مگر حضرت عمرؓ نے اسے محفوظ رکھنے کی بجائے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مستحق لوگوں میں بانٹ دیا۔

ہاں یہ وہ علاقہ ہے جہاں قرونِ اولیٰ کے اسلام نے اپنی سادگی اور ہیبت کے نقش قائم کیے تھے ـــــ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب بغداد تعمیر نہیں ہوا تھا۔

اور چلتے چلتے سامرا کی جامع مسجد بھی دیکھتے چلو ـــ سامرا عباسی خلیفہ معتصم باللہ نے ذیلی دارالخلافے کے طور پر آباد کیا تھا اور اُس میں ترک "مملوکوں" کو بسایا تھا جو بڑھتے بڑھتے بغدادیوں کے لیے عذابِ جان بن گئے تھے اور جنھوں نے بعد میں عباسیوں کی حکومت پر وہ اثر و اقتدار قائم کیا کہ خلافت اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو کر رہ گئی۔ سامرا باغوں کا شہر کہلاتا تھا اور اس میں یہ جامع مسجد متوکل نے بنائی تھی۔ اس کا مینار بابلی طرزِ تعمیر کی یاد دلاتا ہے۔ اگر کسی کو بغداد سے ستّر میل دُور جانے کی ہمت ہو تو سامرا پہنچ کر عباسیوں کی شوکت و عظمت اور زوال کا ایک اور نظارہ کر سکتا ہے۔

اور موصل تک پہنچ جانے والے نینوا کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ نینوا جو مدتوں بابل کا حریف رہا اور جس نے آشوریوں کے آخری جاہ و جلال کا زمانہ دیکھا۔ یہاں بھی اسی عشتار دیوی کی پرستش ہوتی تھی جس کے نام کا ایک دروازہ ہم بابل میں دیکھ آئے ہیں۔ سُنا ہے کہ نینوا کے عظیم ترین آثار برٹش میوزیم کی زینت ہیں۔ ہمارا کوہِ نور ہمارے مخطوطات بھی تو ابھی تک برٹش عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ نینوا کا شہر ایک ہزار قبل مسیح مکمل ہو چکا تھا۔ جب برٹش میوزیم کی جگہ شاید دریائے ٹیمز بہتا ہو گا یا سمندر ہو گا یا ویرانوں میں جنگلی جانور گھومتے ہوں گے۔

یہ آشوریوں کا بنایا ہوا ایک نقش دیوار دیکھو جو ایک شہر پناہ پر حملے کی کہانی بیان کرتا ہے۔

اور یہ شاہ سارگون دوئم۔ شاہ آشور کے محلات کے مرقعے ـــــ جو آٹھ سو برس قبل مسیح کے فنِ تعمیر کے نمونے ہیں محلوں کے دروازوں پر انسان نما سانڈوں کے بُت کھڑے رہتے تھے جن کے سڈول بدن معماروں کی حسنِ تناسب کی گواہی دیتے ہیں۔ ان مجسموں کے پر بھی تھے۔ اس وقت آشوری یونانی

۰،۷ اور دی۔سی نمبر آٹھ اور اسپوتنک اور واستوک اور وین گارڈ نہیں اڑا سکتے تھے۔ مگران کے عزائم ان کے خیال ان کے تصورات کا خزانہ آج کی امریکی اور روسی تجربہ گاہوں سے کم نہ تھا۔

اور اسی عراق دنیا کا قدیم ترین پُل بنایا گیا تھا جس کے آثار آج بھی موجود ہیں ۱۹۳۲ء میں ڈنمارک کے ایک محقق ڈاکٹر جیکبن نے جو خورسں آباد کے آثار قدیمہ پر کام کر رہے تھے، ایک دن گاؤں کے مکھیا کی نشست دیکھی، جو پتھر کی تھی اور اس پر ایک انجانی تحریر دیکھ کر ٹھٹک گئے اور پھر وہ اتنا پڑھ سکے "پل" اور ایک دن پوری عبارت مل گئی، جو شاہ آشور نے کندہ کرائی تھی۔

"میں نے نینوا کے لیے ایک نہر بنوائی گہرے نالوں پر میں نے سفید پتھروں کا ایک پُل بنوایا۔ میں نے یہاں سے پانی گزارا"

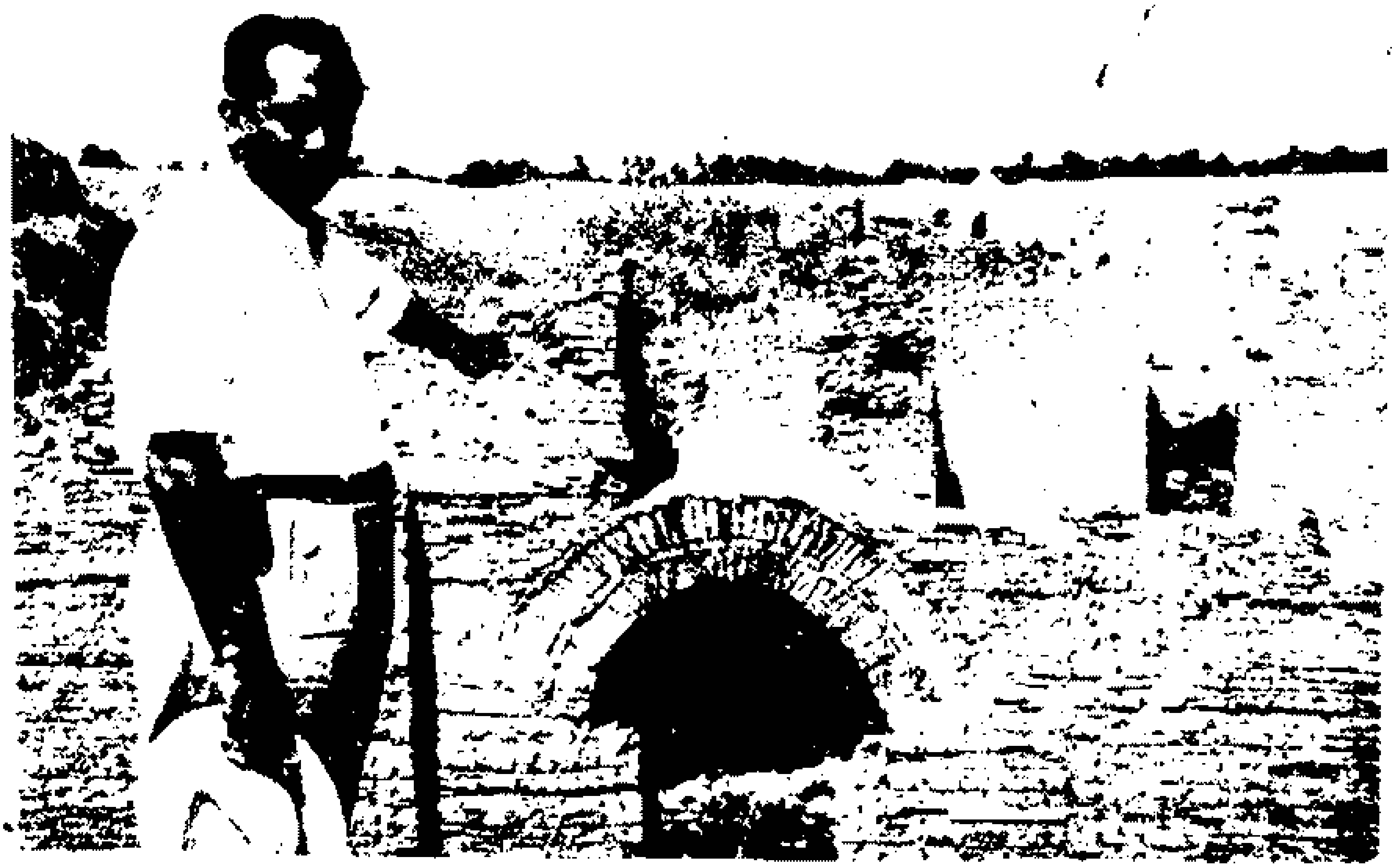
اور یہ اسی خورس آباد کے علاقے میں پہاڑیوں پر کندہ دیوتاؤں کے مجسمے ہیں جن کی گودوں میں نئے زمانے کے انسان رسیاں ڈال ڈال کر اترتے ہیں اور ان کی ناکوں اور کانوں، ہاتھ پیروں کی پیمائش کرتے ہیں۔ اور دیوتا چپ رہتے ہیں۔

اور یہ بصرے جانے والے راستے پر شیراتہ کے آثار ہیں جہاں لوگ سرکنڈوں کے گھر بنا کر رہتے تھے۔ کیونکہ وہاں سامان تعمیر دستیاب نہ ہوتا تھا لیکن بادشاہوں کے دبدبے نے وہاں بھی پتھروں اور شہتیروں کو پہاڑوں اور جنگلات کے سینے چیر کر جمع کر لیا تھا اور ایک عظیم الشان مندر تعمیر کیا تھا جس کے تین طرف سوسو سیڑھیاں تھیں۔ پھر وہ مندر مٹ گیا۔ وہ نسلیں فنا ہو گئیں اور آج انگریز اور فرانسیسی اور امریکی محققین ان کے آثار اور تحریروں کی بنا پر ان کی تصویریں بناتے ہیں اور میں اپنے پاکستانی پڑھنے والوں کو ان کا تماشا دکھاتا ہوں۔

لیکن —— اب تاریخ کے تماشوں سے طبیعت گھبراتی ہے۔ ان سے ہمت انسانی کا پتا ضرور چلتا ہے۔ مگر عبرت کے تھپیڑے، خیرہ ہوتی ہوئی آنکھوں کو خوش نہیں ہونے دیتے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اپنے ائمہ کے مزارات پر حاضری دی جائے اور ان کی گفتار اور ان کے کردار کو یاد کیا جائے۔

یہ اعظمیہ ہے۔ امام اعظم غوث پاک کا مزار جس کی نسبت سے پورا علاقہ اعظمیہ کہلاتا ہے۔ یہاں اگر مجھ جیسے گنہگار کو بھی سرور آتا ہے۔ ولیوں کے ولی، عالموں کے عالم جن کا فیض کفرستان ہند تک اس طرح پہنچا کہ آج بھی سیکڑوں خانوادے اور کروڑوں اہلِ دل اُن ہی کے رُوحانی شاگردوں کے خوشہ چیں ہیں۔

اور یہ امام ابو حنیفہ کا مزار ہے۔ ایک کشادہ اور شاندار خانقاہ۔ یہاں وہ شخصیت دفن ہے جس نے منصور عباسی کی پیش کردہ ججی ٹھکرا دی تھی۔ وہ اُوورسیر بن کر بغداد کی تعمیر میں کام آنے والی اینٹوں کی گنتی کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ، حنفی فقہ کے بانی۔ اسلامی تصور انصاف کا وہ شارح جس کے پیروؤں کی جماعتیں یورپ اور افریقہ سے انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔



عظیم بابل کے معلق باغات اور مصنف

لبنان

خلیل جبران کے دیس میں

اب عراق کا قدیم و جدید دور ختم ہوتا ہے ــــــــــ میر صاحب حجاز جا رہے ہیں کیونکہ وہ پنیتالیس پونڈ کی اجازت لے آئے تھے اور اپنا ٹکٹ بدلوالیا تھا۔ شریف صاحب واپس۔ اور صحافی ــــ وہ ہم سے اپنی منزل چھپا رہا ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

ہم کاظمین بل جل کر نہ جا سکے۔ ہاں ہمیں معلوم ہوا کہ میر خلیل الرحمٰن ٹیکسی لے کر اُدھر بھی ہو آئے۔ میں اور پروفیسر شریف علمائے عراق سے ملنے میں مصروف رہے اور صحافی للین کی جاسوسی کرتا رہا اور جب ہم نے کاظمین کا پروگرام بنایا تو ہوائی جہاز والوں نے صرف ایک گھنٹے میں سوار ہو جانے کا نوٹس دیا ورنہ ہمیں ایک ہفتے اور ٹھہرنا پڑتا۔ علمائے عراق میں علامہ شبیبی پاکستان کے عاشق ہیں، وہ اس ملک کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کی ایک اہم منزل سمجھتے ہیں۔ کیا ہم بھی سمجھتے ہیں۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کیا ہے۔

اور جب عراقی طیارہ مجھے لے کر وادیٔ دجلہ و فرات پر اُڑا، تو میں نے حمورابی اور بخت نصر اور ہارون الرشید اور جنرل عبدالکریم قاسم کو الوداع کہا اور امام حسینؓ امام ابو حنیفہ اور غوث پاک کو سلام عقیدت پیش کیا۔ اب وہ سرزمین مجھ سے چھوٹتی ہے جہاں مجھے کتابوں کی روشنی نے دیوانوں میں عجیب عجیب مناظر کی سیر کرائی اور جہاں میں نے بیسویں صدی کی ڈکٹیٹر شپ کا ایک ناقابل فراموش منظر دیکھا۔ ایسا منظر جس کے ایماندارانہ اور تفصیلی بیان پر بہت سے لوگ یقین نہیں کریں گے اور جسے دیکھ کر میں پاکستانی شہریت پر بے اندازہ فخر کرنے لگا ہوں اور اب میں لبنان کے ساحل پر اُتر رہا ہوں۔ جس کے ایک طرف بحرِ رُوم ہے۔ وہ سمندر جس کے پار یورپ ہے اور جہاں سے یونانی اور رومی فوجیں ایشیائی دولت لوٹنے آتی تھیں، نیلے پانیوں کا سمندر جس کی ہوا شرابی کہلاتی ہے اور اسی لبنان کے دوسری طرف وہ پہاڑیاں ہیں جہاں ولیوں اور پیغمبروں نے چِلّے

کھینچے تھے اور جن سے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے سوتے پھوٹے ہیں۔

مگر جب بیروت کے ہوائی اڈے پر جہاز چکر لگاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نیچے کوئی ایشیائی شہر آباد نہیں بلکہ کسی نے یوروپ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر بحر روم کے مشرقی کنارے پر لگا دیا ہے۔

جہاز سے بیروت کا ہوائی اڈا اور اس کے آس پاس کا منظر خوابوں کی سرزمین معلوم ہوتا ہے۔ نیلے نیلے بحر روم میں ایک سفید پٹری دور تک چلی گئی ہے۔ یہ اس کا رن وے ہے۔ سمندر کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں تو دائیں ہاتھ کو ہوائی اڈا اور بائیں ہاتھ کو چند سو گز کے فاصلے پر ایک دم ڈھلواں پہاڑیاں ہیں جن کے تختوں پر چھوٹے چھوٹے مکان اور پختہ سڑکیں اور ان کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں نظر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔

"موسیو کیا آپ میرا تھوڑا سا سامان سنبھال لیں گے؟" میرے سامنے والی نشست پر سے ایک خاتون نے گویا دفعتاً مڑ کر کہا۔

میں اپنی قطار میں اکیلا تھا مگر ان سفید فام خاتون کے ساتھ ایک سفید فام مرد بھی بیٹھا ہوا تھا جس نے راستے میں ایر ہوسٹس کے منع کرنے کے باوجود سگار پیے تھے حالانکہ جہاز میں اجازت کے بغیر پائپ اور سگار پینا ممنوع ہے۔

میں حیران تھا کہ ان خاتون نے اس شخص سے بات کرنے کی بجائے مجھی سے کیوں خطاب کیا جب کہ وہ گورا تھا اور میں انگریزی محاورے میں کالا آدمی تھا ـــ میں نے سوچا شاید وہ ان کا شوہر ہے اور ان کی لڑائی ہو گئی ہے اور اب ان خاتون نے طلاق لینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں نے اس جھگڑے میں ایک سنسنی خیز لطف محسوس کیا اور طے کر لیا کہ میں ایشیائی روایات کے مطابق سینہ تان کر ان کی مدد کروں گا۔ میرے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔

مگر! وہ تھوڑا سا سامان بہت نکلا۔ دو باسکٹ۔ اوورکوٹ۔ ٹوپیوں کے دو نازک مگر بڑے بڑے ڈبے۔ دو گلدستے اور ایک بھاری سی چرمی تھیلی۔ میں نے قلیوں کی طرح یہ چیزیں کندھوں پر لٹکائیں کچھ ہاتھوں میں لیں۔ اوورکوٹ مجھے بغل میں دبانا پڑا جو بار بار پھسلتا تھا۔ خود ان سفید فام خاتون نے ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک پتلی سی تھیلی سنبھالی جس میں عراقی کھجوروں کے پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ گرمی اور بوجھ سے میرا حال خراب ہونے لگا۔ جہاز سے کسٹم کاؤنٹر پہنچتے پہنچتے میرے ایشیائی بازوؤں کی مچھلیاں بیزاری اور تھکن اور چڑچڑے پن کے سمندر میں غوطہ مار گئیں۔ اس مختصر رستے

ہیں وہ میری طرف دیکھ کر انداز تشکر سے دو تین بار مسکرائیں اور میں مزید نیاز مندی سے مسکرایا لا کہ وہ مجھے اپنے رنگ روغن اور سنگار کے باوجود ایک گھنٹی لگ رہی تھیں۔

ہوائی اڈے کے اندر بھدی بھدی کرسیوں والی نشست گاہ میں ہم نے چند لمحے دم لیا۔ سامنے کتابوں کی دکان تھی جس پر صدر ناصر کی کتاب اور ان کے بے شمار تصویری کارڈ ٹنگے ہوئے تھے۔ ہمیں ہوائی کمپنی کی طرف سے مفت ایک ٹھنڈے شربت کا گلاس دیا گیا۔

"آپ کے ساتھی کہاں ہیں"، میں نے ہمت کر کے مادام سے پوچھا۔ "مجھے نہیں معلوم" انھوں نے فوراً جواب دیا۔ وہ فرنچ تھیں اور ان کی انگریزی فرنچ لہجے میں بڑی پیاری لگی" وہ شخص انگریز تھا اور بدتمیز تھا۔ اس نے رستے بھر سگار پیے اور معافی نہ مانگی اور میرے ایک گلدستے پر پاؤں رکھے بیٹھا رہا۔"

بیروت میں کسٹم واجبی سا ہوتا ہے جن کے پاس ویزا نہ ہو اور وہ صرف سیاح ہوں انھیں پندرہ دن کا ٹورسٹ ویزا ابھی ہوائی اڈے پر ہی مل جاتا ہے۔ کرنسی یہاں یوں بھی آزاد ہے یعنی کسی ملک کی کتنی ہی کرنسی لے آیئے یا لے جایئے۔ بات یہ ہے کہ یہ اصل میں ایک ٹورسٹ شہر ہے یعنی شہر سیاحت جہاں لوگ اپنے ساتھ سرخ دینار اور پونڈ اور ڈالر لاتے ہیں۔ کسٹم پر ڈیوٹی لینے کی بجائے اُن سے اصلی ڈیوٹی قحبہ خانوں اور نائٹ کلبوں اور دکانوں میں وصول کر لی جاتی ہے۔

"ہائے حسن لبنان"۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر کھڑا فرانسیسی خاتون کا انتظار کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کیا ناول تھا وہ صادق صدیقی سردھنوی کا یا مولانا شرر کا جس میں ایک مسلمان سپہ سالار پر لبنانی دوشیزائیں اس طرح گرنے لگی تھیں کہ وہ تقویے کا مارا منہ پر نقاب ڈال کر باہر نکلتا تھا۔

سب لبنانی عرب النسل نہیں ہیں۔ عربوں کا رنگ تانبے کی طرح سرخی مائل ہوتا ہے مگر لبنانی گلابی نظر آئے۔ بالکل تازہ اور بڑے بڑے گلاب کے پھول۔ ان کے نقشے بھی ستھرے اور نازک ہیں اور اطوار مغربی تکلف سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ بولتے سب عربی ہیں اور بیشتر خود کو عرب کہتے بھی ہیں مگر آبادی کا ایک معقول حصہ مخلوط نسل کا ہے۔ قدیم زمانے کی فنیقی نسل اور آرمینیوں اور یونانیوں اور کسی حد تک ترکوں کا ایک امتزاج ہے جس نے بحرِ روم کی معتدل اور صحتمند آب و ہوا سے مل کر مشرق کی شاید سب سے خوبصورت قوم پیدا کی ہے۔ میں نے سوچا کنعان ضرور یہی علاقہ ہوگا یا اس کے آس پاس کا علاقہ ہوگا جہاں حضرت یوسف علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔۔۔ محققین معاف

فرمائیں۔

فرنچ خاتون پہلی بار لبنان آئی ہیں مگر چونکہ لبنانی فرانسیسی انتداب میں رہنے کی وجہ سے فرنچ ایسے ہی بولتے ہیں جیسے ہم انگریزی بولتے ہیں' اس لیے انھیں اپنے معاملات طے کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی بلکہ الٹی وہ میری رہنمائی کر رہی ہیں کسٹم کاؤنٹر کے اوپر والے ہال میں ایک بینک ہے جو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی کرنسی سیکنڈوں میں تبدیل کر دی جاتی ہے بینک کلرک نے میرے چہرے پر نظر ڈالے بغیر میرے سفری چیک آٹھ پوائنٹ اسی لبنانی کرنسی میں تبدیل کر دیے۔ اس کے پاس ایک حسابی مشین تھی جو لمحے بھر میں کرنسیوں کے تازہ ترین نرخ کے حساب سے مطلوبہ رقم بتا دیتی تھی۔

مادام دنیا بھر کا سفر کرتی ہوئی مشرق بعید سے کراچی' تہران' بغداد کے راستے بیروت آئی ہیں اور چند روز میں جنوبی یورپ اور وہاں سے پیرس جائیں گی جہاں ان کے شوہر جواہر کی دکان کرتے ہیں۔

"زرگر کی بیوی"۔ میں الف لیلہ کی زبان میں سوچتا ہوں اور بچوں کی طرح ان سے کراچی کے بارے میں پوچھتا ہوں۔

"آپ کا کلفٹن بہت خوبصورت جگہ ہے مگر ذرا گندہ ہے۔"

"نہیں میں نے منورا نہیں دیکھا۔" فرانسیسی "ڑ" نہیں بول سکتے۔

"ہاں میں ایک شام ٹھٹے گئی تھی۔ عمارتیں خوب ہیں۔" ٹھٹے کو وہ تتا کہتی ہیں۔

"میں وکٹوریا میں بیٹھ کر دیر تک گھومی' اور بہت مزا آیا۔"

"کراچی ایشیا کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ ہانگ کانگ کے بعد کراچی ہی اچھا لگتا ہے۔ کلکتہ اور بمبئی بہت گنجان ہیں۔"

آؤ ڈیر مادام اب تم اپنا سارا سامان سارے بکس سارے گلدستے اور تھیلے اور کھجوریں میرے شانوں اور میرے سر پر لاد دو۔ شکر ہے کہ تم ہماری جھگیوں تک نہیں گئیں۔ پتا نہیں تم منہ دیکھے کی بات کرتی ہو یا سچ کہہ رہی ہو۔ بہرحال تم کراچی کا ذکر کر رہی ہو جو یہاں سے کئی ہزار میل دور ہے اور جو مجھے بہت یاد آتا ہے۔ وطن کی کیا بات ہے۔

یاد یار مہرباں آید ہمی

"السید جمیل الدین عالی۔" ہوائی کمپنی کی ایک خاتون نے آواز لگائی۔

"نعم" میں نے چیخ کر جواب دیا۔ "نعم" یعنی 'جی ہاں' نہ جانے مجھے کیا کہنا چاہیے تھا۔ مگر عراق میں اتنے دن رہ کر بھی عربی نہ بول سکو تو سیاحت سے فائدہ ہی کیا۔

"۔۔۔۔۔۔۔" اب انھوں نے عربی میں ایک لمبا سا فقرہ بولا جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ میں نے کھٹ سے جیبی ڈائری نکالی اور اعترافِ اہلیت کر لیا۔

"لا عارف العربی (میں عربی نہیں جانتا)"

"بٹ اِٹ اِز آل رائٹ" وہ بولیں "اس رفتار سے آپ بہت جلد عربی سیکھ لیں گے۔" وہ عربی تلفظ میں نہایت فصیح انگریزی بولنے لگیں۔ وہ بیروت اترنے والے مسافروں کو کمپنی کی گاڑی میں لے جانے کے لیے جمع کر رہی تھیں۔

شہری ٹرمینل کراچی میں اب تک نہیں ہے مگر دنیا کے ہر بڑے ہوائی اڈے سے عام طور پر سب بسیں اور ٹیکسیاں مسافروں کو شہر میں ایک ٹرمینل پر لے جاتی ہیں۔ ٹرمینل یعنی منزل جہاں سب ہوائی کمپنیوں کے دفتر ہوتے ہیں اور محکمہ سیاحت کا دفتر بھی ہوتا ہے۔ اور وہاں سے مسافروں کو قیام و طعام اور سیر و تفریح کے متعلق بے شمار معلومات مہیا کر دی جاتی ہیں۔ اپنے یہاں صرف ہوٹل میٹروپول ہے۔

ٹرمینل پر پہنچ کر فرینچ خاتون نے اپنے لیے فندق الجارج یعنی سان جارج ہوٹل کا انتخاب کیا۔ سان جارج یا سینٹ جارج ہوٹل کا کرایہ پندرہ ڈالر فی شب بغیر طعام تھا یعنی صرف پچھتر روپے یومیہ خشک۔ سان جارج سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کا اپنا ایک ساحلی "ٹکڑا ہے" جہاں نہانے اور کشتی رانی کا انتظام ہے۔ کمرے ٹھنڈے ہیں اور کھانے لذیذ۔ بڑے بڑے شیوخ اور شہزادے اور غیر ملکی عمائدین قیام کرتے ہیں۔

اب میرے آسمانی سلک کے سوٹ اور رکھ رکھاؤ کا پردہ چاک ہونے والا ہے۔ فرینچ خاتون کی نظریں منتظر ہیں کہ میں کس ہوٹل کا انتخاب کرتا ہوں۔ مگر میں پاس کھڑے ہوئے ایک غیر متعلق آدمی سے غیر متعلق باتیں کرنے لگتا ہوں۔ ان خاتون کا شاندار بھاری بٹوا میری ہلکی پھلکی جیب کا منھ چڑا رہا ہے۔

"بوں سُوآ مادام (خدا حافظ)" میں انھیں منتظر دیکھ کر خود بڑے اخلاق سے کہتا ہوں اور مسکراتا ہوں۔ "آہ مادام مجھے آپ کا ساتھ چھوڑنے پر بہت افسوس ہے مگر میں ایک فرینچ جوہری کی بیوی نہیں ہوں بلکہ ایک ملازمت پیشہ ایشیائی ہوں جسے ابھی ترکی اور مصر بھی جانا ہے اور جس کی بیوی نے اُسے ایک بائیس انچ لمبی فہرست دے رکھی ہے جس میں پانچ بچوں کے موزوں اور قمیصوں تک کے سائز ہیں

ہوئے ہیں۔ اور لبنان یا ترکی یا مصر میں کوئی جنرل عبدالکریم قاسم نہیں جو مجھے مفت ایک ایرکنڈیشنڈ کمرہ اور موٹر اور ہرین وقت کا لذیذ کھانا عنایت فرمائے۔ مادام کاش تم جنرل قاسم ہوتیں۔

میں مادام سے یہ سب کچھ کہہ نہ سکا مگر شاید وہ سمجھ گئیں اور برا مان گئیں۔ بہر حال انھوں نے میرے فوری اضطرار اور خدا حافظ کہنے کا برا مانا۔

"بد تہذیب ایشیائی" انھوں نے زیر لب ضرور کہا ہوگا۔

"آپ کہاں ٹھیر رہے ہیں" انھوں نے چلتے چلتے پوچھا۔ اور میں ان کا "چھوٹا موٹا" سامان اٹھا کر ٹیکسی کی طرف چلنے لگا۔

"سفیر پاکستان کے گھر" میں نے پھرتی سے جواب دیا۔" اصل میں وہ بے چارے میرے ادب کے بڑے مداح ہیں۔" میں نے سوچا کہ چلتے چلاتے یہ کم از کم اتنا جان لیں کہ میں ایک ادیب شہیر ہوں۔

"اچھا" وہ مسکرائیں " شاید وہ ہوائی اڈے پر بر وقت نہ پہنچ سکے "

"ہاں وہ بے چارے چند روز سے بیمار ہیں" میں نے لاپروائی برتی" پرسوں مجھے بغداد میں ان کا تار مل گیا تھا کہ وہ خود نہ آسکیں گے۔ اب میں ان کا گھر تلاش کرنے والا ہوں۔ میرا خیال ہے ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتا دینا کافی ہوگا۔"

مگر وہ ہوائی کمپنی کی خاتون کچھ بھولی اور بد تمیز نکلیں۔ وہ بیچ میں بول پڑیں۔

"اوہ موسیو۔ آپ کے سفیر تو ہفتہ بھر پہلے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ وہ ہمارے ہی جہاز سے آتے جاتے ہیں۔ وہ ایک بہت شریف اور خوش اخلاق سفیر ہیں۔"

میرا دل دہل گیا۔ فرنچ خاتون بغیر کچھ بولے ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ اور ان کے جاتے ہی میں ایک شرکت کی ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک ایسے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا جس کا نام بتانا کبھی بھی مناسب نہ سمجھونگا۔

اس چوک کا نام سحتہ البرج ہے۔ ایک وسیع چوک چوڑی چوڑی سڑکیں اور اونچی اونچی عمارتیں۔ ٹراموں اور بسوں کا شور اور اواخر جولائی کی سڑی ہوئی گرمی اور سمندری رطوبت حبس کے مارے میں کمرے سے باہر آیا اور ہوٹل کے دروازے کے آگے کھڑا ہو گیا۔ میں بیروت میں کسی کو نہیں جانتا تھا نہ میرے پاس کوئی پتا تھا۔ نہ تعارفی خطوط۔ سفارت خانے والوں سے رابطہ پیدا کرنے میں توہین ہو جانے کا خطرہ تھا۔

"ہلو مسٹر! ہاؤ آر یو۔" ایک دبلے پتلے عرب نوجوان نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیا۔

"باؤ آر یو" میں نے ٹھوکا مارے بغیر جواب دیا

"میں فلسطینی ہوں۔ فلسطین کا مہاجر ہوں۔ میں گائیڈ بھی ہوں اور سکریٹری کا کام بھی کر سکتا ہوں۔ اور شاپنگ تو بہت عمدہ کرا سکتا ہوں، بیروت میں دنیا بھر کے ملکوں کا مال ملتا ہے اور سستا ملتا ہے کیونکہ یہ فری پورٹ ہے۔ اور میں تمہاری کرنسی اچھے بھاؤ پر تبدیل کرا سکتا ہوں ورنہ تمہیں لوٹ لیا جائے گا، سمجھے مسٹر۔ مجھے کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے کیا تم ہندی ہو، یعنی ہند یعنی ہندوستانی"

"میں پاکستانی ہوں"

"آہ پاکستانی۔ مائی فرینڈ۔ کیا تم مسلمان بھی ہو"

"ہاں"

"آہ میرے پیارے مسلمان بھائی مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ ابراہیم۔ ابراہیم فلسطینی۔"

"اہلاً وسہلاً"

"اہلاً وسہلاً"

"بس تو مائی فرینڈ۔ اب تم مجھ سے کھل کر بات کر سکتے ہو۔ یعنی میں تم سے کھل کر بات کر سکتا ہوں"۔ وہ ڈ نہیں بول سکتا۔ عرب ڈ اور ڑ اور گ اور چ وغیرہ کی آواز ادا نہیں کر سکتے۔ "آؤ میں تمہیں بیروت دکھاؤں۔ میں پاکستان کا دوست ہوں اور کشمیر کا نام جانتا ہوں اور کراچی کا نام بھی جانتا ہوں کراچی ایک شہر ہے جو پورے ملک لبنان سے بھی زیادہ آبادی والا ہے اور کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ کے پاس اسی طرح پڑا ہے جیسے فلسطینی مہاجروں کا مسئلہ۔ دیکھو میں تمہارے بارے میں کتنا جانتا ہوں"

"اس شام کے کتنے پیسے ہوں گے"

"اوہ اس طرح بات مت کرو مائی فرینڈ۔ یا اخی۔ میں تم سے کچھ نہیں لوں گا۔ اور سارا شہر دکھا دوں گا۔ سارا شہر اور سب کچھ بیوتی فل چیزیں بھی سمجھ گئے سب بیوتی فل چیزیں اور ساحلی ریستوراں اور کوہستانی شاہراہیں۔ مائی فرینڈ۔ ہم دونوں مسلمان ہیں۔ تم نے شیخ حسن البنا کا نام سنا ہے جو اخوان المسلمین کے سردار تھے میں انھیں بہت مانتا ہوں۔ میں تمام عالم اسلام کو متحد دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے جو دو گے میں لے لوں گا۔ بیس لیرے اور کھانا یا پندرہ لیرے اور کھانا یا کچھ مت دو۔ میں تم سے پھر لے لوں گا۔ اگر میں بیکار نہ ہوتا تو تمہاری میزبانی کرتا مگر آہ فلسطینی مہاجر ہوں اور ـــ

اور ــــ"

یہ بیروت ہے جو مشرق کا جینوا کہلاتا ہے۔ آئے دن کے عرب انقلابات صدروں، وزیروں اور شہزادوں کو ان ساحلوں پر پھینک دیتے ہیں اور ان کی جمع شدہ خفیہ اور بظاہر رقمیں یہاں کے کاروبار میں لگتی رہتی ہیں۔ بیروت، دنیائے عرب کے سیاسی داؤ پیچ کا مرکز جہاں ہر دوسرا آدمی کسی نہ کسی کا جاسوس ہو سکتا ہے یعنی جو دونوں طرف سے پیسے کھاتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ معزز ہستی جو اندرونِ شہر کے ایک سستے ریستوران میں ایک مشترکہ میز پہ چیخ چیخ کر بیرے کو نان کباب کا آرڈر دے رہی ہے۔ کچھ روز پہلے کسی عرب ملک کی وزارت یا وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھال چکی ہو اور یہ بظاہر خوش باش نوجوان امریکی یا برطانوی یا فرانسیسی یا روسی ٹورسٹ کسی حکومت کا تختہ اُلٹ کر یا اُلٹوا کے آیا ہو کیونکہ بیروت سے کرنسی آسانی کے ساتھ آتی جاتی رہتی ہے اور خود لبنان سوئٹزرلینڈ کی طرح غیر جانبدار مطمئن فارغ البال، محنتی اور چھوٹا سا ملک ہے۔ اس کا رقبہ چار ہزار پندرہ مربع میل اور آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے عیسائی تقریباً ترپن فیصد ہیں۔ یعنی عددی اکثریت میں ہیں اور مسلمان تقریباً سینتالیس فی صد ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا لباس بالکل مغربی ہے۔ عمامہ یا نقاب یا جُبّہ دور دور نظر نہیں آتا۔ اتنے چھوٹے سے ملک میں دو ہزار پرائمری مدرسے ہیں اور ڈھائی سو سے زیادہ ہائی اسکول ہیں اور تیس سے زیادہ پیشہ ورانہ تعلیم گاہیں ہیں اور دس گیارہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہیں جن میں سب سے بڑا ادارہ ہے، امریکی یونیورسٹی آف بیروت جو اٹھارہ سو چھیاسٹھ عیسوی میں قائم ہوئی تھی۔ ایک فرنچ یونیورسٹی بھی ہے۔ سینٹ جوزف فرنچ یونیورسٹی قائم شدہ ۱۸۸۱ء اور اکادمی لبنان قائم شدہ ۱۹۳۷ء اور لبنان یونیورسٹی قائم شدہ ۱۹۵۱ء مگر ـــ

"وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی"

ہم تو صرف امریکن یونیورسٹی آف بیروت کو جانتے اور مانتے ہیں کیونکہ وہاں کے لیے فری شپ بہت ملتا ہے اور فری شپ کے ساتھ ساتھ فری آمد و رفت بھی۔ بھئی واہ فری ورلڈ۔ یعنی آزاد دنیا۔ اس کی کیا بات ہے۔ اسی یونیورسٹی میں جانے کی خاطر پاکستانی لڑکے لڑکیاں جو بیشتر پاکستانی ارباب اختیار کی آل اولاد ہوتے ہیں، امریکی ارباب اختیار کی کاسہ لیسی کرتے ہیں اور واپس آکے دیسی عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں پر دھونس جماتے ہیں اس میں شک نہیں کہ امریکن یونیورسٹی آف بیروت ایک شاندار اور عمدہ درسگاہ ہے۔ زراعت اس کا خاص مضمون ہے جو ہمارے لیے مفید

بھی ہے اور زراعت کے ساتھ ساتھ امریکیت بھی پڑھائی جاتی ہے جو باقاعدہ مضمون نہیں مگر ہر مضمون میں سموئی ہوئی ہے۔

آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے۔

لبنانی حکومت صدارتی اور پارلیمانی نظام کا امتزاج ہے صدر ریاست براہ راست منتخب نہیں ہوتے۔ بلکہ پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت سے منتخب ہوتے ہیں اور پھر وزیروں کی کابینہ نامزد کرتے ہیں اور ایک وزیر اعظم بھی۔ پارلیمنٹ کے رکن سّتر یا شاید اسّی ہوتے ہیں۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ بازار بند ہیں اور پورے شہر پر وحشت چھائی ہوئی ہے۔ لوگ سخت غمزدہ نظر آتے ہیں اور ایک کثیر مجمع ایک چھوٹے سے خوبصورت محل کی طرف چلا جاتا ہے۔

"صدر شہاب نے استعفا دے دیا ہے" اخبار چلائے۔ صدر شہاب عیسائی ہیں اور وزیر اعظم مسلمان اور کئی وزیر بھی مسلمان مگر صدر شہاب کے استعفے پر پارلیمنٹ کے اراکین میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور کئی اراکین ایوانِ صدر کے آگے کھڑے رو رہے ہیں۔ اندر کسی کو باریابی کی اجازت نہیں۔ صدر صاحب نے ملنا جلنا بند کر دیا ہے اور سامان بندھوا رہے ہیں۔

وہ دن ایک سیاسی ہیجان میں گزر گیا۔ اور دوسرے دن صدر نے اپنی شرائط منوا کر استعفا واپس لیا تو شہر پر گویا چراغاں کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اس دن مجھے جنرل کریم قاسم بہت یاد آئے۔ کاش عراق کسی قسم کا جمہوری ملک بن سکتا۔

یہ خلیل جبران کا لبنان ہے جس کے ترجمے اردو میں عام ہیں اور یہ قدیم فینیقیوں اور رومیوں اور ترکوں کا لبنان ہے جنھوں نے مدتوں اس پر حکومت کی، اور فرانسیسوں کا بھی جنھوں نے ترکی خلافت ختم ہو جانے کے بعد اسے زیر انتداب رکھا یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء میں لبنان مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔ موجودہ لبنان کی سیاسی سرحدیں مغربی سیاست کی بنائی ہوئی ہیں ورنہ یہ علاقہ اصل میں جزیرہ نمائے عرب کی شمالی مشرقی پٹی کا ایک حصہ ہے۔ جو شام سے شروع ہوتی تھی اور جس میں فلسطین اور اردن شامل تھے۔ اب اس میں بیروت کے علاوہ دوسرا قابل ذکر شہر طرابلس ہے۔ ہائے جنگ طرابلس والا طرابلس، جس کی ایک اپنی تاریخ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ لبنان نام کی دو آبادیاں امریکہ میں بھی موجود ہیں ایک ریاست کنے ٹی کٹ میں اور دوسری ریاست پین سل وے نیا میں۔

لبنان میں عیسائیوں کے تیرہ اور مسلمانوں کے تین فرقے ہونے کے باوجود مذہبی مناقشات

کا وجود سیاسی سطح پر ظاہر نہیں ہوتا۔ سنی تقریباً تین لاکھ اور شیعہ تقریباً ڈھائی لاکھ ہیں اور طبقہ دروز بھی پون لاکھ کے قریب ہے۔ مگر کسی جھگڑے فساد کا نام نشان نہیں۔ بلکہ عیسائی اور مسلمان کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ یہ لوگ کام اور اپنے ملک کی خوشحالی کو فی سبیل اللہ فساد پر زیادہ مقدم سمجھتے ہیں۔ ہائے کیسے نادان اور بوگس لوگ ہیں کہ نہ جمعے کے خطبوں پر دنگا فساد ہوتا ہے نہ محرم میں۔ بس کام کیے جاتے ہیں اور پختہ سڑکیں اور عمارتیں، مدرسے اور صنعتی ادارے قائم کیے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنی بندرگاہ آزاد کر رکھی ہے اور اپنی کرنسی کو مضبوط بنا رکھا ہے اور دور دراز کے ممالک یہاں تک کہ جنوبی امریکہ میں بھی اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی ہیں۔ کئی لاکھ لبنانی لبنان سے باہر بڑے کاروبار میں مشغول ہیں۔

"کبھی کبھی میرے کانوں میں کسی پاکستانی ملا کی طنز آمیز ہنسی کی آواز آتی ہے۔ اس کے لیے فرقہ بندی کے بغیر مذہب بیکار ہے۔ زندگی بے کار ہے۔

ٹیکسیاں شرکت میں خوب چلتی ہیں۔ کرائے عام طور پر شہر کے مقامات کی نسبت سے مقرر ہوتے ہیں۔ راس بیروت کے ایک کنارے سے ساحۃ البرج تک جو شہر کے وسط میں ہے ایک لیرا کرایہ ہے۔ چار آدمی بیٹھ جائیں تو پچیس پیاسترنی کس۔ چار نہ بھی بیٹھیں اور ایک ہی بیٹھا رہے اور مقررہ راستے پر چلے اور دوسروں کو بیٹھنے کی اجازت ہو تب بھی پچیس پیاسترنی کس یعنی چوتھائی لیرا ـــــ بھئی ایک پونڈ کے تقریباً نو لیرے اور ایک پونڈ کے تقریباً چودہ روپے ہوتے ہیں اب میں کب تک حساب کیے جاؤں۔

"مسٹر تم اپنی کرنسی کسی یہودی کے ہاں مت بھنانا۔ فلسطینی کے ہاں بھنانا۔ وہ زیادہ دے گا اور بحث نہیں کرے گا۔" ابراہیم فلسطینی ایک سخت جوشیلا قوم پرست ہے اور مہاجر ہے جس کے پاس کوئی کلیم بھی نہیں ہے۔

فلسطین کے لاکھوں مہاجر مختلف عرب ملکوں میں آباد ہو گئے ہیں مگر لاکھوں غیر آباد ہیں اور صرف مہاجر ہیں۔ کہنے کو اقوام متحدہ کا ایک ادارہ برائے مہاجرین فلسطین قائم ہے جس کا صدر دفتر بیروت میں ہے مگر ان کی حالت ایسے خوشحال شہر میں بھی خراب ہے۔ ان میں سے کچھ ہم مہاجرین کے جھوٹے نوابوں اور سابقہ رئیسوں جیسے مہاجر بھی ہیں جنھوں نے ہجرت کو پیشہ بنا لیا ہے مگر بیشتر وہ ہیں جو فلسطین میں کھاتے پیتے اور محنت کرتے تھے اور جنھیں امریکی اور برطانوی حکومتوں کی قائم کی ہوئی اسرائیلی حکومت نے آن کی آن میں دربدر کر دیا۔ ان کا مسئلہ کشمیر کے مسئلے جتنا پرانا اور اتنا ہی تازہ ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ بڑی طاقتوں

کے دربار میں کس مسئلے کا حل کب اور کیسے طے ہوگا۔ جنگ ضروری معلوم ہوتی ہے مگر خدا جانے وہ جنگ لڑنے والے کب سامنے آئیں گے۔ پیشہ ور فوجیں نہیں اصل لڑنے والے۔

فلسطینی مہاجرین کی ہجرت کے واقعات تقسیم ہند والے فسادات جیسے ہی جاں گداز اور شرمناک ہیں۔ جب میں ایسی کوئی داستان سنتا ہوں تو روشن اور خوشحال اور حسین بیروت کی کھلی فضا میں میرا دم گھونٹ دیتی ہیں۔ یہ سمندر کے کنارے پھیلے ہوئے نائٹ کلبوں کی قطاریں مشہور زمانہ کیٹ کیٹ۔ لیڈو۔ حوا۔ کیوڈی راے۔ کموڈور ہوٹل کا کاستیاج اور بلیک ایلی فنیٹ کے ناچ رنگ شرابیں نشیلی فضائیں اور نیم برہنہ لبنانی اور اطالوی دوشیزائیں عرب و یہود کی کشمکش پر کب تک منقش پردے ڈالے رکھیں گی۔

"مسترتم مالتین ضرور جانا۔ میں ساتھ نہیں چل سکتا کیونکہ میرے پاس کوئی اچھا سوٹ نہیں ہے"

مالتین فردوس بر روئے زمین است کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ مصرع دلی کے لال قلعے کے دیوان خاص میں لکھا ہوا ہے اور بحر روم کے ایک ساحلی کنارے پر ایک نائٹ کلب کی شکل میں زندہ اور متحرک ہے۔ ایک طرف پانی اور روشنیوں کا آبشار ہے جس کے گرد رنگ برنگے فوارے چلتے ہیں اور اندر مغربی طرز کی قمار بازی کے لیے بیسیوں میزیں موجود ہیں جن کے گرد کھڑے ہوئے عرب شیوخ اور شہزادے اور ملکی امرا اور ان کی بیگمات اور داشتائیں اور یک شبی محبوبائیں ایک ایک داؤ پر حیرت اور جوش اور لذت کے قہقہے لگاتی ہیں اور لمحہ لمحہ لاکھوں ڈالر ادھر سے اُدھر ہوتے جاتے ہیں۔

میں نے جوئے خانے سے دور باہر بیٹھ کر ایک خالی میز سنبھالی اور قیمتوں کی فہرست دیکھ کر کوکاکولا کی ایک بوتل منگائی جس کی قیمت بیس لیرے تھی اور جس کا ٹپ دو لیرے تھا یعنی مجھے یہ ایک بوتل تیس روپے پاکستانی سے زیادہ کی پڑ رہی تھی۔ میں بہت آہستہ آہستہ کوکاکولا پینے لگا۔ اس کے ایک ایک گھونٹ میں کرنسی ختم ہونے کی تلخی تھی!

اب میری میز پر آپ ہی آپ ایک دوشیزۂ لبنان آئیں اور کسی توقف کے بغیر مجھے شستہ انگریزی میں ناچ کی دعوت دی اور اس سے پہلے کہ میں انکار یا اقرار کروں منتظر بیرے کو شیمپین کی ایک بوتل لانے کا حکم دیا۔

"ٹھیرو بھائی" میں نے بیرے کو روک لیا۔ شاید میں نے "پلیز ویٹ" کہا ہوگا جس کا آسان ترجمہ ٹھیرو بھائی ہے۔

جلدی سے میں نے پھر قیمتوں کی فہرست دیکھی شیمپین کی ایک بوتل کے ساتھ کچھ اور لازمہ بھی تھا۔ جو فرانسیسی میں تحریر تھا مگر اس ایک مد کی کل قیمت دو سو روپے پاکستانی بنتی تھی اور اس کے ساتھ دوشیزہ لبنان کے ساتھ ناچنے میں اس کے بدن کا قرب اور اس کی گرمی اور اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں کی مسکراہٹ اور چمپئی رنگ سے رنگے ہوئے پپوٹوں کے نیچے نیلی نیلی آنکھوں کی چمک فری پڑتی تھی یعنے مفت حالانکہ شیمپین کی قیمت بازار کے بھاؤ سے ساٹھ ستر روپے ہونی چاہیے اور اس مسکراہٹ اور ان آنکھوں میں چمکتے ہوئے شعلوں کی قیمت ایک پوری زندگی یا کئی زندگیاں یا لاکھوں زندگیاں۔ یا اس سے بھی زیادہ۔

نہ معلوم ہیلن آف ٹرائے نے کتنی جانوں کی قیمت وصول کی تھی اور وہ لڑائی کتنے برس چلی تھی۔

"ہی ہی ہی۔ مجھے یقین ہے مسٹر کہ تم مالمتین سے اکیلے واپس نہیں آؤ گے" ابراہیم مہاجر فلسطین نے چلتے وقت کہا تھا۔

"ہی ہی ہی" میں بھی دوشیزہ لبنان کی فرمائش پر کھسیا کر ہنسا "معاف کرنا مادام موزیل مجھے ناچ نہیں آتا اور میں شیمپین بھی نہیں پیتا۔ میں ایک معمولی ایشیائی ٹورسٹ ہوں"

"اوہ آئی ایم سوری" اس نے گھبرا کر بڑے میٹھے لہجے میں کہا "لیکن تم کو مالمتین نہیں آنا چاہیئے تھا۔ کیا تم کھانا کھاؤ گے"

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں"

"اچھا تو ایک کوکا کولا ہی منگا دو۔ میں بہت پیاسی ہوں موسیو"

نہیں مادام موزیل تم پیاسی نہ رہو۔ تم کو کاکولا پیو اور شیمپین بھی پیو۔ کیونکہ شیمپین جھوٹی اور نقلی ہوگی اور تمہیں دو سو روپے پر پچاس روپے یا پچیس روپے کے حساب سے کمیشن ملے گا اور تم اپنے جائز یا ناجائز بچے یا بہن بھائی کی فیس ادا کر سکو گی یا ماں باپ کا علاج کرا سکو گی اور اپنے کمرے کا کرایہ بھی دے سکو گی۔ ابھی اس غیر اسلامی نظام میں ہم سب کے لیے کام اور آرام کا انتظام نہیں ہے اور زندہ سب کو رہنا ہے اور اس لئے تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ مگر میں تمہیں شیمپین نہیں پلا سکتا وہ دیکھو سامنے وہ اصلی یوروپین ٹورسٹ چلے آتے ہیں جن کی مضطرب آنکھیں اور سرخ ہوتے ہوئے چہرے ان کی جیبوں کے بھاری ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

دوسری صبح ابراہیم اس بات پر بہت خوش ہوا کہ میں نے مالمتین جیسی جگہ پر صرف بائیس لیرے

خرچ کیے۔ اس نے مجھ سے گائیڈ فیس لینی بند کر دی۔ دن کو اِدھر اُدھر کام کرتا اور شام میرے ساتھ گزارتا۔ اس نے میرا ہوٹل بھی بدلوا دیا۔ اس البیروت کے بالکل آخری کنارے پر ہوٹل لارڈز میں ڈیڑھ پونڈ روز میں ایک ٹھنڈا کمرہ مل گیا جس کے بالکل سامنے تھوڑے سے فاصلے پر ساحل کاٹ کر ایک محفوظ سوئمنگ پول بنا ہوا تھا۔

دیکھو مسٹر میں نے زیادہ رقم خرچ کرائے بغیر تمھاری عزت بڑھائی ہے۔ یہ جگہ باعزت ہے وہ جگہ بس ایسی ہی تھی حالانکہ مجھے زیادہ کام وہیں سے ملتا ہے۔ تم نے ساحۃ البرج سے ذرا آگے بائیں ہاتھ کو وہ گلی دیکھی ہے جہاں پولیس برابر گشت لگاتی ہے بس وہ بدنام جگہ -

وہ جگہ کیا ہے؟"

یکھی کھی کھی ——" وہ ہنسا، اس کا نام ہے سوق عمومی، وہ ویسا بازار ہے مگر وہاں کوئی فلسطینی لڑکی نہیں ہے، اسی لیے میں نے کسی کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کیا۔ ہاں اگر تم جانا چاہو تو میں شرماؤں گا۔ بلکہ تم کو جانے سے منع بھی کروں گا۔"

اب میں خوب صورت اور روشن بیروت کی بلند ہوتی ہوئی عمارتوں سے بور ہوتا جاتا ہوں اسٹیڈیم میں دو چار بڑے کھیل ہوئے مگر گرمی سے لوگ بولا گئے ہیں اور پہاڑوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ پہاڑوں کے ادھر دمشق ہے۔ شام کا دارالخلافہ اور اس سے پہلے بعلبک جہاں رومنوں کے قدیم آثار ہیں۔ ساڑھے لیرے میں دمشق آنا جانا اور ایک وقت کا کھانا طے ہو سکتا ہے ٹیکسی مشترک۔ ایک صبح ہوٹل لارڈز میں ایک یورو پین جوڑا دمشق جانے کی تیاری کر رہا تھا اور میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔

سورج کا شہر

وہ دن بحیرہ روم کی آب و ہوا کے لحاظ سے خاصا گرم تھا۔

اور آتے تھے پسینوں پر پسینے

ٹیکسی میں ہم تین مسافر تھے اور ایک لبنانی ڈرائیور جسے میری طرح گنگنانے کی عادت تھی۔ میں آگے کی نشست پر بیٹھا، یوریپن جوڑا پیچھے، سخت گرمی اور گھٹن کے باوجود میں نے پورا سوٹ پہن رکھا تھا یعنی سوٹ پر ٹائی بھی باندھ رکھی تھی کیوں کہ میں ابھی تک ایک عادی یا تجربہ کار سیاح نہیں بن سکا تھا اور اپنے تمدنی احساسات کمتری میں مبتلا تھا لیکن یوروپین مرد نے ایک کھلے گلے اور آدھی آستینوں کی قمیص اور ایک موٹے کپڑے کی تنگ پتلون پہن رکھی تھی۔ یوریپن خاتون ایک ہلکے پھولدار سائے میں ملبوس تھیں، وہ کم رو اور خوش اخلاق تھیں۔

ہم راس البیروت سے سیدھے ساحل ساحل چلے اور کوئی دس منٹ میں بحمدون پہاڑ کی سڑک پر پہنچ گئے۔ بیروت کے کنارے یہ پہاڑ یا پہاڑیوں کا سلسلہ مری کی طرح پیچدار نہیں ہے۔ مری اونچا بھی بہت ہے یعنی ساڑھے سات ہزار فیٹ۔ بحمدون اس سے آدھا بھی نہیں ہوگا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی سڑک اونچی ہونے لگتی ہے، راستے میں زیادہ موڑ نہیں آتے نہ دائیں بائیں پہاڑیاں آتی ہیں۔ کافی دور تک پیچھے پورے شہر اور آگے سڑک کا منظر بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔

پہاڑیوں سے گزر کر ٹیکسی ایک ہموار راستے پر دوڑنے لگی اور چاروں طرف بھورے رنگ کا ایک میدان پھیل گیا جس میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔

ان علاقوں سے وہ مذہب پیدا ہوئے جو آج تک دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہودیت۔ نصرانیت۔

آخر دنیا کے سب بڑے مذہب مشرق وسطیٰ سے ہی کیوں آئے ۔ مگر یہ ایک الگ موضوع ہے آؤ فی الحال تو ٹیکسی ڈرائیور کی نرم اور رسیلی آواز میں ایک لبنانی گیت سنیں ۔ لبنانی ڈرائیور انگریزی اچھی طرح نہیں بول سکتا مگر وہ فرانسیسی خوب بولتا ہے کیونکہ لبنان اور شام مکمل آزادی سے پہلے فرانسیسی انتداب میں تھے اور فرانسیسی ان عرب علاقوں کو مدتوں کے لیے اسی رستے پہ لگا گئے ہیں جس رستے پر ہم کو ہمارے محبوب ملک معظم جارج ششم کی حکومت ۱۹۴۷ء میں لگا گئی تھی۔

یوروپین مرد فرانسیسی ہے اور بے تکلف آدمی ہے وہ انگریزی بھی خوب جانتا ہے ۔ میرے اصرار پر لبنانی ڈرائیور فرنچ میں ترجمہ کرتا ہے اور فرنچ ساتھی انگریزی میں گویا اب اس گیت یا نظم کا نام سہ ترجمہ یا سہ ترجمی پڑا۔

ہم بیس برس بعد دوبارہ ملے
پہلے ہم کم عمری اور خاندان کے ہاتھوں مجبور تھے
اور اب آتے ہوئے بڑھاپے اور خاندان کے ہاتھوں مجبور ہیں
پہلے ہمیں ماں باپ کا ڈر تھا
اب ہمیں اپنے اپنے بچوں کا ڈر ہے
زمانہ بہت کچھ بدل گیا
لبنان آزاد اور روشن ہے
ہمارے بچے آزادی سے کھلی ہوا اور دھوپ میں کھیلتے ہیں
وہ باہمی محبت کے لیے آزاد ہیں
مگر ہم اب بھی محبت کے لیے آزاد نہیں
شاید اب یہی اچھا ہے کہ بچے خوش رہیں
لبنان بحیرہ روم کے جنوب مشرق میں ہے
اور جنوب مشرق میں ہی رہے گا
اے بچو تم آزاد رہو اور خوش رہو
ہم تمھیں اپنی یہ خوشیاں پیش کرتے ہیں

جو ہمیں نہ مل سکیں

یہ ڈرائیور ہمارے معیار کے مطابق میٹرک پاس ہے اور اپنی موٹر کمپنی کا چھوٹا سا حصے دار بھی ہے۔ اس کی آواز میں درد ہے اور لہجہ صاف شستہ ہے۔ اس نے مجھے اس گیت کے شاعر کا نام بھی بتایا تھا۔

شام کی سرحد آگئی۔ شام اس وقت متحدۃ العربیہ میں شامل ہے یعنی مصر کے ساتھ وفاق کر رکھا ہے مصر اور شام کے لیے ایک ہی ویزا کارآمد ہے لیکن بیروت سے آنے والے سیاحوں کو ایک دن کی سیر کے لیے سرحدی چوکی پر ایک خاص اجازت نامہ بھی مل جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور ہمارے پاسپورٹ لے کر چوکی پر گیا اور ہم نے پاس کھڑے ہوئے لڑکے سے ایک ایک سیون اپ منگا کر پینا شروع کیا۔ سیون اپ یہاں بہت مقبول ہے۔

ایک افسر ہمارے پاسپورٹ لیے ڈرائیور کے ساتھ ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور پریشان معلوم ہوتا تھا اور افسر بدمزاج۔

"السید عالی"

"حاضر جناب"

"آپ بغداد سے آئے ہیں۔ آپ بغداد قاسم کے جشن میں گئے تھے"

"جی ہاں"

"آپ شام میں داخل نہیں ہو سکتے"

"کیوں"

"اس لیے کہ آپ کمیونسٹ ہیں جنرل قاسم بھی کمیونسٹ ہے اور صدر ناصر کا دشمن ہے اور اس کے انقلاب میں کمیونسٹ ہی بلائے جاتے ہیں"

میں جھلا گیا۔ میں نے اسے پاسپورٹ کا پہلا صفحہ دکھایا جس پر میرا پیشہ سرکاری ملازمت لکھا ہوا تھا۔ پھر میں نے اسے باقاعدہ ویزا دکھایا جو متحدۃ العربیہ کے سفارت خانے نے شام و مصر کے لیے دیا تھا۔ میں نے اسے معاملے کو سفارتی سطح پر اٹھانے کی دھمکی دی جس سے وہ مرعوب نہیں ہوا لیکن وہ واپس دفتر میں چلا گیا۔ ڈرائیور سہما سا گیا۔

"بھئی معاف کرنا میں اس قصہ میں پھنسنا نہیں چاہتا میں تو سمجھا تھا آپ سیلانی آدمی ہیں، بات یہ ہے کہ ہمارا روز کا آنا جانا ہے، ہم ان لوگوں سے جھگڑا نہیں چاہتے"

میں نے اسے معاف کر دیا گو مجھے اس کا قصور معلوم نہ ہو سکا۔ کسٹم افسر ایک اور افسر کے ساتھ واپس آیا۔ وہ ذرا سینیئر آدمی ثابت ہوا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو زحمت ہوئی۔ آپ کے پاس ہماری حکومت کا ویزا ہے اس لیے ہم آپ کو نہیں روکیں گے مگر آپ کے ساتھ ہم ایک گائیڈ کر دیں گے جو آپ کو دن بھر اچھی طرح دمشق کی سیر کرائے گا۔ آپ اسے فیس نہ دیں وہ ہم دے دیں گے۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا مگر میں نے ان کی بات منظور کر لی۔ اب وہ یورپین جوڑے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان دونوں کے پاسپورٹ الگ الگ تھے۔ اب معلوم ہوا کہ صاحب بہادر تو خیر فرنچ تھے مگر میم صاحبہ اطالوی تھیں۔ ان کے پاس ویزا نہیں تھا اور وہ ٹورسٹ کمپنی کی یقین دہانی پر عام سیاحوں کے عارضی ویزا ملنے کے انتظام سے آئے تھے۔

"آپ فرنچ ہیں۔ آپ کی قوم نے ہماری نہر سویز پر حملہ کیا تھا اس لیے آپ باقاعدہ ویزا لیے بغیر متحدۃ العربیہ کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے۔ آپ اطالوی ہیں اور خاتون ہیں اس لیے آپ جا سکتی ہیں مگر آپ کے ساتھ وہی گائیڈ رہے گا جو سید عالی کے ساتھ رہے گا اور شام تک آپ کو شہر کی سیر کرا کے واپس اس چوکی تک پہنچا دے گا۔"

شاید وہ عرب افسر زیادتی کر رہا تھا مگر اس نے یہ سب کیوں کیا۔ ہمارے بقراط اسے جذباتیت اور سطحیت اور بد انتظامی کہیں گے مگر اس جذباتیت اور سطحیت اور بے انتظامی کی تہوں میں عرب حمیت اور غیرت کے گہرے گہرے دریا ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ شام پر فرانسیسی انتداب کتنے دن رہا۔ سلطنت عثمانیہ ختم ہوئے کتنے برس گزرے۔ چالیس پینتالیس برس۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی شام آزاد ہو گیا اور اس کے ایک کسٹم افسر کو فرنچ غلامی کا دکھ یاد رہا اور اب مجھے اپنے پیارے برصغیر کی دو سو سالہ تاریخ یاد آئی۔ پلاسی اور سن اٹھارہ سو ستاون کا انقلاب اور سید احمد شہید اور خلافت تحریک اور جلیانوالہ باغ اور تقسیم پنجاب اور تقسیم بنگال اور ریڈ کلف ایوارڈ اور کشمیر۔ اور پھر مجھے اپنے اسکول اور کالج اور یونیورسٹیاں اور دفاتر اور انگریزیت کے دوسرے ہزار ہا مظاہر یاد آئے اور خود اپنے بچے۔ اپنے جیسے بہتوں کے بچے۔

"گڈ مارننگ ابّو جان۔"

"گڈ مارننگ منّے۔"

"پلیز ابّو۔ آئی سیو یر۔ کل ہم نے یہ پوئٹری یاد کی ہے۔"

ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار
ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر
بابا بلیک شیپ ہیو یو اینی وول
یس سر یس سر تھری بیگز فل"

ہائے میرا وطن۔ میرے وطن کا تمدن۔ میرا کلچر جسے ثقافت کہہ دینا جاہل ہونے کی نشانی ہے۔ میرا کافی ہاؤس برٹش ڈیموکریسی اور برٹش پارلیمنٹری سسٹم کی یادیں اور لارڈ مکالے کے ذہنی غلام استاد اور شاگرد اور انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ جس کی رُو سے اورنگ زیب کٹ ملا تھا اور ۱۸۵۷ء والا بخت خاں غدار اور شیخ الہند باغی اور مولانا حسرت موہانی ایک بیوقوف شاعر جو سیاست داں نہ بن سکے۔

اے عزیز شامی کسٹم افسر تیری بات اور ہے ہم تو لارڈ مکالے کے آدمی ہیں۔

بی۔ اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے۔

اے پیارے شامی ہم پر انگریز کے بہت احسان ہیں۔ اس نے ہمیں قانون فوجداری اور ضابطہ دیوانی دیا اور مکالے کا تعلیمی نظام اور برٹش پارلیمنٹری سسٹم اور والیان ریاست اور نواب دیے اور اس نے میرے والد مرحوم کو سر کا خطاب دیا تھا جس پر میرا خاندان آج تک فخر کرتا ہے۔ کیا ہوا جو اس نے ایک اتنی بڑی آبادی کو سو برس غلام رکھا اور اس کے وسائل لندن اور مانچسٹر کے لیے استعمال کیے اور اس پر گولیاں چلائیں اور بم برسائے اور جاتے جاتے کشمیر کا قضیہ پیدا کر گیا۔ ہم تو اس کے احسانات یاد کرتے ہیں اور سبلے دیز الندن جاتے ہیں اور برٹش میوزیم لائبریری میں اُردو مصنفین پر کام کرتے ہیں کیونکہ اب بھی مقامی یونیورسٹیوں کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی قدر نہیں کی جاتی۔ پس اے پیارے شامی تم لوگ اور جذباتی ہو اور ہم سنجیدہ اور مہذب اور ٹھوس آدمی ہیں ہم آج بھی برطانوی راج کی سچی تاریخ لکھنے سے گھبراتے ہیں اور تم ایک یورپی قوت کے مظہر اپنے سابق آقا کو اپنی سرحدوں میں جانے سے روک دیتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی قوم نے اپنے دور حکومت میں تمھارے ملک میں کوئی سول سروس قائم نہیں کی ورنہ آج تمھارا یہ نخرا یہ مزاج نہ ہوتا۔

ہم دمشق نہ جا سکے۔ اطالوی خاتون اپنے فرنچ عاشق کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئیں اور ڈرائیور مجھے اکیلا لے جانے پر تیار نہ ہوا اور شامی افسر اپنی ذاتی خارجہ پالیسی میں تبدیلی پر تیار نہ ہوا۔

مجھے دمشق نہ دیکھنے کا بہت غم تھا۔ ایک تو شہر بہت خوبصورت ہے پھر وہاں مسجد اموی ہے جس کی تعریف ہزار برس سے ہو رہی ہے پھر وہاں شامی قوم ہے جس کے مزاج میں انقلاب رچا ہوا ہے۔ مگر چلتے چلتے میں

نے اس معمولی سے شامی کسٹم افسر سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا جس پر وہ حیران رہ گیا۔

واپس ہوتے وقت خوش اخلاق فرینچ اور مہذب اطالوی خاتون کے رویے میں ایک نمایاں فرق محسوس ہوا۔ میں عرب نہ تھا میں شامی کسٹم افسر بھی نہ تھا مگر بہرحال ایشیائی تھا۔ انھوں نے میرے لیے ترجمے کا کام بند کر دیا اور اس ویزا والے واقعے پر میری رسمی ہمدردی بھی قبول نہ کی۔

کچھ دیر بعد ہم ایک مقام پر کھانا کھانے ٹھہرے۔ ایک طرف جدید وضع کا ایک آراستہ ریستوران تھا اور دوسری طرف ایک عظیم الشان ویران معبد۔

اس گیارہ ہزار آدمیوں کی بستی کا نام بعلبک ہے۔ جس کا یونانی نام ہے، ہیلیوپولس یعنی سورج کا شہر۔ اور خود یہ یونانی نام اپنے مصری متقابل سے منسوب ہوا تھا۔

سورج کا شہر بیروت سے کوئی چار ہزار فیٹ کی بلندی پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے تین سو برس قبل مسیح جب شام پر یونانیوں نے قبضہ کر لیا تو یہ علاقہ بھی ان کے پاس رہا اور پھر اس کے آقا بدلتے رہے۔ یہاں تک کہ رومی حکومت کے دوران مشہور رومن جنرل اور عاشق مارکس انطونی نے جو شامی علاقے ملکہ قلوپطرہ کو نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش کیے ان میں بعلبک بھی شامل تھا۔ قلوپطرہ کا نام کہاں کہاں ہے قلوپطرہ کا ذکر ہر ہے بسنہ چھتیس قبل مسیح سے بیسویں صدی بعد مسیح تک۔

اور یہ دیوتا جیوپیٹر اور دیوتا باکوس کے مندر ہیں۔ رومنوں کے بنائے ہوئے۔ ان کی تعمیر ڈھائی سو برس تک جاری رہی۔ مختلف ادوار میں مختلف حصے تعمیر ہوتے رہے اور پھر۔ پھر نہ جانے کب اس طرح مٹ گئے کہ ہرین آثارِ قدیمہ آج تک ان کے اسباب معلوم کرتے رہتے ہیں۔

یہ شش پہلو صحن ۳۲۰ x ۲۴۳ فیٹ کا ہے جس کے گرد گول گول بنچیں تھیں اور ان کے گرد رنگین پتھر کے ساٹھ ستون تھے جو جنوبی مصر کے علاقہ اسوان سے لائے گئے تھے۔ اسوان جہاں اب صدر ناصر ایک عظیم بند باندھ رہے ہیں۔ ایک ایک ستون کی لمبائی باسٹھ فیٹ اور قطر ساڑھے سات فیٹ تھا۔ اب ان ساٹھ میں سے چھ ستون باقی رہ گئے ہیں۔ جن کی تصویر ہر سیاح پچاس پیاسٹر میں خرید لیتا ہے۔ یہ مندر اصل میں زراعت کے دیوتاؤں کی عبادت کے لیے تھا۔ شامی دیوتا حدد جو بادلوں کی گرج پیدا کرتا تھا اور جس کا مماثل یونانی دیوتا جیوپیٹر ہے اور مناظر فطرت کی دیوی اتارگاتیس جو وینس سے مماثل ہے اور ایک بے نام نوجوان سا دیوتا جو سبزیوں اور اناج میں قوت نمو کا نام تھا اور جس کا مماثل یونانیوں میں ہرمیس اور رومیوں میں مرکری یعنی عطارد ہے۔ ایک دروازے پر موٹے موٹے انگور کے خوشے پتھر پر

پر بڑی خوبصورتی سے کھودے گئے تھے اور ان کے نیچے نوجوان اور طاقتور پٹھے ابھارے ہوئے بیلوں کی جوڑیاں بنائی گئی تھیں۔ انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں رزق دینے والے مظاہر کی پوجا کی ہے۔ اور کیا وہ روٹی دینے والے انسانوں کی پوجا بھی نہ کرتا۔

باکوس کا مندر دوسری صدی عیسوی کا کارنامہ ہے اور جیوپیٹر کے مندر سے چھوٹا ہے آخر باکوس دیوتا بھی جیوپیٹر دیوتا سے چھوٹے ہیں۔ چھوٹوں کے مندر بھی چھوٹے ہی ہوں گے۔ دیوتاؤں میں بھی انسانوں کی طرح اسٹیٹس یعنی مقام و منصب کی تمیز کی جاتی تھی کیونکہ ان کے اختیارات بھی کم ہوتے تھے۔

جیوپیٹر کا مندر بحیرہ روم کے اس پار سے آنے والی قوم کے عزائم اور حوصلے کی ایک شاندار کہانی ہے۔ یار لوگ دور پار مصر کے جنوبی حصے آسوان تک سے پتھر کھینچ لائے تھے جزیرہ نما عرب میں رومی اقتدار کی شاید آخری نشانی بعلبک کے مندر ہیں۔ رومی اقتدار جس نے صدیوں اس خطے سے غلام اور کنیزیں اور قیمتی دھاتیں اور تحفے سلطنت روما کو بھیجے آخر کار اسی علاقے سے اٹھتے ہوئے ایک نحیف و نزار سامی النسل نوجوان کے زیر اثر آ گیا۔ وہ نوجوان جو آس پاس کے پہاڑوں میں اعتکاف کرتا تھا اور تنہائیوں میں رومی ظلم و جبر سے اپنی قوم کی آزادی کے لیے دعائیں مانگتا تھا، ایک دن رومیوں کے ہاتھوں مصلوب ضرور ہوا۔ مگر اس طرح کہ اس کے بعد پوری سلطنت روما اس صلیب کو پوجنے لگی۔ اور آج تک پوجتی ہے۔

اب مجھے بعلبک کی سڑکوں پر رومی سوار اور پیادے اپنے گیلے گھومتے دکھائی دیے اور قریب تھا کہ میں اس کی تاریخ کے پورے پس منظر میں جذب ہو جاؤں اور اس پر مختلف قوموں اور خاندانوں کی حکومت کے مناظر کا مزا لوں کہ ٹیکسی ڈرائیور یورو پین جوڑے کے ساتھ آموجود ہوا۔ میں نے چاہا کہ یورو پین جوڑا بھی بعلبک کے بارے میں میری تاریخی معلومات سے فائدہ اٹھائے۔ میں نے ان کی سابقہ کج خلقی کی پروا بھی نہ کی۔

"دیکھیے یہاں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بھی حکومت کی ہے اور مصر کے مملوک سلطانوں نے بھی اور ۱۵۱۶ء میں جب یہ پورا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا تو پہلی جنگ عظیم یعنی تقریباً چار سو برس تک شامل رہا۔ آپ لوگ تو کل بیس تیس برس کے لیے قابض ہوئے تھے"

مگر معلوم ہوتا ہے کہ یورو پین جوڑا ابھی تک دمشق نہ جا سکنے کے غم میں مبتلا ہے۔ وہ دونوں صرف اخلاقاً گردن ہلا کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور میں نے اپنے علم کا بوجھ اٹھائے بادل ناخواستہ اگلی نشست سنبھالی اور لبنان چھوڑنے کا پروگرام بنانے لگا۔ کل لبنان کے دو ادیب رشدی معروف اور رشاد دار غوث مجھ سے ملنے آئیں گے ورنہ میں آج ہی شام کسی نہ کسی جہاز سے قسطنطنیہ روانہ ہو جاتا جہاں ہمارے ثقافتی اتاشی شریف الحسن صاحب نے شطرنج کے میچ اور مشاعرے کا انتظام کر رکھا ہے۔

مصر

گرمئ بازار

دو تین دن لبنانی ادیبوں سے ملنے جلنے میں لگ گئے۔

رشدی معروف تخلیقی ادیب نہیں لیکن ادیب گر ہیں۔ وہ ایک نوجوان عرب عیسائی ہیں اور لبنان کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار "الجریدہ" کے مالک و مدیر۔ "الجریدہ" اعتدال پسند اور عرب قومیت کا حامی ہے۔ رشدی معروف اور رشاد دار غوث جو مشہور مسلمان ناول نویس ہیں فلسطینی مہاجرین کے معاملے میں بالکل ہم خیال ہیں۔ فلسطینی مہاجرین جدید عرب ادب کا ایک اہم موضوع بن چکے ہیں اور پوری دنیائے عرب اسرائیلی ریاست کے وجود کو قانونی نہیں مانتی۔ نہ ماننے کو تو ہم پاکستانی بھی اسے نہیں مانتے مگر اس سے کیا ہوتا ہے، ہمارے ابا جان اور چچا جان تو مانتے ہیں بلکہ اسرائیلی ریاست کا قیام ہی جد محترم لارڈ بالفور وزیر برطانیہ کے منصوبے اور عم محترم صدر ٹرومین کے عملی اقدام کا نتیجہ ہے۔

ریاست اسرائیل کیا ہے۔ ایک سیدھا سا مگر شرمناک سامراجی مرکز ہے۔ کیا چند لاکھ یہودیوں کو ایک وطن چاہیے تھا جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ اب یوں تو فری ورلڈ میں ابھی بہت سے خالی قطعات زمین پڑے ہیں۔ کنیڈا کے وسیع غیر آباد علاقے، تین چوتھائی آسٹریلیا، گرین لینڈ اور خود ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بڑے بڑے میدان۔ مگر قصہ یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد عرب قومیت کا اُبھرنا لازمی تھا اور عرب قومیت کے اُبھرنے کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے تیل کے چشموں اور نہر سویز کے قیمتی پانی پر اپنا اقتدار رکھنا چاہے گی اور اس طرح دنیا میں ایک تیسری طاقت کے اُبھرنے کا امکان پیدا ہو جائے گا پس ان پر قوم یہود کی تلوار لٹکا دی گئی۔ یورپی اور امریکی سرمائے اور ہتھیاروں کے بل پر ایک مختصر سے عرصے میں یہودیوں کی ایک بڑی جماعت جزیرہ نمائے عرب کے شمال مغربی کونے میں اُتار دی گئی جس نے ایک خونریز خانہ جنگی کے بعد فلسطین کے دو ٹکڑے کر دیئے اور ایک ٹکڑے میں اسرائیل کی ریاست بنالی۔ اب

اس ٹکڑے سے سامراج تین طرف اُبھرتی ہوئی عرب قوتوں پر توپیں لگائے بیٹھا ہے اور فلسطینی مہاجرین دُور نیویارک میں ایسٹ دریا کے کنارے بنی ہوئی ایک انتالیس منزلہ عمارت کی طرف رُخ کرکے خلا میں گھورتے رہتے ہیں کہ شاید کسی دن اس عمارت کے دفتر سے جسے یو۔این۔او کہتے ہیں انھیں گھر واپس جانے کا پروانہ راہ داری مل جائے۔

بھئی واہ فلسطینی مہاجرو تم بھی ہمارے کشمیریوں کی طرح ہو جن کے حافظے اپنی سرسبز وادیوں اور برف پوش پہاڑیوں کی یادمیں اتنے تیز ہوگئے ہیں کہ انھیں کشمیر پر وہ سب قراردادیں اور بحثیں حفظ ہیں جو یو۔این۔او میں ہوتی رہتی ہیں لیکن آپ سب بھائی بھولے ہوئے ہیں کہ یو۔این۔او کے بجٹ کا کوئی پچھتر فی صدی حصہ امریکہ اور برطانیہ اور فرانس مہیا کرتے ہیں جو ریاست اسرائیل کے قیام کے ذمہ دار ہیں اور جو کشمیر پر ہندوستانی قبضے کو اپنے تمام بلند بانگ اخلاقی دعووں کے باوجود ایک انسانی مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ عالمی سیاست کی شطرنج پر ایک مہرہ جانتے ہیں جس کا آگے پیچھے کرنا ان کی پوری بازی کے داؤ پیچ کا ایک معمولی سا جزو ہے۔

دیکھیے بات کہاں سے چلی اور کہاں پہنچ گئی مگر بات کی خوبی ہی یہ ہے کہ کہیں سے چلتی ہے اور کہیں پہنچ جاتی ہے۔

چنانچہ اب میں پھر بیروت کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے مجھے قسطنطنیہ جانا ہے۔ سامان جمع کراکے سب مسافر ریستوران میں پہنچا دیے گئے تھے کیونکہ جہاز کے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹے تین گھنٹے ہم بور ہونے لگے۔ پھر ایک آواز گونجی۔

"خواتین وحضرات قسطنطنیہ جانے والی پرواز کل دوپہر تک کے لیے منسوخ ہوگئی ہے"

معلوم ہوا کہ جو جہاز ہمیں لے جاتا ابھی قسطنطنیہ ہی سے نہیں چلا۔ مسافروں نے اس ہوائی کمپنی کے بارے میں نہایت ناز یبا جذبات کا اظہار کیا اور منتشر ہوگئے لیکن ایک میانہ قد دُبلی پتلی امریکی خاتون میری طرح اپنی کرسی پر بور بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے ایک بیزار قسم کی انگڑائی لی میری طرف دیکھا۔

"کیا آپ کو بھی قسطنطنیہ جانا تھا" میں نے پوچھا

"ہاں مجھے بھی جانا تھا مگر میں کہیں بھی جاسکتی ہوں۔ میں بیروت سے تنگ آگئی ہوں"

پھر ہم دونوں چپ رہے کیونکہ میں بھی بیروت سے تنگ آگیا تھا۔ ہم دونوں سامنے والی کتابوں کی دکان پر گئے جہاں صدر ناصر کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم نے کتابیں اُلٹ پلٹ کیں۔

"میں تو قاہرہ جاتی ہوں" وہ ایک دم بولیں: "کیا آپ یورپ جا رہے تھے یعنی ترکی سے ہوتے ہوئے؟"

"نہیں تو "میری ہمت بندھی" میں قسطنطنیہ سے ایک دن کے لیے ایتھنز ہوتا ہوا مصر آیا اور پھر واپس پاکستان۔"

"آہا۔ آپ پاکستانی ہیں۔ میں بھی عرب ہیں۔ میں کراچی سے ہی تو بیروت پہنچی تھی۔"

"آہا" میں نے بھی کہا مگر پھر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ ایک دو تین کر کے کراچی کے بارے میں سوال پوچھوں اپنے ملک کے بارے میں رائے مانگوں۔ کیا کروں۔

"اچھا۔ گڈ بائی۔ میں ذرا اُدھر جا کر دیکھتی ہوں کوئی جہاز قاہرہ جا رہا ہو تو اچھا رہے گا۔"

"گڈ بائی"

مگر دس منٹ بعد میں بھی اسی ہوائی کمپنی کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا جہاں امریکی خاتون نے قاہرہ کے لیے ٹکٹ بدلوایا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت ہنسی۔

"اوہ مسٹر پاکستانی آپ قاہرہ جا رہے ہیں یا میرا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"آپ کیا پسند کریں گی۔"

"یہ کہ آپ میرا تعاقب کریں۔ مگر آپ کے وطن میں تو لوگ غیر ملکی عورتوں سے شرمائے شرمائے سے رہتے ہیں۔"

"ہمیں اپنی عورتیں بہت پسند ہیں یا شاید ہم اپنی ہی عورتوں سے گھبراتے ہیں تو ——"

"تو آپ میرا تعاقب نہیں کریں گے۔"

"ضرور۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے تک"

ایک گھنٹے بعد۔ مصری ہوائی کمپنی کا ایک ڈکوٹا ہمیں لے کر اس طرح اُڑا کہ میں نے ڈکوٹا میں سفر نہ کرنے کی قسم کھا لی۔

تو یہ ہے مصر المصر جسے انگریز نے ای جیپٹ بنا دیا اور ہم بھی آپس میں انگریزی بولتے ہیں تو اسے مصر نہیں پکارتے بلکہ ای جیپٹ کہتے ہیں جیسے ریڈیو پاکستان کے پاکستانی خبریں پڑھنے والے جب انگریزی میں خبریں پڑھتے ہیں تو پاکستان کہتے ہیں پاکستان نہیں کہتے۔ ورنہ سننے والوں کو ان پر دیسی ہونے کا شبہ ہو جائے۔

یہ مصر قدیم اور مصر جدید ہے۔ فرعون اور قلوپطرہ اور عمرو بن العاص اور شاہ فاروق اور صدر

ناصر کا مصر۔ اس نہر سوئیز کا مصر جو دنیا کے بڑے بڑے سمندروں پر بھاری ہے جامعہ ازہر کا مصر جو ایک ہزار برس پرانی ہے۔ مصر قدیم ترین ملکوں میں زندہ ترین ملک ہے۔

"یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے"

مگر بیسویں صدی کے مصر نے ثابت کر دیا کہ علامہ اقبال کے اس مصرع سے مصر کا نام نکال دینا چاہیے۔

قاہرہ کے ہوائی اڈے پر خاصی چھان بین ہوتی ہے۔ مصر آزاد کرنسی کا ملک نہیں ہے اور کسٹم پر ہمارے ملک کی طرح ہر قسم کی کرنسی تحریراً ظاہر کرنی پڑتی ہے۔

یہاں بھی اہلکاران کی نظر میرے پاسپورٹ پر لکھے ہوئے "بغدادی قاعدے" پر پڑی اور انھوں نے مجھے اچھی طرح جانچنا شروع کیا۔

"آپ انقلاب عراق کی سالگرہ میں گئے تھے؟"

"کیا آپ سرکاری وفد میں شامل تھے یا ذاتی طور پر بلائے گئے تھے؟"

"آپ کو یہاں کیا کام ہے؟"

تیسرے سوال پر مجھے غصہ آگیا۔

"مجھے قلوپطرہ سے ملنا ہے۔" میں نے بظاہر مسکرا کر جواب دیا مگر اب شاید اہلکار صاحب کو اطمینان ہوگیا تھا اس لیے وہ برا نہ مانے۔

"اوہو۔ آپ کو پندرہ بیس دن انتظار کرنا پڑے گا۔ ملکہ قلوپطرہ تو آپ کے رقیب مارکس انطونی کے ساتھ اسوان بند دیکھنے چلی گئی ہیں کیا آپ کے پاس انتظار کے لیے کافی کرنسی موجود ہے —"

یہاں پھر امریکن خاتون کی وجہ سے بیروت والا پرانا قصہ پیش آیا یعنی

ہوٹل کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ایک نہایت مہذب گائیڈ نے ہوٹلوں کے نرخ بتانے شروع کیے۔ ہلٹن ہوٹل جو نیل کے کنارے ہے اور جس میں چار سو ائیر کنڈیشنڈ کمرے ہیں بیس ڈالر فی شب سو کھٹے یعنی سو روپے جس میں صبح کا ناشتہ بھی شامل نہیں ہے سیمی رامیس چالیس روپے فی شب یعنی کمرے کا کرایہ داہل زبان اس میں ذم کا پہلو تلاش کر کے بغلیں بجائیں گے کیونکہ سیمی رامیس ایک ملکہ کا نام ہے) سوائے پچاس روپے۔ کاسمو پولیٹین پینتالیس روپے۔ ناشتہ کھانا ٹپ الگ۔

کہ ۔۔ اور مصری جو بیروت سے ساتھ باتیں کرتے آئے تھے میری پریشانی سمجھ گئے [illegible]ان کے کہنے سے

موٹر آئی تھی انھوں نے مجھے اور امریکن خاتون کو ساتھ بٹھایا اور پہلے ہلٹن گئے جہاں امریکن خاتون اُتر گئیں۔ مصری دوست نے میری عزت رکھنے کو ان سے کہا کہ یہ پاکستانی مجھے اتنے پسند آئے ہیں کہ میں انھیں اپنا مہمان بنا رہا ہوں۔ میں نے خاتون سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ لیا اور ہلٹن پر ایک ترسی ہوئی نظر ڈال کر واپس ہوا اب میرے ساتھی نے مجھے ایک شاندار سڑک پر لا کھڑا کیا جس پر کئی منزلہ عمارات دونوں طرف چلی گئی تھیں۔

"یہ ادھر فندق اللوقس ہے یعنی ہوٹل لوٹس۔ اس کا کرایہ ایک یا ڈیڑھ پونڈ مصری (چودہ یا بیس روپے پاکستانی) ہے۔ اور یہ سڑک ہر جگہ جانے کے لیے ایک آسان جگہ ہے۔ آپ یہاں ٹھہریے۔ مگر دلی میں جائے پیجیے۔ عابدین میں رقص دیکھیے اور ہلٹن میں امریکی خاتون کے ساتھ مفت چہل قدمی فرمایئے"

قاہرہ کی آبادی چالیس لاکھ سے اوپر ہے۔ بڑی بڑی سڑکیں اور اونچی اونچی عمارتیں۔ کشادہ میدان تیز دوڑتی ہوئی موٹریں اور بسیں۔ اور بے حد معروف نظر آنے والے شہری۔ قاہرہ یورپ یا امریکہ کا شہر لگتا ہے۔

قاہرہ جو صدر ناصر کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے گوناگوں تحریکات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جس میں عرب قومیت سے لے کر مصری ماضی پرستی، سرد جنگ میں غیر جانبداری۔ الجزائر کی جنگ آزادی۔ افریقی برادری اور افریشیائی اتحاد سب کچھ شامل ہیں۔ قاہرہ ایک پُراسرار شہر ہو گیا ہے۔

ہوائی اڈے سے ہیلیو پولس کی نئی آبادی نزدیک ترین ہے (ہیلیو پولس نام کا شہر لبنان میں بھی ہے جو اصل میں ایک مصری شہزادے کے نام پر بنایا گیا تھا) اس کے آگے سے دو سڑکیں شہر کی طرف جاتی ہیں ایک ہے شارع رامی سیس جس کا نام پہلے کچھ اور تھا مگر اب فرعون اعظم رامی سیس کے نام منسوب کر دی گئی ہے دوسری سڑک کا نام شارع الجیش ہے یعنی فوجی سڑک۔ پہلے اس بچاری سڑک کا نام شارع فاروق تھا۔ شہر کی ایک اور سڑک کا نام ہے شارع ۲۷ رجولائی جبکہ پہلے اس کا نام شارع فواد الاول تھا۔

خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے کراچی شہر تک ہماری آزادی کی خبر نہیں پہنچی ورنہ ہماری سڑکوں کے نام کیا کیا ہوتے۔ اب تو ہم اپنے محبوب فاتح سندھ سر چارلس نیپئر کی یاد میں نیپئر روڈ اور نیپئر اسٹریٹ اور نیپئر پارک سے عقیدت و احترام کے جذبات سے سرشار گزرتے ہیں۔ اگر یہ خوش نما مقامات کسی دیسی یا اسلامی ہیرو یا واقعے سے منسوب کر دیئے جاتے تو بچے الگ مذاق اڑاتے اور نہ جانے خداوندان دولت مشترکہ کی طرف سے کیا غضب نازل ہوتا کیا خبر اپنے افسران بالا ہی خفا ہو جاتے کیونکہ انگریزی زبان کا مزاج ہی اور ہے۔

مگر یہ مصر ہے آتشیں اور جذباتی عربوں کا ملک۔ آزاد ہوئے سڑکوں کے نام بدل دیئے۔ انقلاب کیا

اور کبھی نام بدل دیئے۔ آہ! ولیم شیکسپیر کیا خوب کہہ گیا ہے۔ آخر انگریز تھا نا۔

اے میاں کیا رکھا ہے ناموں میں

جس سڑک پر میں رہتا ہوں اس کا نام شارع سلیمان باشا ہے۔ عرب پ نہیں بول سکتے اور پاشا کا لفظ ترکی حکومت کے زمانے میں اس طرح آیا تھا کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ اس سڑک کے ایک سرے پر ایک وسیع چوک ہے جس میں ایک سپاہی کا مجسمہ بنا ہوا ہے۔ یہ انیسویں صدی کا ایک مصری سورما تھا جس کا نام سلیمان باشا تھا۔ شارع سلیمان باشا کے ایک طرف سے شارع قصر نیل شروع ہوتی ہے جو دریائے نیل کے کنارے کنارے گئی ہے۔ اس راستے پر ایک اور چوک ہے جس کا نام میدانِ مصطفیٰ کامل ہے۔ یہاں مشہور مصری قوم پرست مصطفیٰ کامل کا مجسمہ ہے مجسمے قاہرہ میں بہت سے ہیں۔ اسٹیشن کے آگے بھی ایک قدیم طرز کا مجسمہ ہے۔ مصری تحریک احیاء میں حد سے زیادہ گزر گئے ہیں اپنے پرانے بادشاہوں یعنی فرعونوں کے ذکر سے نہیں شرماتے بلکہ اپنی تہذیب کی قدامت پر ناز کرتے ہیں اور ماضی کے مشاہیر سے بڑے بڑے مقامات اور سڑکیں منسوب کرتے ہیں۔ انھیں اہرام اور جامعۃ الازہر اور فراعنہ کے خزانوں اور جدید سڑکوں پر ایک جیسا فخر محسوس ہوتا ہے۔ شہر قاہرہ کا سب سے زیادہ خوبصورت مقام میدان التحریر ہے یعنی آزادی کا چوک جو چوک سلیمان باشا اور دریائے نیل کے وسطی علاقے میں واقع ہے۔ یہ ایک وسیع قطعہ ہے جو گھاس کے تختوں اور پھولوں کی کیاریوں میں بنا ہوا ہے اس چوک میں دس سڑکیں آکر کھلتی ہیں یہیں صدر ناصر ۲۳ جولائی کو اپنے انقلاب کی بڑی تقریب مناتے ہیں اور تقریر کرتے ہیں۔ اسی جگہ کے قریب مصری قومی عجائب خانہ ہے جو ۱۹۰۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اور جہاں فراعنہ کی ممیاں یعنی حنوط شدہ لاشیں بڑے بڑے بکسوں میں محفوظ اور کھلی پڑی ہیں۔ اسی عجائب خانے میں فرعون توت عنخ آمون کے خزانے اور قدیم مصری لباس اور ہتھیار اور دیگر عجائب جمع ہیں جو پتھر کے بند مقبروں سے کئی ہزار برس بعد برآمد ہوئے ہیں۔

قدیم مصری تہذیب اس کی کہانیاں اور اس کی تاریخی روایات کا مضمون الگ ہے۔ ہو سکا تو میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکا سب کو دکھاؤں گا اس وقت تو میں جدید قاہرہ میں ہوں۔ جہاں قصر عابدین کو جو شاہ فاروق کا محل تھا ایک عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس کے پائیں باغ میں نائٹ کلب ہے جہاں اب مجھ جیسے عامی بھی دس روپے خرچ کر کے مصری بیلے ناچ دیکھ سکتے ہیں اور جہاں المقطم نام کا ریستوران بھی ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے جس سے پورا قاہرہ اور قاہرہ کے آگے صحرا کے گزرا (لی زا) میں ہزاروں برس بوڑھے تین اہرام روشن نظر آتے ہیں۔ کیونکہ مصری حکومت سیاحوں کے لیے رات کے وقت تمام قدیم

آثار کو فلڈ لائٹ یعنی تیز ذیریں قمقموں سے روشن رکھتی ہے ۔

اور میں نے سنا ہے کہ شہر کے پچھلے حصے میں مدینۃ الفنون نام کا ایک محلہ بھی ہے یعنی شہر فنکاراں جہاں مصوّر اور شاعر اور ادیب بستے ہیں ۔ مصر میری چھوٹی سی عمر سیاحت میں سب سے قدیم ملک ہے اور یہاں میری ساتھی ایک امریکی خاتون ہیں جن کا ملک جدید ترین ملک ہے ۔ یعنی مجھے ایک جدید ترین ذہن کی ہمراہی میں ایک قدیم ترین تہذیب کی مسافتیں طے کرنی ہیں ۔

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم



اہرام ـــــ ابوالہول اور مصنّف

ابوالہول کی آغوش میں

مصر پہنچ کر کچھ ایسی کیفیت ہو گئی ہے کہ
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایک طرف قاہرہ میں اُبھرتی ہوئی نئی عرب قومیت کی شاندار یلغار اور اس کے باوجود فضا میں ایک گھٹن اور وحشت سی محسوس ہوتی ہے اور دوسری طرف اہرام اور دیوِ ابوالہول اور الازہر اور فرعون اور فاطمیوں، مملوکوں، ترکوں اور فرانسیسیوں کے آثار اور اثرات اور کہانیوں کے آئینہ خانے ہیں۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے

امریکی خاتون کا ساتھ روز رہنے لگا ہے۔ انھیں اپنے آپ پر اعتماد ہے اس لیے مجھے بھی اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ انھیں زیادہ بولنے کی عادت ہے ——— اور مجھے بھی۔ ان کے پاس ایک بیش قیمت کیمرہ ہے جس سے وہ جو کچھ نظر آتا ہے اس کا عکس لے لیتی ہیں اور میرے پاس ایک بیش قیمت کیا ایک کم قیمت کیمرہ بھی نہیں ہے مگر میرے پاس ماضی کی ہزار گز لمبی قلم ہے جس کے ذریعے جو آج نظر نہیں آتا وہ سب کچھ میں دکھا سکتا ہوں۔ لہٰذا اب مصر دیکھنے کا پروگرام بنتا ہے۔ سفارت خانے کی معرفت ایک نوجوان مہذب مصری السید عبدالفتاح الدیدی میسر آ گئے ہیں جو ادیب ہیں لیکن سرکاری ملازم بھی ہیں اس لیے ہم سب کو مکلف اور محتاط رہنا پڑتا ہے۔ متعدد بار یہ بات ہمارے بغدادی دوست بشیر فاروقی کی طرح مُصر رہتے ہیں کہ مصر کی جدید ترقیات اور منصوبوں کا جائزہ لیا جائے لیکن ہم یہاں صدر ناصر کے مہمان تو ہیں نہیں اس لیے ہم اپنی مرضی زیادہ چلاتے ہیں۔

"اچھا تو مادام یعنی مادام ڈوروتھی تمھیں اب یہ سلسلہ کیسے شروع کیا جائے۔

مادام ڈوروتھی تمھیں مصر سے خاصی واقف معلوم ہوتی ہیں مثلاً وہ یہ جانتی ہیں کہ بہت دن ہوئے

یہاں ایک ملکہ تھی جس کا نام قلوپطرہ تھا. کلیو پیٹرا. اس کی شادی تو رواج کے مطابق اپنے سگے بھائی سے ہوئی تھی مگر وہ تھی ذرا فلرٹ اور اس وقت مصر رومیوں کی یلغاروں میں مبتلا تھا اس لیے اس نے پہلے بڑھے فاتح جولیس سیزر سے عشق لڑایا اور اس کا بیڑا کرتے کرتے چھوڑا پھر اس نے سیزر کے محبوب دوست اور نوجوان جنرل مارکس انطونی سے عشق لڑایا اور اس کا بھی ایسا بیڑا کیا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر اسی کا ہو گیا یہاں تک کہ چھوٹے سیزر نے مصر پر دوبارہ حملہ کر کے اسے بھی ختم کر دیا اور ملکہ نے ایک زہریلے سانپ سے خود کو کٹوا کر جان دے دی.

ہاں وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ یہاں اہرام ہیں. فرعونوں کے مقبرے جنھیں شاید ہمارے پیارے ذہین پاکستانی بچے ہیرے میڈز PYRAMIDS کے نام سے زیادہ جانتے ہوں گے اور یہ بھی کہ یہاں ابوالہول ہے جس کا انگریزی نام ہے SPHINX سی فی نون غنہ اور ک س ساکن.

اور وہ جدید مصر کے بارے میں یہ جانتی ہیں کہ ایک تھا خدا کا بنایا ہوا بادشاہ ــــ

جس کا نام تھا شاہ فاروق جو پہلے دُبلا اور خوب صورت تھا اور اب موٹا اور بدصورت ہو گیا ہے اور جو عربوں میں اور پتی اور غیر عربوں میں بھی کروڑ پتی قسم کی چیز تھا اور بڑا جوا کھیلتا تھا اور اچھی عورت رکھتا تھا اور میٹھی شراب پیتا تھا اور ساؤتھ آف فرانس یعنی شہزادی گریس کیلی کی سسرال کے جوئے خانوں اور قحبہ خانوں میں لاکھوں ڈالر فی شب خرچ کرتا تھا اور مصریوں پہ دل و جان سے حکومت کرتا تھا اور اسے مصر کے نواب اور پاشا لوگ دل و جان سے چاہتے تھے اور کہتے تھے (جیسے ہماری تمھاری نانی اماں کہتی تھیں):

ہمارا تمھارا خدا بادشاہ. خدا کا بنایا فاروق بادشاہ.

مگر ایک شب جب وہ اسکندریہ کے ساحلی شہر میں جوا کھیل کر سستا رہا تھا تو صدر ناصر کی پارٹی نے اس کا بھی بیڑا کر دیا. اور اسے اسی کے بحری جہاز میں بٹھا کر رخصت کر دیا اور بعد میں وہ جہاز بھی اس سے چھین لیا.

اور ڈروتھی جمیس یہ بھی کہتی ہے کہ ۱۹۵۶ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں اور اسرائیلیوں نے نہر سوئز پر قبضہ کرنے کے لیے مصر پر فوجی حملہ کر دیا تھا مگر امریکہ نے یو این او میں غل غپاڑا مچا کر جنگ بند کرا دی اور نہر سوئز مصریوں کے قبضے میں واپس دلوائی. عبدالفتاح الدیدی کہتے ہیں کہ روس نے بھی مغربی طاقتوں کو جنگ کی دھمکی دی تھی اور مصر کا ساتھ دیا تھا.

مگر میں اس معاملے میں کچھ نہیں بول سکتا کیونکہ ۱۹۵۶ء کو گزرے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے اور مجھے

یاد ہے کہ ہمارے ملک کے ایک سابق وزیر اعظم نے اس جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی طرف سے نہ صرف یہ کہ مسلمان مصریوں کی کوئی عملی طرفداری نہیں کی بلکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں اور اسرائیلیوں کے اس کھلے اور غیر منصفانہ حملے کی شدید مذمت بھی نہیں کی تھی جس کے نتیجے میں آج تک مصر میں پاکستانی مسافر کی آنکھیں نیچی نیچی رہتی ہیں، لیکن اس سے سابق وزیر اعظم کو کیا تعلق کیونکہ ان کی آنکھیں امریکنوں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں تو اونچی رہتی ہوں گی۔

ہاں مادام تم بہت کچھ جانتی ہو، کم از کم مجھے یہی کہنا چاہیے کیونکہ تمہارا ملک دنیا کا امیر ترین اور طاقتور ترین ملک ہے جس سے دھونس کھانا ہمارا اخلاقی اور قومی فرض ہے۔ اور جس سے دھونس کھائے جانا ہماری قومی ضرورت ہے۔ بس میں تمہاری جنرل نالج یعنی معلومات عامہ سے مرعوب ہوتے ہوئے اس بُت کے سائے میں بیٹھ جاتا ہوں جو ایک غیر جانبدار اور بے حس پتھر کا ٹکڑا ہے۔ اس کا نام ابُوالہول ہے جسے تم سی فینکس کہتی ہو، اس کی عمر مجھے معلوم نہیں اور صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں، نہ محققین کو نہ مورخین کو نہ ہزاروں برس پُرانے فراعنہ کو معلوم تھی کیونکہ یہ ان سے بھی قدیم ہے یعنی سینیئر ہے، بھئی سینیئر آدمی کی بھی کیا بات ہوتی ہے، یہ رکھ رکھاؤ یہ سنجیدگی یہ خاموشی جس کے مطلب ہزار بھی ہوسکتے ہیں اور کچھ بھی نہیں! اور ان کی شان بھی جنگل کے بادشاہ شیر جیسی ہوتی ہے جیسے ابوالہول کی شان ہے۔ ابوالہول ۱۹۰ فٹ بلند ہے اس کا چہرہ انسان کا اور دھڑ اور پنجے شیر کے سے ہیں، شاید مغرور فرعونوں یا دل جلے غیر فرعونوں نے اس کی خاموشی پر غصہ اس طرح اتارا ہے کہ اس کی ناک شکستہ کردی ہے جیسے آجکل گھونسا مار کر ناک توڑ دیتے ہیں مگر باقی کچھ نہیں بگاڑ سکتے یا ممکن ہے یہ کام صدیوں کا ہے۔ صدیاں جو فرعونوں سے بھی زیادہ طاقتور اور بدماغ ہوتی ہیں۔

ابُوالہول کم از کم فرعونوں کے چوتھے خاندان سے یہیں بیٹھا ہے یعنی کوئی پونے تین ہزار برس قبل مسیح سے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عمر کم از کم ساڑھے چار ہزار برس ہے، اب ہماری دیدہ دلیری دیکھیے کہ ہم اتنے سینیئر آدمی کے سامنے ٹائی لگائے بغیر ایسے ہی سفری کپڑوں میں اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے تھے اور تصویر کھنچوا رہے تھے۔ مگر اس نے ہم جیسے لاکھوں اور کروڑوں جونیئر اور سینیئر ہنس کر ٹال دیے ہیں۔ چونکہ ابوالہول اہراموں سے بھی زیادہ پرانا ہے، اس لیے اس نے فرعون خوفو کو ضرور دیکھا ہوگا، جس نے یہ بڑا اہرام بنوایا تھا۔ خوفو دو ہزار سات سو برس قبل مسیح میں تیسرے خاندان کا سب سے بڑا اور طاقتور فرعون تھا جس نے آس پاس کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے اور بے اندازہ دولت جمع کی تھی تاکہ مرنے کے بعد

اس کے کام آئے۔ گویا وہ ہمارے سرمایہ داروں کا ہم خیال تھا کیونکہ اس زمانے کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ مرنے کے بعد مال دولت نوکر چاکر غذا مل فیکٹریاں سب دوسری زندگی میں کام آتے ہیں۔

ہائے یہ کتنا پیارا اور قدیم عقیدہ ہے جسے آجکل کے وہ بزعم خود غلط دانشور اور عوام نہیں مانتے جنھیں دولت جمع کرنی نہیں آتی ـــ ہاں تو پیارے ذرا بتاؤ تو سہی کہ خوفو کیسا لگتا تھا کیا وہ بیس پچیس فٹ کا لمبا تڑنگا، اور طاقتور آدمی تھا یا ہم جیسے معمولی قد و قامت کا تھا۔ وہ بات کیسے کرتا تھا۔ چلتا کیسے تھا۔ کیا اس کی تلوار سے شرارے نکلتے رہتے تھے یا اس کی آنکھوں میں ایٹم بم کی طاقت تھی جو اس نے لاکھوں غلام اپنے اہرام کے بھاری پتھر کھینچنے پر لگا دیے اور وہ غلام برسوں پتھر کھینچتے رہے اور جانیں دیتے رہے لیکن کسی کو اس کی جان لینے کی ہمت نہ پڑی یا اس زمانے کے لوگوں میں سماجی شعور نہیں تھا اور یہی اس پیچھے خوفو کی طاقت کا سبب تھا!

اور ملکہ قلوپطرہ تو تمہارے لیے کل کی بات ہے ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ مائی ڈیئر کہ آخر قصہ کیا تھا۔ اس میں بات کیا تھی کہ سیزر اور انطونی اور سیکڑوں دوسرے سردار اور عامی اور حبشی اور عرب سورما اس کے حضور میں ایک شب گزارنے کی قیمت اپنی گردنیں کٹوا کر پیش کرتے تھے یعنی کوئی چکر تو ہو گا اس کی آنکھوں میں کوئی سحر تو ہوگا اس کے بدن میں کوئی کشش ضرور ہو گی یا اس کی پبلسٹی ہی ہالی وڈ کے انداز سے ہوئی ہے مگر ابوالہول جواب نہیں دیتا۔ ایسے بے وقوف سوالیوں کو منہ لگانے سے کیا فائدہ جو اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں اور دوسروں کی آنکھوں سے رہنمائی کی بھیک مانگتے ہیں۔

چنانچہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ یہ ابوالہول مکے پیچھے کھڑے تین اہرام اپنی عظمتوں اور قدامتوں کا بوجھ ہماری پشتوں پر لادنا چاہتے ہیں مگر ہم آج انھیں لفٹ نہیں دیں گے یعنی گھاس نہیں ڈالیں گے۔ جہاں انھوں نے ہمارا اتنا انتظار کیا، اور دو چار روز کرلیں کیونکہ اب شام ہوتی جاتی ہے اور ہمیں مدینۃ الفنون پہنچنا ہے جہاں ایک پرائیویٹ نشست میں پوری دنیائے عرب کی مشہور گلوکارہ ام کلثوم آ رہی ہیں۔

مدینۃ الفنون قاہرہ کا ایک بہت پرانا محلہ ہے جس کی اندھیری گلیاں اور مدھم روشنیاں پرانے یورپین افسانوں میں لے جاتی ہیں۔ گلیوں کے اندر پیچیدہ اور اونچی عمارتوں میں مصور اور شاعر اور افسانہ نگار رہتے ہیں یہاں کئی گھر مشہور فرانسیسی اور اطالوی مصوروں کے نام سے منسوب ہیں ان میں سے کئی یہاں مدتوں رہ کر گئے ہیں اور کچھ کے شاگردوں اور غائبانہ عقیدتمندوں نے مکانوں، کمروں

یہاں تک کہ دروازوں اور کھڑکیوں کو بھی ان سے منسوب کر دیا ہے۔

ہم ایک نسبتاً کشادہ اور روشن ہال میں پہنچے جہاں مصری ادیب، مصور، ناقد اور موسیقی کے دلدادہ جمع تھے۔

"آپ ہمارے پاکستانی مہمان ہیں "

"اہلاً وسہلاً۔ مرحبا"

"اہلاً"

"آپ اُم کلثوم ہیں۔ بلبلِ مشرق اُم کلثوم"

"اہلاً"

اُم کلثوم خود نہیں گائیں لیکن ان کا ایک ریکارڈ بجایا گیا، جس عقیدت و احترام سے مصریوں نے ان کے گانے کا ریکارڈ سنا وہ ایک عجیب وغریب اور نا قابلِ فراموش نظارہ تھا، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا مذہبی پیشوا یا پیغمبر الہامیہ کلام سنا رہا ہے۔

اُم کلثوم ایک بہت منکسر المزاج اور باوقار خاتون ہیں۔ وہ یقیناً نوجوان یا جوان نہیں ہیں مگر شاید اپنی شہرت اور حیرت انگیز آواز کے پس منظر میں جاذبِ نظر بہت ہیں۔ ان کی آواز بیک وقت رسیلی اور بلند ہے اور ماہرین کہتے ہیں کہ وہ کلاسیکی موسیقی کے مشکل سے مشکل مقامات سے اس طرح گزر جاتی ہیں کہ سننے والوں کو ان دشواریوں کا پتا بھی نہیں چلتا۔ ان کی آواز سروں کی روشنی میں پیدا ہوئی ہے اور ان کی تانیں سوچ کی سی تمازت پیدا کر دیتی ہیں۔ ہاں وہ عیرت ناہید تو نہیں مگر یہ سچ ہے کہ ان کی ہر تان دیپک اور ان کی آواز میں شعلے سے لپکتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اُم کلثوم ایک دیہاتی حافظ قرآن کی بیٹی ہیں اور پہلے پہل انھوں نے قرأت ہی سیکھنی شروع کی تھی۔ مجلس میں ایک صاحب تھے جنھوں نے دعویٰ کیا کہ اُم کلثوم کو قرأت کرتے، جن بہت کم لوگوں نے سنا ہے ان میں وہ بھی ہیں۔ اور یہ کہ جب وہ قرآن قرأت سے پڑھتی ہیں تو سخت سے سخت غیر مذہبی انسان کے بھی آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور وہ دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

مصریوں کے لیے اس ماضی حال اور مستقبل کی یادوں، ہنگاموں اور بے یقینیوں میں اُم کلثوم کی آواز کتنا بڑا سہارا کتنا شیریں اور لطیف آرام ہے۔ اور اُم کلثوم لکھ پتی ہو گئی ہیں۔

اُم کلثوم زندہ باد

"کیا کل آپ قاہرہ یونیورسٹی دیکھیں گے جس کی عمارات اور انتظام بے مثال ہیں "

"جی نہیں، یعنی کل نہیں"

"یا آپ مینار جزیرہ دیکھیں گے جس کی بلندی ستاروں سے باتیں کرتی ہے۔"

"جی نہیں"

"تو پھر آپ چل کر قصر النیل ریستوران میں کھانا کھایئے اور آرام سے سوچیے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔"

قصر النیل اسی نام کی سڑک سے گزر کر دریائے نیل کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے گھاس کے لمبے لمبے تختوں پر بچھی ہوئی کرسیوں اور میزوں پر مشتمل ایک ریستوران کا نام ہے یوں اس کی عمارت بھی ہے لیکن وہ جاڑوں میں کام آتی ہوگی۔ یہ گرمیوں کا زمانہ ہے سامنے یعنی پاؤں کے نیچے دریائے نیل بہہ رہا ہے اور اس کے کنارے موڑھے کرسیوں پر بیٹھے ہلکے گھاس کے تختوں پر لیٹے ہوئے لوگ مشروبات پیتے اور کھانا کھاتے ہیں، اور محبت کرتے ہیں۔

میں نے جھک کر نیل کا پانی چلو میں لیا اور غور سے دیکھا عام گدلا گدلا سا پانی تھا۔ میں پی نہ سکا۔ کلی کی اور پانی بہتے ہوئے دریا میں مل گیا۔ مگر پھر میں نے دوسری لہر میں سے ایک چلو بھرا اور غٹ غٹ پی گیا۔

"میں نیل اور دجلہ اور فرات کا پانی پی چکا ہوں،" میں نے فخریہ کہا اور پھر اس بوگس بات پر بہت شرمایا لیکن امریکی خاتون کی نظر میں میرے لیے سخت احترام اور تقدس جھلک رہا تھا

"آپ دریائے سندھ کی وادی سے آئے ہیں بلکہ گنگا کی وادی سے بھی - ہمارا حال دیکھیے اپنے مسسی سپی سے ہمیں سخت عشق ہے۔ مگر اس کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کبھی اس کے کنارے کوئی اسکندر، کوئی صلاح الدین کوئی ونڈرفل بڑی پرسنے لیٹی یعنی شخصیت گزری ہے۔"

"اگر گزری ہوتی تو اس سے آپ کو کچھ فائدہ ہوتا؟ یعنی آپ کے پاس تو ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔"

"وہ تو میری والدہ کی یاد میں بنی تھی اور وہاں سے گزرا کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ بس میں جب چونتیس نمبر گلی میں جاتی ہوں تو سر اٹھائے بغیر یعنی بغیر اوپر دیکھے ہوئے اس کے آگے سے گزر جاتی ہوں۔"

"آہ ڈیئر ڈوروتھی بیگم تمھیں نہیں معلوم کہ ہم نو ہزار میل دور سے بھی اس ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے آگے عقیدت سے سر جھکاتے ہیں جسے تم دیکھے بغیر روز گزر جاتی ہو۔ ہمیں اپنے سندھ یعنی تمھارے بقول انڈس کی وادی میں جو بت بانڈ ھنے ہیں ان کا غم ہمیں اس کے فخر قدامت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ آہ میڈم - میں تم سے سیاسی باتیں نہیں کرنی چاہتا۔ میں جذباتی ہونے والا ہوں۔"

پھر میں جذباتی ہو کر خاموش ہو گیا اور پھر جذباتی بھی نہیں رہا۔ مگر اب میڈم جذباتی ہو رہی تھیں۔

"اچھا تو مسٹر عالی وٹ از دس یعنی یہ سب کیا قصہ ہے، یہ نیل کب سے یونہی بہہ رہا ہے اور لوگ آتے اور چلے جاتے ہیں۔ قبائلی سردار اور فرعون اور بادشاہ اور شہزادے اور غیر ملکی اور مقامی حکمران اور سیاح مگر یہ بہے جاتا ہے۔ کیا دریاؤں پر زندگی یعنی تاریخ کے دل خراش واقعات کا اثر نہیں ہوتا۔ یعنی اس طرح جیسے وہ جاندار چیزیں ہوں اور جن پر قائم شدہ اثرات کا پتا چلایا جا سکے۔"

میں نے دیکھا کہ اب ڈر دکتی بیگم مشرق کے افسوں کا شکار ہوتی جاتی ہیں۔ عبدالفتاح الدیدی جو بور ہو چکے ہیں، آنکھیں بند کیے غنودگی کا مزا لے رہے ہیں اور نیل بہہ رہا ہے اور دولت مند مغربی خاتون مشرقی فلسفے کے بند اور پر اسرار دروازے چھو رہی ہیں اور میں، شاید میں سامری کی طرح کوئی ساحر بنتا جاتا ہوں جو ابھی چٹکی بجائے گا۔ اور نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کو انگشتِ شہادت پر کھڑا کر کے دکھا دے گا جس سے ڈر کر یہ خاتون دریائے نیل میں کود پڑیں گی۔

مگر ابھی تو ہمیں مصر کی اُن جاتی تاریخی دیواروں کو پھاندنا ہے جس کے لیے میرے ساتھ ایک بیش قیمت کیمرے اور بہت سارے فلموں والے ساتھی کا رہنا ضروری ہے۔

خوابِ زلیخا

مصر اتنا قدیم، اتنا جدید اور اتنا دلچسپ ہے کہ یا تو یہاں کم از کم چھ مہینے گھوما جائے یا بالکل انتخابی سیاحی کی جائے اور وہ بھی اٹکل پچو قسم کی کیونکہ پروگرام بنانے کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑا تھوڑا سب کچھ دیکھ لو مگر جی بھر کے کچھ بھی نہ دیکھ سکو۔

میں نے بہت سے سیاح دیکھے ہیں جو بڑے سنجیدہ اور متین ہوتے ہیں۔ اور ہر بات ہر شے میں نہایت گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایک پتھر کے آگے پہروں کھڑے اسے گھورتے رہتے ہیں۔ اس کی عبارات بڑے غور سے پڑھتے ہیں اور غور کے بعد فکر کرتے ہیں اور فکر کے بعد آرام اور آرام کے بعد پھر معائنہ اور غور اور فکر۔

مگر ایسے لوگ سال کے سال باقاعدہ سیاحی فرماتے ہیں گویا یہ پیشہ ور سیاح ہیں جو یا تو گیارہ مہینے دام جمع کرتے رہتے ہیں اور ایک مہینے کی چھٹی میں ایک پرانا تاریخی ملک جی بھر کے دیکھنے کو نکلتے ہیں یا امیر کبیر طبقے کے افراد ہوتے ہیں جو سارے سال گھومتے رہتے ہیں یا سارے سال آرام کرتے رہتے ہیں اور ایک مہینہ گھومتے ہیں۔ مگر آپ جانیے امیر کبیر لوگوں کے بارے میں کوئی قاعدہ کلیہ مرتب نہیں ہو سکتا، نہ جانے وہ کب کیا کرتے ہیں اور کب کیا نہیں کرتے۔

ہاں تو بھئی میرے پاس تو آٹھ دس دن ہیں، ورنہ ان آٹھ دس دنوں میں ناممکن ہے کہ میں سارے فرعونوں، سارے خلفا، سارے سلطانوں، سارے ترک گورنروں اور فرانسیسی اور برطانوی حکام کی یادگاریں دیکھ لوں اور جمال ناصر کی اصلاحات بھی سمجھ لوں اور قاہرہ اور اسکندریہ اور لکسر اور نوبیا کے شہر اور آثار کی سیر بھی کر لوں۔ اور نہر سوئز میں غوطے بھی مار لوں اور اپنی سہیلی ڈروتھی بیگم سے جھک جھک بھی کرتا رہوں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت کراچی کی زبان میں کراکی یعنی دلّی کی زبان میں پھوسکا بھی ہوں۔ ایک فقرہ دکانداروں کیلئے ملاحظہ کیجئے۔

"لیث اندی دراہم ۔ اجنبیۃ" (میرے پاس زیادہ غیر ملکی کرنسی نہیں ہے)۔
مگر نیل کے پانی میں ایسا جادو ہے جو شوقین روحوں کو مصر کی فضاؤں میں تحلیل کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ہر دور اور ہر مقام کو چھو لیتی ہیں۔
میدان سلیمان پاشا کے بالکل سامنے ایک نہایت خوب صورت ریستوراں ہے ، جس کا نام ہے کیفے جروپی مگر اسے مصری گروبی کہتے ہیں ۔ کیونکہ دیگر عربوں کے برخلاف وہ نہ صرف گاف کی آواز ادا کر سکتے ہیں بلکہ جیم کو بھی گاف ہی کے تلفظ سے ادا کرتے ہیں ۔
" گمال عبدالناصر (جمال عبدالناصر)"
" گبرائیل (جبرائیل)"
" گبرالتر (جبرالٹر)"
یہی نہیں بلکہ قاف کو عین کی طرح ادا کرتے ہیں ۔ یعنی المقطم کو المعطم کہیں گے ۔ قصر کو عصر ۔ قبلہ کو عبلہ ۔
کیفے گروبی ہمارے کافی ہاؤس کے مماثل ہے یعنی یہاں زیادہ تر صحافی ادیب قانون داں مصور غرض یہ کہ انٹلکچوئل قسم کے لوگ آتے ہیں ۔ لیکن یہ ایک خاصا مہنگا ریستوراں بھی ہے ۔ کھانے عمدہ اور مہنگے اور فرنیچر جدید اور آرام دہ ہے ۔ ہمارے ماحول اور اس کے ماحول میں فرق یہ ہے کہ یہاں ملکی سیاست حاضرہ پر آزادانہ سوال جواب نہیں ہو سکتے ۔ مگر یہ فرق صرف کافی ہاؤسوں کا ہی نہیں ہے بلکہ ——
بات پہنچی تری جوانی تک
آؤ بھائی آؤ بحث مت کرو یعنی جدید حالات پر سوال مت کرو ۔ بلکہ قہوہ پیو ۔ چھوٹے چھوٹے فنجانوں یعنی پیالیوں میں گرم گرم گاڑھا گہرے رنگ کا قہوہ کیا بھلا معلوم ہوتا ہے اور یہ کیوی یار یعنی مچھلی کے انڈے جنھیں عربی میں بطارخ کہتے ہیں ۔ بطارخ سے اچھا نام تو بیضہ ماہی لگتا ہے مگر وہی بات کہ ناموں میں کیا دھرا ہے ماہی فارسی کا لفظ ہے ۔ عرب کیوں بولنے لگے ۔ کیونکہ ایرانیوں نے کبھی اصلی عربوں پر حکومت نہیں کی ۔
" ایران نے ریاست اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے "
معلوم ہوتا ہے قاہرہ میں قیامت آگئی ۔ اخبار ریڈیو چیخ رہے ہیں ۔ مسجدوں میں ہیجان بپا ہے سب صحافی اور ادیب اور مصور اور قانون داں گروبی میں صرف اسی مسئلے پہ بحث کر رہے ہیں کہ ایران کو اس جرم کی کیا سزا دی جائے ۔ عرب قومیت کا تازہ تازہ خون جذباتیت کی آنچ پر ڈنٹ رہا ہے ۔ ویسے ایرانیوں اور عربوں کے قضیے آج کے نہیں بلکہ دار یوش کے زمانے سے شروع ہو گئے تھے جسے کئی ہزار برس

گزرے۔

صدر ناصر نے ایرانی سفیر کو چوبیس گھنٹے میں مصر سے نکل جانے کا حکم دے دیا ہے اور ایران سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔ ہاں بھائی ایران اور مصر آزاد ممالک ہیں جو چاہیں کریں ہر ملک کو اپنے حالات و مفادات کے پیش نظر اپنی خارجہ پالیسی بنانے کا حق ہے لیکن یہاں اسلام کا نام زیادہ اُچھل رہا ہے اس لیے ہمیں کشمیری مسلمانوں کا خیال آجاتا ہے۔ ہمارا اسلامی بھائی مصر اس بیسویں صدی میں چالیس لاکھ مسلمانوں کو حق خود اختیاری سے محروم دیکھ رہا ہے اور بھارتی سفیر قاہرہ میں دندنا رہا ہے اور پورے مصر میں ایک بڑی اسلامی آبادی کے ساتھ اس کھلی ناانصافی کے خلاف کوئی موثر آواز نہیں اُٹھتی۔ ہم پاکستانی اب بھی ریاست اسرائیل کے وجود کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کرتے ہمارے پاسپورٹ پر لکھا ہوتا ہے "تمام دنیا کے ممالک کے لیے کارآمد ہے سوائے اسرائیل کے" جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی پاکستانی شہری اسرائیل جا ہی نہیں سکتا۔ ہم ہر معاملے میں اسرائیل کے خلاف عربوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ من حیث القوم یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور مصری کشمیر کے معاملے پر سفارتی تبسم کے علاوہ کوئی اور ردعمل ظاہر نہیں کرتے۔

میاں برخوردار یہ بین الاقوامی سیاست کی گتھیاں ہیں تم نے انھیں سلجھانے کے لیے کیفے گروپی ہی کا انتخاب کیوں کیا ہے بعض مناظر ایسے ہوتے ہیں جنھیں دیکھنے سے نہ دیکھنا ہی بہتر ہے آؤ ادیبوں سے ملو اور صرف ادب کی باتیں کرو۔ دیکھو یہ انیس منصور ہیں اخبار "الیوم" کے ادبی ناقد اور یہ عبدالفتاح البارودی ہیں جو اسی اخبار کے ناقد الفنی ہیں مصوری اور موسیقی پر تبصرہ کرتے ہیں اور یہ مشہور ناول نویس عبدالرحمان الشرقاوی ہیں جو "الجمہوریہ" میں کام کرتے ہیں اور یہ عبدالعزیز فہمی ہیں جو سیاسی تبصرے کرتے ہیں اور وہ سامنے توفیق الحکیم بیٹھے ہیں، سرکاری اعزاز نشان الجمہوریہ مل چکا ہے ان کے ناول اور ناٹک بہت مشہور ہیں اور ان کے ساتھ محمود تیمور مصروف گفتگو ہیں جو خود بڑے مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں چھوٹے چھوٹے ادیبوں میں ناول نویس احسان عبدالقدوس اور یوسف الصباعی اور نہ جانے کون کون اس کیفے میں آتا ہے۔ لیکن کسی کی آنکھوں میں شوخی اور آزادی کی چمک نظر نہیں آتی۔ یہ ملک کمیونسٹ نہیں ہے جہاں یک خیالی اور یک زبانی کی جبری تربیت دی گئی ہو۔ مگر بولنے والے۔ اور لکھنے والے۔ کسی قدر مختلف انداز سے ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں یا اگر کوئی آزاد سوال کیا جاتا ہے تو خاموش ہو جاتے ہیں۔

مصر بہت قدیم اور دلچسپ ہے۔ جہاں قومیت کی تند و تیز لہروں نے غیر ملکی سامراجیت اور بادشاہت

کی چٹانیں پاش پاش کر دی ہیں اور پاکستان میں اب تک غیر ملکی سامراجیت اور مقامی جاگیرداری کے دیوتا پوجے جاتے ہیں مگر پاکستان کی فضاؤں میں آزادہ روی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ نہیں جناب میرے ملک میں صدر اور وزیر اور گورنر تنقید سے نہیں بچ سکتے۔ تلخ اور کڑی تنقید یہاں تک کہ غیر ذمہ دارانہ تنقید، طنز اور مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ مقامی سرکاری اداروں اور افسروں کو تو جب کوئی چاہے کسی بھی جائز یا ناجائز وجہ سے رگڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بس سر پٹکیں گا ایران اور عراق اور مصر مگر رہوں گا پاکستان میں۔ اس معاملے میں فقط حب الوطنی ہی کا دخل نہیں ہے۔ بلکہ حالات کا اثر بھی بہت ہے۔ کاش وہ پاکستانی دانشور جو اپنے ملک کی ہر بات سے غیر مطمئن بیٹھے ہیں کسی طرح مشرق اوسط کے ممالک کی سیر کر آئیں۔ فرانس اور برطانیہ سے دوسری پیاس بڑھتی ہے سو ابھی مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

عمر کوتاہ و قصہ طولانی

اپنے ذرو فتی بیگم خواص کے تذکرے سے نکل کر عوام میں چلیں مگر قصہ یہ ہے کہ عوام تو سب پس ماندہ ملکوں کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ یہ تمہارے عوام نہیں کہ گاؤں کے ہر گھر میں بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن، اور ٹیلیفون اور باہر کار اور ٹریکٹر موجود ہیں۔ یہ تو پس ماندہ علاقہ ہے افریشیا کا خطہ جہاں دیہاتی ابھی تک۔۔۔ ہوگا۔ دیہاتی ہے پاکستان میں اس کا نام ہاری ہے اور مصر میں فلاح جس کی جمع فلاحین ہے۔

مصر کی تریسٹھ فی صد آبادی کل ملک کے ساڑھے تین فیصد حصے یعنی دریائے مصر کے ڈیلٹا میں واقع ہے، اور اس آبادی کا بیشتر حصہ کاشتکاری کرتا ہے۔ فلاحین ہاریوں کی طرح سخت کوشی میں مبتلا ہیں۔ وہ پنجابیوں کی طرح خوش مزاج، پٹھانوں کی طرح مہمان نواز، سندھیوں کی طرح سادہ دل اور بنگالیوں کی طرح حساس ہیں۔ یا شاید یہ سب خصوصیات سبھی مزارعین میں پائی جاتی ہیں۔ مگر سخن سازی کو تخصیصی مثالیں بری نہیں ہاں سب ملکوں کے پس ماندہ دیہاتی ایک جیسے ہیں۔ محنت کش اور مکلف الطبع اور خود وارد اور ترقیات کی طرف سستی سے بڑھنے والے نئے خیالات نئے منصوبوں کو مشکل سے قبول کرنے والے، روایت پرست، جہالت کے مارے ہوئے، جن کے آگے سبھی استحصال پسند۔ اور سیاست کے مداری باری باری ڈگڈگی بجا کر اپنا کھیل دکھاتے ہیں اور مجمعے لگاتے ہیں۔

فلاحین کی عورتیں عام طور پر سیاہ لباس پہنتی ہیں۔ اور کام کے اوقات کے علاوہ سفید یا گہرے نیلے رنگ کی عبائیں اور بڑے بڑے سفید عمامے پہنتی ہیں۔ عورتیں برقع نہیں پہنتیں اور نقاب نہیں ڈالتیں مگر اجنبی کو دیکھ کر منہ پر چادر کا کونا کھسکا لیتی ہیں۔ ان عورتوں کی عام خوراک مکئی کی روٹی اور

پھلیاں ہیں۔ اوسط درجے کے خوش حال دہی اور ملائی بھی کھا لیتے ہیں۔ لیکن گوشت بے چاروں کو بہت کم نصیب ہوتا ہے۔

عبدالفتاح الدیدی نے ایک دن بڑے جوش و خروش سے صدر ناصر کی زرعی اصلاحات کا ذکر کیا تھا۔ نگران کی تقریر کے اعداد و شمار ہمیں یاد نہیں رہے۔ مختصراً اتنا یاد ہے کہ نوابوں اور جاگیرداروں یعنی پاشاؤں کی ملکیت ختم کر دی گئی ہے۔ مگر آج یہ کچے گھر یہ گندے جوہڑ اور تالاب خوشحالی کی مثال ہیں تو کل کیا ہوتا ہوگا۔ اگر آج فلاحین کی یہ حالت پہلے سے یعنی شاہ فاروق کے زمانے سے بہتر ہے تو نہ جانے خراب حالت کیا ہوتی ہوگی۔ بہرحال بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کے لیے کچھ تو ہوا۔ آج کچھ ہوا ہے۔ کل زیادہ ہوگا اور پرسوں اس سے بھی زیادہ۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسانوں کی بہتری کے لیے کوئی بات کی جائے تو اس کا تذکرہ اس طرح کیا جاتا ہے جیسے ان پر کوئی احسان عظیم کر دیا گیا ہے جبکہ سب روٹی اپنی محنت کے طفیل کھاتے ہیں اور ان کے بغیر کسی ملک کی معیشت ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اللہ اکبر کیا دنیا ہے اور یہ دنیا آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ کسی کو اس کا حق بھی دو تو اسے احسان بتاؤ:

دُنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

مگر عزیزم بات پھر بڑھ جائے گی اور بنیادی انسانی حقوق تک پہنچے گی جن کا تصور افریشیا تو کجا نہایت ترقی یافتہ ممالک میں بھی پوری طرح واضح نہیں ہے اور جو بہت سے ملکوں میں حزب موافق اور حزب مخالف کے لیے ڈھولوں تاشوں اور نفیریوں کا کام دیتے ہیں اور دیکھا یہی گیا ہے کہ آج کے مصلحین کل کے استحصال پسند ہو جاتے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں کسی قوم کسی جماعت کسی فرد کے مسائل باہر والے طے نہیں کر سکتے بلکہ جب صحیح حل آتا ہے تو اندر ہی سے آتا ہے مگر اس وقت بہتر یہی ہے کہ اپنی ناچیز رائے کو طاق پر رکھ کر اس ملک کو دیکھ لیا جائے جس میں مغرب اور جنوب کے صحرا بھی ہیں، جہاں کل آبادی دس لاکھ کے قریب ہوگی اور جہاں دشت مشرق ہے جس میں اونٹ اور بدو آج بھی سارے سال خانہ بدوشی کرتے ہیں۔ وہ سوئیز اور سینا کا علاقہ ہے جہاں نہ دریا ہے نہ اچھی بارش نہ ہموار میدان۔ پہاڑیاں سات آٹھ ہزار فیٹ تک بلند ہوتی ہیں۔ مگر خشک اور تا حال بے فائدہ ہیں کہتے ہیں اس علاقے میں بے شمار معدنیات ہیں مگر ابھی تک ان کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکا۔

ہائے میری جہالت! جہاں حضرت موسیٰ نے جلوۂ خداوندی دیکھا تھا اس جگہ کو میں بیسویں صدی کی اقتصادی عینک سے دیکھ کر بے فائدہ کہہ رہا ہوں۔ سچ ہے مادہ پرستی کی چکا چوند چشم کی آنکھوں کو خیرہ اور دل

کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے

ہائے عبدالفتاح الدیدی تم اس وقت کہاں ہو؟ یہ ڈروتھی بیگم کرائے کے رہنماؤں کے چکر میں پھنس گئی ہیں اور میوزیم اور الازہر اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا چاہتی ہیں اور میرے پاس اتنا زرمبادلہ نہیں کہ میں ٹیکسی اور گائیڈ کے اخراجات میں شرکت کروں اور عورت سے خرچ کرانا مغل بچوں کو زیب نہیں دیتا۔

تو آج میرے سر میں درد ہے پہلے جھوٹا تھا یعنی ڈروتھی بیگم کے لیے تھا مگر اب سچ مچ ہو رہا ہے اور شہر میں اتنا سخت حبس ہے کہ ہوٹل کے گرم کمرے میں بیٹھا نہیں جاتا۔ ڈروتھی بیگم صبح سے غائب ہیں اور اب شام ہو گئی ہے اور قاہرہ کی روشنیاں جھلک جھلک کر کہتی ہیں کہ

مے خانے میں چل

اس لیے اب میں کچھ دُور پیدل اور پھر بس میں گزا کے ویرانے میں اپنے دوست ابوالہول سے ملنے جاتا ہوں جو اس وقت روشن ہوگا اور جس کے پیچھے تین اہراموں کے پہرے دار کھڑے ہیں۔

ابھی میں نے یورپ نہیں دیکھا تھا یعنی یہ کہ لندن اور پیرس کے شہر نہیں دیکھے تھے جن کی روشنیاں اور راتیں مشہور ہیں لیکن قاہرہ کی روشنی اور رات کچھ کم معلوم نہیں ہوتی۔ عورتیں اسکرٹ پہنے عاشقوں یا شوہروں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ریستورانوں، کلبوں اور تھیٹروں میں جا رہی ہیں۔ تھیٹر نے مصر میں ابھی بڑے پیمانے پر رواج نہیں پایا زیادہ کام ترجموں اور مہمان فنکاروں سے چلتا ہے لیکن اس کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ وہ سامنے ایک بلند عمارت میں بیلے ناچ کا اسکول ہے۔ بیلے خالص یوروپین رقص ہے جس میں کوئی خیال کوئی کہانی خاموش رقص کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ بھلا خاموشی کا بیلی ناچ والے مصریوں سے کیا تعلق۔ مگر

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں

ہاں کہیں بیلے ناچ اور بیلی ناچ کو املا کی غلطی پر محمول کر کے ایک نہ سمجھ لیا جائے۔ بیلی پیٹ کو کہتے ہیں اور مشہور مصری ناچ جو چھوٹے چھوٹے طبلوں کی تھاپ پر تیزی سے کیا جاتا ہے ایک نیم عریاں قسم کے رقص کا نام ہے جس میں تھاپ پر طرح طرح سے کولھوں اور پیٹ کو مٹکایا جاتا ہے۔ قصر عابدین میں بیلی ناچ غضب کا ہوتا ہے یہ شاہ فاروق کے محل کا پائیں باغ ہے۔ کھلا کھلا اور روشن۔ مہنگا بھی ہے سو کیا ہوا۔ بعض کوٹھے تو اس پورے محل سے زیادہ مہنگے ثابت ہوئے ہیں۔ گداز جسموں کی مصری دوشیزائیں طبلوں کی تھاپ پر تھرکتی ہیں اور آس پاس مصری نوجوان اور زعما اور غیر ملکی شوقین دل پکڑے بیٹھے رہتے ہیں

افسوس کہ میں دل کے بجائے جیب پر ہات رکھے بیٹھا ہوں۔ ہائے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

الازہر کے سائے میں بیلی ناچ ہمارے بہت سے علما کی سمجھ میں نہیں آئے گا، میری سمجھ میں بھی نہیں آتا مگر زندگی سب سے زیادہ طاقتور معلوم ہوتی ہے۔ ازہر سے بھی اور علما سے بھی۔ ایک لطف کی بات یہ ہے کہ ناچ دیکھنے والوں میں سے بہت سے حضرات ہاتھوں میں تسبیحیں لیے بیٹھے ان کے دانے گھما رہے ہیں مگر تسبیح گھمانے کا مطلب یہ نہیں کہ آیات قرآنی یا متبرک الفاظ پڑھے جا رہے ہیں، تسبیح گھمانا عربی ثقافتی زندگی کا ایک جزو ہے۔ جیسے پان کھانا یا بے سمجھے بوجھے قسم کھانا۔

اب یہاں سے ایک دم بھاگ کر چلو اور غور یہ سے پرانے قاہرہ میں داخل ہو جاؤ۔۔۔ جیسے لاہور میں مال روڈ ہوتے ہوئے ایک دم اندرون شہر پہنچ گئے۔ اور ایک نیا مصر ایک نیا قاہرہ نظر آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں میں سخت تیز روشنی سے لبریز بیش قیمت مقامی اشیا کی دکانیں ہیں۔ تانبے پیتل کا کام۔ چمڑے کا کام، فرعونوں کے مرقعے اور لکڑی پر کام۔ قلوپطرہ اور ملکہ نفرتیتی کے مرقعے، لاکٹ اور دوسرے زیورات۔ یہاں ٹورسٹ بہت لٹتا ہے۔ عام دکانیں چھوڑ کر خاص دکانیں ایسی بھی ہیں جہاں ہر چیز کی عمر چار ہزار برس بتائی جاتی ہے۔ یہ انگوٹھی فرعون رعمسیس (یا رامسیس) کی ہے۔ یہ ہار قلوپطرہ کی گرل فرینڈ کے مقبرے سے برآمد ہوا ہے۔ (شکر ہے کہ یہ ہار خود ملکہ قلوپطرہ اس دکان پر بیچنے کے لیے نہیں دے گئیں) ملکہ نفرتیتی کی یادگاریں یہاں سے بہت دور ابوسمبل میں بہت سی پائی جاتی ہیں۔ جہاں سے اُن کے مرقعے اور تصویریں اتار لی گئی ہیں اور لکڑی اور پیتل پر ویسا ہی کام بنایا گیا ہے۔ ایک مرقع جو زیادہ مہنگا ہے اور دیوار پر کھدائی سے لیا گیا ہے نہایت قدیم اور تاریخی ہے، اس میں ملکہ بیچ میں کھڑی ہے اور اس کے دونوں طرف دو مشہور دیویاں یعنی آئی سس اور آشور آسے آشیرباد دے رہی ہیں، اس ضمن میں لطیفہ یہ ہے کہ ابوسمبل اور بہت سے اہم آثار اسوان بند کی تعمیر کے ساتھ ساتھ غرق ہو جائیں گے، اس لیے یونیسکو کی مدد سے چندہ جمع کیا جا رہا ہے کہ پانی کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے انھیں ہٹا کر کسی اور مقام پہ محفوظ کر دیا جائے۔ ابوسمبل کے آثار اور اسوان بند۔ کیا تضاد ہے، ایک قدیم ترین اور دوسرا جدید ترین۔ مگر دونوں مہنگے اور دونوں عظیم ہیں۔

دیکھا آپ نے پھر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ مگر وہاں نہیں پہنچے جہاں کے لیے چلے تھے یعنی گزا کا ویرانہ جہاں بڑا سا اور بے زبان ابوالہول سرکاری روشنیوں کی نیرنگی میں ہمارا انتظار کر رہا ہے جس کے پیچھے وہ اہرام کھڑے ہیں جو ابھی تک میری بقراطی دسترس سے محفوظ ہیں۔

ماضی کے خدا

اس ہفتے میں جدید مصر سے بھاگ کر قدیم مصر کے دامن میں چھپ گیا ہوں۔ کیونکہ کبھی کبھی ماضی حال کی نسبت آرام دہ ہوتا ہے۔ اسے الٹو پلٹو اس پر تبصرہ کرو اچھا کہو بُرا کہو اس پر قہقہے لگاؤ وہ کچھ نہیں کہتا۔ چُپ چاپ ہاتھوں میں کھیلتا ہے۔ اور حال، حال بڑا نازک اکھڑ بدمزاج بے صبرا اور اگر طاقتور ہو تو خطرناک ہوتا ہے!

اب میں اہرام سقارا یعنی فرعون اعظم خوفو کے مقبرے کے سامنے کھڑا ہوں جو شاید آج بھی دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے اور اپنے وقت کی دنیا کے سب سے بڑے اور ظالم بادشاہ کا مقبرہ ہے۔ ابھی میں نے اس کے ایک پتھر پر ٹھوکر ماری اور دل کھول کر قہقہہ لگایا جس میں ایک لمحے کے لیے میرے سارے احساسات کمتری سارے عزائم اور ساری محرومیاں اور سارے دکھ سمٹ کر آ گئے تھے۔ ایک لحاظ سے میں نے فرعون خوفو کے منہ پر طمانچہ مارا اور اس کے مقبرے کی بے حرمتی کی مگر یہ اتنا بڑا اہرام یونہی بے بس کھڑا رہا۔ یہ اہرام جس میں تقریباً تیئیس (۲۳) لاکھ پتھر جڑے ہوئے ہیں جن کا اوسط وزن ڈھائی ٹن فی پتھر ہوتا ہے اور جن میں سولہ سولہ ٹن وزنی پتھر بھی شامل ہیں۔ یہ اہرام جس کا قد آج بھی یعنی چوٹی ٹوٹ جانے کے بعد بھی ایک سو سینتیس میٹر ہے اور جو تیرہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے اور جس کی عمر تقریباً ساڑھے چار ہزار برس ہے، میری ٹھوکر سے کر رہ گیا بلکہ لمحہ بھر کو خود میرے مزاج میں فرعونیت بھر دی۔ یہ اہرام دُنیا کے سات عجائبات میں سے ایک تھا یا اب بھی ہوتا۔ لیکن کبھی عجائبات کا قصہ عجیب ہے۔ پہلے ان کا ذکر بہت ہوتا تھا بلکہ ہمارے نصاب کی کتاب میں لکھا ہوا تھا "کہ دنیا میں سات عجائبات ہیں۔ دیوار چین، تاج محل، اہرام مصر......"

مگر اب شاید عجائبات کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور لوگ عجیب باتیں جانتے جانتے عجیب

چیزیں دیکھتے دیکھتے بور ہو گئے ہیں۔ اور اب بالکل سیدھی سادی زندگی کے طلب گار ہیں یعنی اپنے بزرگوں کی روش پر چلنا چاہتے ہیں جنھوں نے پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے اتنی بڑی دنیا میں سے اپنے لیے سات عجائب چن لیے تھے اور بس۔ دوسری بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں عجوبے بھی جلد جلد ظاہر نہیں ہوتے تھے، مصر میں فرعونوں نے اہرام بنا دیے اور مصریوں کو سیکڑوں برس کے لیے چھٹی ہو گئی۔ ہندوستان میں شاہجہاں نے تاج محل بنا دیا اور پورا ہندوستان عمر بھر کے لیے اس کی قصیدہ خوانی میں لگ گیا۔ اب قصہ یہ ہے کہ آج ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ بنی اور دنیا میں سب سے اونچی بلڈنگ کہلا کر عجائبات میں شامل ہونے لگی تو چالیس برس کے اندر اندر اسی نیویارک میں امریکیوں نے پان ایم کی کمرشل بلڈنگ بنانی شروع کر دی جو دنیا کی سب سے بڑی تجارتی عمارت ہو جائے گی۔ آج ایک اسپوتنک اڑا اور لوگ حیران ہوئے تو کل دوسرا لیونک اڑا اور پھر مونک اڑا یہاں تک کہ لوگوں نے حیران ہونا چھوڑ دیا۔ خود اپنے وطن کے شہر کراچی میں دیکھ لیجیے پہلے ایک ہی عجوبہ بنا جس کا نام لالوکھیت تھا اور لوگ حیران ہونا شروع ہی کر رہے تھے کہ دوسرا عمارتی عجوبہ بن گیا جس کا نام کورنگی کالونی ہے نتیجہ یہ کہ جدید نسل نے عجائبات کا قصہ ہی بھلا دیا ہے۔

اس حقیر کی رائے میں تو دنیا میں صرف ایک عجوبہ ہے اور وہ ہے آدمی جسے خدا نے بنایا ہے اور اس کے مقابلے کا دوسرا عجوبہ صرف خدا ہی بنا سکتا ہے۔

اہرام سقارا دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خوفو صاحب کے اختیارات بے حد وسیع تھے۔ نہ ہوتے تو وہ اکیلے اپنا اتنا بڑا مقبرہ کیسے بنا جاتے جس کے آگے میں اور ڈروتھی بیگم عرف امریکی سیاح خاتون عرف ثریا بانو کھڑے حیرت سے ایک ایک پتھر کے جناز کو دیکھتے اور عش عش کرتے ہیں۔ ہیروڈوٹس جو زمانہ قدیم کا یونانی سیاح ہے، روایتوں کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ صرف وہ سڑک دس برس میں بنائی گئی تھی جس کے ذریعے دریائے نیل کے کنارے سے پتھر اور دوسرا عمارتی سامان اس مقام یعنی گیزا تک پہنچایا جاتا تھا۔ پتھر دور دراز اسوان سے بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے لائے جاتے تھے اور ایک لاکھ آدمی صرف اس کی تعمیر میں پورے بیس برس تک لگے رہے یعنی نہ جانے کتنے لاکھوں کتنی کشتیوں کتنے مزدوروں نے صرف پتھر کھودنے اور یہاں تک پہنچانے کا کام کیا اور وہ سب اور یہ ایک لاکھ غلام تیس برس تک صرف ایک آدمی کا مقبرہ بنانے میں لگے رہے جو نہ کوئی شہر تھا نہ اسکول نہ کالج نہ اسپتال جس سے کسی اور کو بھی فائدہ ہوتا۔ یہاں صرف خوفو کی لاش رکھی جانی تھی۔ ایک آدمی کی لاش جس کے لیے ڈھائی گز زمین کافی ہوتی ہے۔

مگر۔۔۔ بے چارہ خوفو بھی کیا کرتا۔ مصری رواج کے مطابق ایک معقول فرعون کے لیے یہ لازمی تھا کہ

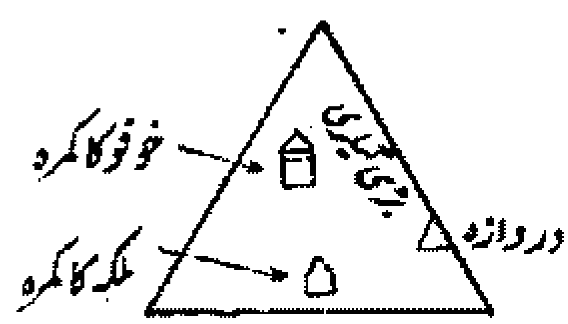
تخت نشین ہوتے ہی اپنے مقبرے کی تعمیر شروع کر دے جہاں اس وقت کے عقیدے کے مطابق وہ موت کے بعد پھر زندہ ہوگا اور اسے تمام ساز و سامان کی ضرورت پڑے گی۔

اس اہرام کا نام سقارا ہے لیکن اس کی بلندی کی وجہ سے اسے اُفق خوفو بھی کہا جاتا تھا۔ اُفق خوفو باہر سے پتھروں کا ایک تودہ ہے بڑے بڑے پتھر ایک دوسرے میں جمے ہوئے اُونچے ہوتے گئے ہیں اور بس۔ اس کے اندرونی راز صدیوں تک تاریخ کے اندھیروں میں محفوظ رہے یہاں تک کہ انیسویں صدی کے منچلے یورپی محققین نے برسوں کھدائیاں کیں اور قدیم تحریروں کو پڑھنا شروع کر دیا اور آج تک پڑھتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ہم جیسے ہما شما بھی خوفو اور رعمیسیس جیسے بڑے بادشاہوں کے زمانوں اور کارناموں سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔

مگر اصل میں یہ سب فس ہے Fuss یعنی فضول بحث۔ ان مقامات پر آدمی کو صرف عش عش کرنا چاہیئے فس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ فس کی عادت ہو جائے تو بسا اوقات نقصان ہو جاتا ہے۔

اچھا ذرو بخت بیگم اب میں بھی صرف عش عش کروں گا۔ آؤ اندر چلیں اور مزید عش عش کریں۔ اہرام کی شمالی طرف سے یہ اُونچا دروازہ ہمیں اندر لے جاتا ہے تو ایک الگ دنیا نظر آتی ہے غلام گردشیں، کمرے، ایک بڑی گیلری اور یہ شہنشاہ کا کمرہ ہے اس کی آرامگاہ، تمام کا تمام سنگ سفید کا بنا ہوا۔

گویا عظیم الشان مخروطی عمارت اندر سے کچھ یوں ہے۔



تو یہ ہے خوفو کا مقبرہ جس میں وہ اپنی فتوحات اور ٹیکسوں سے جمع کی ہوئی دولت، جواہرات اور لباس ساتھ لے کر موت کے بعد بھی شاہانہ زندگی گزارنے گیا تھا اور جس کی تعمیر میں کروڑوں روپے کے علاوہ لاکھوں غلام خرچ ہوئے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بیس برس تک ایک لاکھ غلاموں کی ایک ہی ٹیم کیسے کام کر سکتی ہے۔ ان میں سے ہزاروں طبعی موت مرتے ہوں گے، ہزاروں مختلف صدمات و حادثات کا شکار ہوتے ہوں گے اور ہزاروں کم خوراک اور شدید محنت کے سبب نڈھال ہو کر مر جاتے ہوں گے۔

کیوں ذرو بخت بیگم کیا تم اب بھی عش عش کر رہی ہو!

اب یہ باقی دو اہرام بوگس سے لگتے ہیں گو یہ بھی اپنی اپنی جگہ عظیم عمارتیں ہیں۔ سقارا کے بعد دوسرا نمبر خفرے کا ہے۔ خفرے یا شیفرین اور تیسرا نمبر مکدی ٹی اس کا لیکن مکدمی ٹی اس قد و قامت میں ان دونوں سے آدھا لگتا ہے۔ ہم شہرے خوفو کے دیکھنے والے ہم ان چھوٹے چھوٹے فرعونوں کے اور ان کے مقبروں کے رعب میں نہیں آئیں گے۔

ڈروتھی بیگم اہراموں کے تعمیری کمالات سے بہت متاثر ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ساڑھے چار ہزار برس پہلے کے مصریوں نے انجینئرنگ میں کیا مہارت حاصل کی ہوگی کہ یہ عمارتیں بنا گئے جو آج کل کے ماہرین تعمیرات کو حیران کر دیتی ہیں۔ ہاں یہ بات ٹھیک ہے ان سب کمالات کا سرچشمہ انسانی اپج اور فطانت ہے جو برابر کسی نہ کسی شکل میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اور ہوتی رہے گی۔ اہرام سے لے کر اسپوتنک تک خوفو سے لے کر مادام کیوری تک۔ بس دیکھنا یہ ہے ڈروتھی بیگم کہ انسان اس اپج اس طباعی اس فطانت کو کس کام کے لیے استعمال کرتا ہے۔ تم نے خوفو کی شان و شوکت دیکھ لی۔ آؤ تاریخ کے اسپوتنک میں بیٹھ کر زمن سے فرعونوں کے اس مصر میں واپس پہنچ جائیں جہاں ایک عجیب و غریب فرعون راج کرتا ہے جو موحد ہے یعنی ایک خدا کو مانتا ہے اور جس کی رسم ہے ترکِ رسوم۔

فرعون اخناتون چودھویں صدی قبل مسیح کا بادشاہ تھا اس کے زمانے میں مصر پر جادوگر، کاہن یعنی مختلف دیوی دیوتاؤں کے پجاری بُری طرح قابض تھے۔ سب سے بڑا معبود آمن تھا جو حاکم قوم کا خدا تھا۔ اور اس کے ساتھ بہت سے دیوی دیوتاؤں کا اثر پوری آبادی پر پھیلا ہوا تھا جن میں دیوی آئی سس اور دیوتا اوسیرس بہت اہمیت کے مالک تھے اخناتون کا اصلی نام آمحوطپ تھا اور وہ نو برس کی عمر میں ہی فرعون بن گیا تھا جب وہ نوجوان ہوا تو اس نے سب دیوی دیوتاؤں سے بغاوت پر کمر باندھ لی اور ایک نئے خدا کی پرستش شروع کر دی جو خالقِ کل تھا اور جو جسم اور زمان و مکان کی قید سے آزاد تھا شاید یہ خدا ابراہیم کا خدا تھا جو عرب اثرات کے ذریعے اخناتون تک پہنچا اور اس کی اپنی فکر اور جستجو نے حق سے اس پر اور اس کی وجہ سے پورے مصر پر روشن ہوا۔

کہتے ہیں کہ اس خدا کا نام تھا آتن یا عربی کا اللہ جو ایک ہے جو سب کا خالق ہے جو مادی عوامل اور مادی مظاہر سے بلند اور پاک ہے اور پھر بت پرست مصر کے ایک بڑے فرعون اخناتون نے تمام دیوی دیوتاؤں کے مندر ان کے آثار ان کی تصویریں، مرقعے کتبے ختم کرنے شروع کر دیے اور ایک غیر جسمی خدا کی تبلیغ کرتے کرتے سترہ برس حکومت کر کے ستائیس برس کی عمر میں مر گیا اور پھر اس کے بعد اس کے داماد

توت عنخ آمون نے اس کی تمام اصلاحات ختم کرکے رکھ دیں۔ اس کی یادگاریں اور خدائے واحد کی عبادت گاہیں مسمار کرا دیں کیونکہ توت عنخ آمون دنیادار آدمی تھا اور مصر کے برافروختہ کاہنوں کو مزید برافروختہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو نئے مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی حکومت کا تختہ اُلٹنے پر تیار ہو گئے تھے۔

اخناتون کے معنی ہیں خدائے واحد کا محبوب بندہ۔ اور اس کی ملکہ تھی نفرتیتی یعنی حسن ظاہر دلن دونوں نے مل کر کم از کم ایک مختصر مدت کے لیے ایک قدیم بُت پرست تہذیب میں ذہنی انقلاب کی جو کوشش کی اسے بعد کے بُت پرست اور طاقتور فرعونوں کاہنوں اور صدیوں نے مٹا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر اس کی یادیں آج بھی اہلِ دل کے لیے روشنیٔ دل ونظر کا کام دیتی ہیں، کہتے ہیں کہ اس کو وحدانیت کی روشنی سورج کے مطالعے اور اس پر غور وفکر سے پہنچی تھی۔

موجودہ قاہرہ سے ڈیڑھ سو میل دور اس نے نیا دارالحکومت بنوا کر وہاں جدید عبادت گاہیں اور یادگاریں قائم کیں کیونکہ سرکاری احکام اور اصلاحات کے باوجود قدیم مصری اپنے دیوی دیوتاؤں کو دل سے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ دارالحکومت کا نام اخی تاتون تھا (عربی نام تل عمرنہ ہے) اور گو وہ بعد کے مشرکین نے مٹا دیا لیکن محققین کے شوق وجستجو نے وہاں کے اور دوسرے آثار وشواہد سے اخناتون کے جو خیالات اخذ کیے ہیں وہ ایک عجیب وغریب روحانیت کا سرچشمہ ہیں۔

موسم

ایک سال کے اتنے موسم
جن میں تیری قدرت جھلکے
سردی گرمی
تونے بنائے
تونے اتنی دور اک نامعلوم بلندی پیدا کی
اور اُفق بنایا
اُفق جہاں سے خود تو جھلکے
سب کچھ تو پیدا کرتا ہے
سب کچھ تو پیدا کرتا ہے

تخلیق

یہ سب تیری تخلیقیں ہیں
چلنے والے انسان اور حیوان زمیں پر
اور ہوا میں اُڑنے والے
یہ سب تیری تخلیقیں ہیں
شام کے اُونچے کہساروں میں
مصر کے لمبے میدانوں میں
تو نے سب کو بسا رکھا ہے
تو نے سب کو جِلا رکھا ہے
تو سب کو کیا کچھ دیتا ہے
اتنے مزاج اور اتنی زبانیں
اتنے رنگ اور اتنی قسمیں
یہ سب تیری مرضی سے ہے
یہ سب تیری تخلیقیں ہیں

یہ ترجمے قدیم مصری سے فرانسیسی، فرانسیسی سے انگریزی، انگریزی سے اُردو اور اُردو نثر سے اس حقیر فقیر تک پہنچے جن کا آزاد منظوم ترجمہ حاضر ہے یقین ہے کہ اصلی زبان اور الفاظ میں وحدانیت کی عظمت اور لذت ہوگی۔

تو مصر کس کا ہے۔ خوفو کا یا اخناتون کا یا توت عنخ آمون کا چلیے ڈرو کھتی بیگم واپس چلیے اور اہرام سقارا کی آخری بلندی پر کھڑے ہو کر یہ سوال پورے مشرق و مغرب سے کیجئے۔ مجھ میں دم نہیں کہ اپنی بے بضاعتی بھول کر ایسی پُراسرار بلندیوں کو چھونے کی کوشش کروں آپ اس شہر کی رہنے والی ہیں جہاں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے جو دنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔ اور آپ کے سوال کرنے پر یار لوگ آپ کی ہوٹنگ نہیں کریں گے۔ کیونکہ آج مشرق کی ذہنی پستیوں میں مغربی بونے بھی قدآور جنّوں کی طرح لگتے ہیں۔

رہا جواب تو جواب مجھے اور آپ کو اور سب کو معلوم ہے یا شاید کسی کو بھی معلوم نہیں۔

مصر کے قدیم میدانوں میں گھومتے ہوئے حضرت موسیٰ والے فرعون کی طرف بھی نظر ڈال لیں جس کے زمانے میں

حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ کی کہانی الہامی کتابوں میں موجود ہے لیکن تاریخی شواہد سے ان کا زمانہ متعین کرنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ خیر ہم کوئی محقق تو ہیں نہیں ہمارے لیے تو پوری زندگی

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

یہ فرعون رامسیس یا رعمسیس کا مجسمہ ہے اور قیاس ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے دور اور اس کے محل میں پرورش پائی تھی۔ رعمسیس دوم چودھویں یا تیرھویں صدی قبل مسیح کا فرعون ہے۔ وہ ایک بہت جابر آدمی تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ کے علم و فضل اور وجاہت سے دبتا ہوگا۔ اس لیے اس نے آپ کو اور آپ کے تابعین کو اتنا نہیں ستایا۔ جس فرعون کے زمانے میں آپ نے ہجرت کی وہ روایتاً فرعون منفتاح تھا۔ جو رعمسیس کا بیٹا تھا اور حضرت موسیٰ کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور دینی تبلیغ کو برداشت نہیں کرسکا۔ منفتاح جسے انگریزی میں MENNEPTAH لکھا جاتا ہے۔ پتا نہیں ان روایات اور قیاسات اور ان پہ کام کرنے والوں کے مرتب کردہ اندازے کس حد تک درست ہیں۔ میرے لیے تو اس کا رومانی پہلو کافی ہے یہ وہ سرزمین ہے جہاں سے یوسف زلیخا کی کہانی ابھری اور جہاں فرعونی ظلم اور جبر کے خلاف جہادِ موسوی کی درخشندہ روایت نے جنم لیا۔ قرآن کریم میں اسی دور کے عجیب و غریب واقعات بیان فرمائے گئے ہیں۔

ارے بھائی کہاں تک اس سرزمین کی خاک چھانوگے یہ تو سات ہزار برس کی کہانی ہے۔ جس کے لیے کم از کم سات برس پڑھنے اور دیکھنے اور سات ہی برس لکھنے کو درکار ہیں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں منظم انسانی سوسائٹی کے نشانات ساڑھے چار ہزار برس قبل مسیح سے ملتے ہیں یہاں صرف سکندر اعظم تک یعنی ۳۳۲ قبل مسیح تک ۳۱ خاندانوں کی حکمرانی رہی جن کے حیرت انگیز واقعات اور عمارات اور فنونِ لطیفہ اور قوانین ملک گیری کے ان گنت آثار و شواہد موجود ہیں۔ اور پھر اس کے بعد کی کہانیاں ہیں۔ آٹھ نو سو برس کے مخلوط حکمرانوں اور نئی تہذیبوں کی کہانیاں اور پھر مسلمانوں کی فتوحات اور صلیبی جنگوں اور یورپی حملوں اور ترکی حکومتوں کے قصے الگ ہیں اور اب نہر سوئز کے دونوں دہانوں پر مصری قبضے نے تاریخِ عالم کو جس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اس کا قصہ الگ ہے۔ چلو ڈوروتھی بیگم کے بالکل بے مزہ ذہن کو نسلوں اور قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال پر غور و فکر کے چکر میں مت پھنساؤ۔ ان کی جیب میں بجتے ہوئے ڈالروں کی جھنکار سنو اور شرمندہ ہو جاؤ کہ تمھیں ان سے طاس سندھ کی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ یا خوش ہو جاؤ کہ گو ان کی جیب میں آج کا سکہ رائج الوقت کھنک رہا ہے لیکن تم مشرق والوں کے توشے میں بھی ان فلسفوں مذہبوں اور نظریوں کے خزانے بکھرے ہوئے ہیں جن سے مغرب آج تک محروم ہے۔

موجِ نیل

"انا من بلاد پاکستان" (میں پاکستانی ہوں)

"ارجوک خود فی الا الفندق اللوتس" (مجھے ہوٹل لوٹس پہنچا دو)

"اجلب لی قطعه لحم بقر" (بڑے گوشت کا ٹکڑا لاؤ)

"وقطعه من الاجاج" (اور مرغی کا ٹکڑا بھی)

"لیث اندی دراھم اجنبیه" (میرے پاس زیادہ فارن ایکسچینج نہیں ہے۔)

"اہلاً وسہلاً"

اب زیادہ عربی نہیں بولی جاتی نہ گھوما جاتا ہے۔ رات دو تماشے دیکھے۔ ایک تو ایک علمی تقریب میں جناب محمود شلتوت نظر پڑے جو شیخ الازہر ہیں۔ یعنی جامعہ ازہر کے وائس چانسلر ہیں اور داڑھی نہیں رکھتے اور پھر بھی ایک عالم ان کی عزت کرتا ہے۔ دوسرے ایک کلب میں ایک گانا سنا۔ مصطفٰے مصطفٰے! پہلے تو میں سمجھا کہ یہ نعت ہے مگر وہ رمبا کی طرز نکلی۔ مصری دیوانہ وار اس کی نے پر رقص کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک عشقیہ گانا ہے جو فرانس میں ایک لبنانی نے بزبان عربی لکھا اور دیں اس کی دُھن بنائی گئی۔ مصطفٰے نام کی توقیر جو ہمارے دلوں میں ہے، شاید وہی مصری اور لبنانی مسلمانوں کے دلوں میں بھی ہو۔ مگر وہاں یہ ایک عام نام بھی ہے۔ اور ــــ اور لبنان اور مصر یورپ سے قریب تر بھی ہیں۔ اس گانے کے بعد جو بیلی ڈانس ہوا، وہ خواتین کے ساتھ مل کر دیکھتے خود ہمیں شرم آئی۔ مگر خواتین کو شرم نہ آئی۔

ایک صبح "سیدنا حسین" گئے۔ مصریوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک یہاں دفن ہے۔ لیکن پھر بھی یہاں کربلا جیسی ہیبت طاری نہیں ہوتی۔ یہ روایت کی اہمیت ہو یا نفسیاتی تاثر۔ مگر جذبات اپنی پالیسی اپنے آپ بناتے ہیں۔ مسجد محمد علی دیکھی، ازہر کے قدیم و جدید مکاتب دیکھے۔

مسجد محمد علی نہایت شاندار ہونے کے علاوہ نہایت آراستہ اور روشن ہے۔

اب مجھے گھر یاد آرہا ہے

"کیوں ڈرد ستی بیگم کیا آپ کو بھی گھر یاد آتا ہے؟"

"بہت۔ مگر میرے بال بچے تو ہیں نہیں اور میرے میاں جنوبی امریکہ گئے ہوئے ہیں وہ سولہ دن بعد آئیں گے اس لیے میں پندرہ دن تک اور باہر رہ سکتی ہوں؟"

"گڈ۔ مگر میرے بال بچے بھی ہیں اور میری بیوی بھی جنوبی امریکہ نہیں گئیں اس لیے مجھے تو جلد ہی واپس پہنچنا ہے"

"آیئے اب آخری راؤنڈ ہو جائے"

مگر آخری راؤنڈ بھی ایک سخت کٹھن معاملہ ہے۔ ابھی تو پورا مصر پورا قاہرہ دیکھنے کو پڑا ہے۔ اور اسکندریہ دیکھے بغیر مصر کیا خاک دیکھا۔ اسکندریہ جو اسکندر اعظم کے نام سے منسوب اور اتنا ہی قدیم ہے۔ قدیم یونانی، رومنوں کی طرح سلطنت پھیلانے کے شوقین نہیں تھے اور "علوم و فنون" ہی پر اکتفا کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ قوم کے اندر یعنی دل و دماغ میں رچتی ہوئی عظمت ایک بار باہر پھوٹ پڑی اور اسکندر کی شکل میں نمودار ہوئی اور پھر مقدونیہ سے جہلم اور سندھ تک پھیل گئی۔ اسی پھیلاؤ میں شمالی افریقہ یعنی مصر بھی آگیا اور گو یہ سیلاب جلد اتر گیا مگر اپنی یادگار کے طور پر اسکندریہ کا حسین و جمیل اور پُر فضا شہر چھوڑ گیا۔ یہاں قاہرہ جیسا حبس نہیں ہے۔ بلکہ کسی حد تک کراچی جیسی ہوا چلتی رہتی ہے اور کہتے ہیں کہ گرمی سردی کے موسموں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ گو اسکندریہ قاہرہ سے صرف ۱۱۳ میل دور ہے مگر بندرگاہ ہونے کی وجہ سے قاہرہ کے موسمی شدائد سے محفوظ ہے۔ جدید شہر تو قاہرہ سے بھی زیادہ روشن اور خوبصورت لگتا ہے۔ ایک مقام کا نام انطونیا ڈیس باغ ہے۔ ہم کسی سے پوچھ نہ سکے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ہمارے قدیم دوست عاشق جانباز جنرل مارک انطونی فدائے قلوپطرہ کی چھاپ ہے۔ چلو مرنے کے بعد ایک باغ تو ملا۔ غیر طے شدہ علاقوں کے بعض بے وسیلہ مہاجرین اگر بے نتیجہ احتجاج کی بجائے عشق ہی کریں تو مرنے کے بعد پورے پورے باغ نہیں تو کم از کم ایک ایک کیاری کی الاٹ ہو جانے کا امکان ضرور ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کس سے عشق کریں تو اس کا جواب ان کے دل و دماغ خود دے سکتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی انطونی کی قلوپطرہ سے زیادہ خوب صورت اور "چارمنگ" کئی نصب العینی قلوپطرائیں موجود ہیں اور آج بھی جو اپنی کمزوریوں خود غرضیوں اور تشکیک کا بچہ عبور کر لیتا ہے تو اسے کسی نہ کسی آدرش کسی نہ کسی نصب العین کی دیوی

ضرور نظر آجاتی ہے۔

یہ پومپی آئی کا ستون ہے۔ معلوم ہے پومپی آئی کون تھا، وہی رومن جنرل جس کے نام سے قدیم سلطنتِ روما میں بھی ایک شہر آباد تھا۔ جس پر روایت کے مطابق اس کی بڑھتی ہوئی عیاشیوں کے سبب قہرِ خداوندی نازل ہوا اور ایک زلزلہ آیا اور شہر کا شہر تباہ ہوگیا۔ یہ پومپی آئی ایک نہایت خوبصورت اور عظیم جنرل تھا جس نے سلطنت روما کی سرحدیں اسپین تک پھیلادی تھیں اور مغرب کے ڈراموں کا ہیرو اور مشہور جنرل جولیس سیزر اس سے اتنا خائف تھا کہ اس نے ایک دفعہ پومپی آئی کو روم سے باہر رکھنے کے لیے اسے اپنی بیٹی پیش کر دی تھی جسے قانون روما کے خلاف اس کے محبوب سے زبردستی طلاق دلوائی گئی تھی۔

پتا نہیں کہ آج کے اسکندریہ سے جولیس سیزر کی بیٹی یا پومپی آئی کا کوئی تعلق ہے یا نہیں مگر تاریخی پس منظر کا بوجھ میرے شانوں پر ایسا لدا ہے کہ اس کے بغیر

بات بنائے نہ بنے

واضح رہے کہ اس کہانی کا راوی مشہور مورخ پلوٹارک ہے اور اس کہانی سے ایک پرانا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض بڑے آدمی جنھیں تاریخ کن کن عظمتوں کے بار پہناتی رہتی ہے اور جنھیں شکسپیئر جیسے دانشورِ حیات جاوِدانی کے تمغے عطا کر دیتے ہیں اپنی کامیابی کی منزلوں تک پہنچنے کے لیے کیا کیا کر سکتے تھے، یعنی کیا کیا کر سکتے ہیں۔

مصری رہنما گائیڈ بڑے فخر سے اسکندریہ کے وہ مقامات ضرور دکھاتے ہیں جہاں ۱۹۵۶ء میں یورپی حملہ آوروں میں مادرِ جمہوریت عرف برٹش پارلیمنٹ والے ملک انگلستان اور سرخیل تہذیب عرف فرانس اور سابقہ یتیم و یسیر عرف اسرائیل نے اپنے مشترکہ حملے میں بمباری فرمائی تھی۔ مصری گائیڈ وہ مقامات دکھاتے ہوئے ان پر تھوک دیتا ہے اور ہماری رہنمائی کرتے کرتے عالمی سیاست پر لکچر دینے لگتا ہے۔

شکر ہے کہ ابھی ہماری قوم میں ایسے چھچھورپن کے جذبات پیدا نہیں ہوئے ورنہ ہماری سرحدوں پر اور لاہور اور ملتان جیسے شہروں میں برطانوی فتوحات ہند کی وہ چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری یادگاریں قائم نہ رہتیں جنھیں دیکھنے سے آج بھی ہماری آزاد قوم کی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔

یونانی عجائب گھر کی بڑی تعریف سنی تھی مگر بند نکلا۔ راس التین کا محل دور ہی سے دیکھ سکے کیونکہ اس دن ذرا سی بیگم کو حرارت محسوس ہو رہی تھی اور شام تک بخار بھی ہوگیا۔ وہ ٹھہری ہیں حسب عادت قیمتی ہوٹل میں اور ہمارے لیے مسافر نواز جیسے والا انتظام ہے۔ بار بار عیادت کو جانا اور ان کے کمرے

میں بیٹھنا مہنگا بھی پڑتا ہے ــــ اور بقول بزرگوں کے مناسب بھی نہیں ہے۔

اچھا تو پھر قاہرہ ہی سہی۔ ہوائی جہاز سے ڈیڑھ گھنٹے میں قاہرہ واپس ہوئے۔ ڈروتھی بیگم کے لیے امریکی سفارت خانے نے بہترین ڈاکٹروں کو جمع کر دیا جنھوں نے ان سے بہترین باتیں کیں بہترین دوائیں دیں کیونکہ وہ دنیا کی امیرترین قوم کی فرد ہیں اور اس لیے ان کی بیماری مختصر ترین ثابت ہوئی۔

"بھئی واہ اس عورت نے اسکندریہ کا اتنا مہنگا ٹرپ خراب کر دیا" میں نے اپنے آپ سے کہا "اگر یہ مرد ہوتی تو کیا میں ایشیائی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے خود واپس لے کر آتا!"

تاویل کی بات الگ ہے مگر سچ یہ ہے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ جب میں بیروت کے ہوائی اڈے پر پہنچا تھا۔ تو میری جیب میں قسطنطنیہ کا ٹکٹ تھا۔ اور وہاں محمد شریف صاحب پاکستانی پریس اتاشی نے اپنے خط کے مطابق میرے لیے اپنے ہاتھ سے قورمہ اور پراٹھے تیار کیے تھے۔ مگر اس قورمے کی بوٹیوں اور ان پراٹھوں پر میرے نام کی مہر نہیں تھی اس لیے میری پرواز ہی منسوخ ہوگئی۔ اور میں قسطنطنیہ کی بجائے قاہرہ چلا آیا۔ قورمہ اور پراٹھے شریف صاحب کے اس ترک دوست نے اڑائے جس کو انھوں نے پہلے سے مدعو نہیں کیا تھا مگر جس کے نام کی مہر اس تمام کھانے پر لگی ہوئی تھی۔

لہٰذا ڈروتھی بیگم کا کوئی قصور نہیں۔ یوں بھی خواتین عام طور پر بے قصور ہوتی ہیں۔ کم از کم اپوا کے پروگرام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔

پاکستانی سفیر کا مکان دریائے نیل کے عین کنارے پر واقع ہے بیچ میں ایک خوبصورت اور لمبی سڑک ہے اور سامنے نیل۔ یہ مکان آغا خان پیلس ہے جسے شاید حکومت پاکستان نے خرید لیا ہے فرنیچر کی آرائش کمال کی ہے۔ اب تک ہمارے سفرا کے مکانات کچھ بوگس سے نظر آئے تھے جیسے اپنے افسروں کے مکان ہوتے ہیں، اس لیے دل میں فارن سروس کی کوئی خاص عزت پیدا نہیں ہوئی مگر اس مکان کو دیکھ کر بار بار خیال آیا کہ ایک بار تو قاہرہ میں پاکستانی سفیر ہو کر آنا چاہیے۔

مگر!

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

معلش! عربی میں معلش کے معنی ہیں برداشت کرو۔ کوئی بات نہیں NEVERMIND کوئی بات نہیں جو تم سفیر نہ ہوئے یا وزیر نہ ہوئے۔ اتنی بڑی دنیا میں آغا خان پیلس کتنے ہوں گے اور سفیر کتنے ہوں گے! اس اقلیت کے مقابلے میں تم ایک وسیع اکثریت کے رکن رہو تو کیا حرج ہے۔ ہاں جی اکثریت کی کیا بات ہے۔

تو مائی ڈیر ابوالہول اب اجازت دو۔ کل پی آئی اے سی کا جیٹ طیارہ کراچی جاتا ہے۔ اور بندۂ درگاہ رخصت ہوتا ہے۔ یوں بھی تمام شہر میں یکسانیت بہت ہے۔ نہ زیادہ پیسے ہوں تو رات کو کلبوں اور تماشا گھروں میں وقت گزر جائے ورنہ آدمی کب تک عجائب خانے دیکھے۔ شہر میں حرکت نظر نہیں آتی۔

حالانکہ موٹریں اور ٹرامیں شور مچاتی ہوئی گزرتی ہیں لاکھوں لوگ ادھر سے ادھر جاتے ہیں
مگر وہ بات نہیں مولوی مدن کی سی

اپنے ملک کی بات کچھ اور ہے۔ کسی صبح کو طالب علموں کا ہنگامہ ہے تو کبھی مزدوروں کا جلوس نکل رہا ہے کبھی کسی اخبار نے کوئی اداریہ لکھ کر یا کوئی سیاسی انکشاف کرکے ہلچل مچا دی ہے۔ مگر یہاں بالکل بے رونقی ہے۔ ہمارے سارے اخبار تو میاں دیئے گیے ہیں یعنی سرکاری بنا دیئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لکھائی چھپائی اور سائز کا فرق تو نظر آتا ہے مگر زاویۂ نگاہ کا اختلاف نہیں ملتا۔ خبروں میں بھی آزاد خبر نہیں ملتی۔ بس وہی کچھ ملتا ہے جو پیا چاہتے ہیں۔ تمہارے ملک میں سیاسی پارٹی بھی ایک ہی ہے اور قومی اسمبلی میں حزب اختلاف تو سرے سے نہیں ہے۔ کوئی آدمی حکومت پر یا حکومت کے کسی شعبے پر نکتہ چینی نہیں کرسکتا۔ بے چارے ادیب لوگ بھی اپنی طباعی اور ذہانت بیرونی معاملات پر گفتگو میں دکھا سکتے ہیں۔ گھر کی بات زیادہ باہر نہیں آتی۔ اس خاموشی، اس دباؤ اس گھٹن کے نتیجے میں سطحی قسم کی ثقافتی سرگرمیاں لازمی طور پر بڑھا دی جاتی ہیں۔ یا بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ آخر معاشرہ کچھ نہ کچھ دیر اپنی کوئی نہ کوئی ہنگامہ تو مانگتا ہے۔ بے چارے اتنے بڑے اور مشہور روزنامے یعنی اخبار الیوم، الاہرام، الجمہوریہ ثقافتی رسالے یا سرکاری ہینڈ آؤٹ بن کر رہ گئے ہیں۔

مجھے یقین تھا کہ سفیر اور بزرگ اور سنکی ابوالہول کسی بات کا جواب نہ دے گا۔ اور میں سلام کرکے چلنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑا۔ نہیں پہلے تو وہ مسکرایا اس کی پتھریلی آنکھیں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ اور اس کے صدیوں سے بند ہونٹ کھل گئے۔ پھر وہ ہنسنے لگا وہ اتنے زور سے ہنس رہا تھا کہ اس کے کئی سو گز پیچھے عظیم اور قدیم اہرام سقارا ہلنے لگا اس طرح جیسے زلزلے میں درخت اور عمارتیں اور بجلی کے کھمبے جھومنے لگتے ہیں۔ اہرام سقارا جو چار سو چھیالیس فیٹ بلند ہے۔ اور سات سو چھیالیس فیٹ چوڑا ہے۔ اور جس میں ڈھائی ٹن اوسط وزن کے تیئیس لاکھ پتھر لگے ہوئے ہیں وہ پورا اہرام میز پر رکھے ہوئے برتن کی طرح چھنکنے لگا اور ابوالہول کی آواز سے ہوا گویا پھٹنے لگی۔ اور اس کے گرد اگرد اس کی آواز کی شدت سے ہوا کے پھٹ جانے سے ایک خلا پیدا ہوگیا۔ جس میں میرا دم گھٹنے لگا۔

پسش" اس کی آواز آئی۔ اور وہ پھر ہنسنے لگا۔ ہا ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو ہو۔ ہا ہا ہا ہا ہا۔
مگر ڈروتھی بیگم نے میرے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔

"کیا بات ہے شاعر صاحب آپ بہت غور سے ابوالہول کو دیکھ رہے ہیں؟"

"معلش" میں نے کہا "معلش یعنی NEVERMIND ڈروتھی بیگم NEVERMIND یہ سب کچھ انسانی زندگی کے عوامل ہیں تمھاری اور ہماری آزادیاں اور یہاں کی پابندیاں اگر اچھے مقاصد کے لیے نہیں تو بیکار ہیں۔ اصل قصہ مقصد کا ہے، منزل کا ہے۔ باقی سب راہیں اور رسمیں ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں یہ آپ کس سلسلے میں تقریر فرما رہے ہیں؟"

"ارے بھئی! تم کیا سمجھو گی۔ تم نے ابوالہول کی آواز ہی نہیں سُنی۔ تمھارے کانوں میں امریکی خوش حالی کے نقارے جو بجتے رہتے ہیں۔ بات یہ ہے نا کہ ہر تین میں [illegible] ایک امریکی کے پاس موٹر ہے۔ ہر گھر میں ریڈیو سیٹ ہے اور گرم علاقوں میں ائر کنڈیشن [illegible] میں مینشن یعنی [illegible] کا انتظام ہے اور سب کے لیے کام اور آرام کا انتظام ہے اور [illegible] جلی ہے۔ اس لیے تمھاری [illegible] فراغت کی عینک چڑھی ہوئی ہے اور کانوں میں چاچا چا کی اور [illegible] ہے۔ [illegible] ہر وقت اسی چکر میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی لیے نئی نئی حکومتوں نظاموں اور سیاسی فلسفوں [illegible] رہتے ہیں۔ روز نئے مسیحا کی تلاش کرتے ہیں روز جھگڑے فساد کرتے ہیں روز [illegible] ہائے ڈروتھی بیگم [illegible] پیٹ کی آگ ہے جو کیا کیا جلاتی اور کیا کیا پگھلاتی رہتی ہے۔ صبح تم نے عجائب خانے میں فرعون کا ساز و سامان دیکھ کر تعریف کی اور میں نے گالیاں دیں۔ تم نے حنوط شدہ لاشوں یعنی ممیوں کو حیرت کی نظر سے دیکھا مگر کم دیکھا اور میں دیر تک گھور گھور کر دیکھتا رہا کہ یہ سالے موت کے بعد بھی امپورٹنٹ یعنی اہم ہوئے پڑے ہیں اور ہمیں ان کی زیارت کے لیے بھی کیو میں کھڑے ہونا پڑتا ہے کیا سمجھیں تم۔ تم اتنی روشن خیال کیوں ہو اور میں اتنا کمینہ اور تنگ نظر کیوں ہوں؟"

"کیوں؟" ڈروتھی بیگم بڑی معصومیت سے پوچھتی ہیں

"معلش" مجھے غصہ آ گیا ہے۔ میں جواب دینا ہی نہیں چاہتا ——

جہاز کو ساڑھے نو بجے جانا تھا۔ ایک جہاز آٹھ بجے قسطنطنیہ جا رہا تھا اور ڈروتھی بیگم نے بڑے خلوص سے ہاتھ ملایا۔ بٹوے سے ایک سفید رومال نکالا اور ایک لفافے میں ڈال کر مجھے دیا۔

"یہ اپنی بیگم کو میری طرف سے پیش کر دیجیے۔ ہم دونوں اتنے دن لڑتے رہے۔ لیکن میں آپ کو آج ایک

بہترین دوست سمجھ کر رخصت ہو رہی ہوں۔"

بھئی واہ یہ بھی کوئی سفارتی تعلقات ہیں کہ اس قسم کی تکلف آمیز باتیں کی جائیں۔ میں چڑ سا گیا۔ میں نے لفافہ ہاتھ میں لے لیا۔ مگر اسے یونہی رہنے دیا۔ مجھے اس تحفے پر بھی غصہ آیا۔ آخر یہ تحفے بازی کب تک چلے گی۔ پوری زندگی یا تحفے یا قرض پر گزر رہی ہے۔ گندم تحفے میں اور مشین قرض۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ میں ڈروتھی بیگم کے ایک ہزار ڈالر چرا لیتا اور ایسے کئی سلکن رومال نہ صرف اپنی بیوی بلکہ جملہ عزیزوں اور دوستوں کی بیگمات کے لیے لے جاتا۔ مگر میں ایک ہزار تو کیا ایک ڈالر بھی نہ چرا سکا حالانکہ اس کا موقع مجھے بار بار ملا۔ مگر میں ہر دفعہ ٹال گیا اور میں نے ہر بار کراچی اور چٹاگانگ کی بندرگاہ پر نظر رکھی جہاں امریکن تحفے اور قرض پر آئے ہوئے مال برابر اتارے جاتے ہیں۔

"یار یہ سب کیا بکواس ہے آخر انسانوں کی انفرادی حیثیت بھی کوئی شے ہوتی ہے" ابن الحسن نے چیخ کر ڈانٹ پلائی۔ ابن الحسن میرا ایک دوست ہے جو میری تجزیہ نگاری کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر موجود نہیں تھا مگر اس کی آواز موجود تھی۔ اس کا ہیولا موجود تھا "یہ کیا نان سنس ہے۔ یہ امریکی خاتون ایک سیدھی سادی شریف عورت ہے اور تم اسے عالمی سیاست کی بھول بھلیوں میں دوڑا رہے ہو بھئی اس نے اتنے دن کے ساتھ کی وجہ سے ایک شریفانہ اور قاعدے کی بات کی ہے اور تم کھڑے بکواس کر رہے ہو۔ جیسے تمھارے ملک کی عزت کی ذمہ دار اکیلی وہ ہے اور تم نہیں ہو۔ یا تمھارے آبا و اجداد نہیں تھے جلد ختم کرو یہ قضیہ اور رومال لے کر جیب میں رکھ لو۔"

چنانچہ میں نے مسکرا کر دوبارہ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا جیسے ایک بچے کو ڈانٹ پڑ جائے تو فوراً سیدھا ہو جاتا ہے اور پھر میں نے وہ لفافہ اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ مگر مجھے پھر میں پھر میرے ایشیائی احساسات نے مجھ پر حملہ بول دیا اور میں نے دوبارہ ہاتھ ملا کر ان سے ایک آخری فقرہ کہہ دیا۔

"تھینک یو فور دا ٹپ" (اس انعام کے لیے آپ کا شکریہ)۔

شریف امریکی خاتون ڈروتھی بیگم کچھ غمزدہ اور کچھ مسکراتی ہوئی کسٹم کے برآمدے میں چلی گئیں۔ پتا نہیں وہ میرا کیا تاثر لے کر گئی ہیں۔

نو بجے معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز روم میں رہ گیا ہے اور کچھ معلوم نہیں کب تک آئے۔ آپ لوگ فری یعنی مفت کافی پی سکتے ہیں۔ فراخ دل بی او اے سی، کافی بلکہ ٹھنڈے مشروبات تک کی قیمت ادا کرے گی۔ میں فوراً بی او اے سی کے خلاف ہو گیا اور گو ابن الحسن کی آمد کا خوف ہر وقت تھا لیکن میں نے

ہم سفروں کو جمع کر کے ہندوستان میں برطانوی نظام کی خرابیوں پر تقریر شروع کر دی۔

گیارہ بجے تک میری تقریر ختم ہو گئی۔ پھر ابن الحسن بولا جو اس وقت راولپنڈی میں تھا۔ مگر جس کی آواز قاہرہ کے ہوائی اڈے تک آ رہی تھی۔ مگر پھر اس کی تقریر بھی ختم ہو گئی۔ پھر سب نے کافی پی اور پھر کافی پی۔ کچھ لوگ ٹہلنے لگے اور کتابیں خریدنے لگے۔ کچھ لوگ کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ میں بھی سو گیا۔ مگر دو ڈھائی بجے پھر اُٹھ گیا۔ گرمی اور کرسی نے نیند کو مار مار کر بھگا دیا۔ اور آنکھیں جلنے لگیں۔ پھر میں نے ایک نہایت موٹا سگار خرید کر سلگایا اور اسے انگلیوں میں دبا کر بیٹھ گیا اور بہت دیر تک اس کے آہستہ آہستہ سلگتے ہوئے کنارے کو دیکھتا رہا۔ اس دوران میں میں نے کچھ نہیں سوچا۔ نہ تقریر کی نہ ماضی کا خیال آیا نہ مستقبل کا۔ نہ مصر کا نہ پاکستان کا۔ ایسا معلوم ہوا کہ زندگی سگار کی آہستہ آہستہ بنتی ہوئی راکھ ہے بلکہ ایک موٹا سا سگار ہے جو آہستہ آہستہ جل رہا ہے اور جل کر رہے گا۔

اب صبح کے سات بجے ہیں اور یہ سوئس ایئر کا سپر کانسٹی لیشن مجھے لے کر سوئز پر اڑ رہا ہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے یعنی یہ کہ میرے جاگتے ہی میرا بیگ کھو گیا جس میں ذرو بھی بیگم کا رومال تھا اور میری چھوٹی موٹی چیزیں تھیں لیکن پاسپورٹ اور ٹکٹ نہیں تھا کیونکہ وہ بی او اے سی کے پاس تھا۔ سوتے میں کوئی بیگ لے گیا اور ابھی میں اُونگھ ہی رہا تھا کہ بی او اے سی کی ایک لمبی تڑنگی کم عمر انگریز لڑکی نے آ کر بتایا کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر سوئس ایئر کا جہاز کراچی جانے والا ہے اور فوراً ایک نشست کا انتظام ہو سکتا ہے۔ میں نے گھر پہنچنے کی آرزو کی قیمت کا موازنہ کھوئے ہوئے بیگ اور اس کے ساز و سامان کے ساتھ کرنا چاہا۔ مگر سوال قیمت کا نہیں تھا، ایک اَن دیکھی زنجیر نے مجھے جہاز کی طرف کھینچ لیا اور جونہی میں جہاز میں بیٹھا گھر اور بیگ دونوں کو بھول کر سو گیا یہاں تک کہ اس خوبصورت فرنچ لڑکی نے چائے کے لیے جگا دیا جو میری جلتی ہوئی آنکھوں کو اور بھی جلا رہی ہے۔

چائے پیتے میں مجھے اپنے بیگ کا خیال پھر آیا اور میں غصے کے مارے کھولنے لگا۔ میں صدر ناصر کے خلاف ہو گیا بلکہ پورے مصر کے خلاف ہونے لگا مگر میرے آس پاس اور بھی لوگ تھے میں جب بنچ پر سویا اسی پر ایک بدمعاش سا یورپین جوڑا تھا اور سامنے کی نشست پر ایک مشتبہ سا یونانی۔ ضرور انھی میں سے کسی کا کام ہے کیونکہ مصری تو دُور دُور نظر نہیں آتا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ وہ یورپین جوڑا تو ایک پادری صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ پر مشتمل تھا لاحول ولا قوۃ وہ تو بڑے شریف لوگ تھے انھوں نے کافی بھی میرے ساتھ پی تھی اور بڑی اچھی باتیں کی تھیں بس تو یقیناً وہ یونانی ہو گا اس کا کالر بھی میلا تھا اور اس نے ٹائی بھی نہیں باندھی

تھی مگر وہ یونانی تو ایک لبنانی جرنلسٹ تھا یونانی نہیں تھا۔ رات کو اس نے بھی میرے ساتھ بڑی دلچسپ گپ کی تھی وہ ایسا نہیں کرسکتا ہیں اسے نیند کے جھونکوں میں یونانی کیوں سمجھ رہا ہوں اور یہ میں نے کیسے سوچا کہ چوری یونانی ہی کرسکتا ہے ـــ اور ہو ـــ مجھے یاد آیا بیروت میں جو شوق عمومی یعنی بازار حسن ہے اس میں زیادہ تر لڑکیاں یونانی کہی جاتی ہیں۔ تحت الشعور نے کہاں کے ڈانڈے کہاں لے جاکر ملا دیئے ہیں۔ اچھا دوست یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تم تو سوتے رہے اور لوگ آتے جاتے رہے تمہارے بیگ کا چور کوئی بھی ہو سکتا ہے نیند کے مارے میں سوچنے سے معذور ہو گیا اور میں نے سامنے والی نشست کے نیچے پاؤں پھیلانے شروع کیے مگر ایک دم پاؤں اٹک گئے۔ نیچے میرا بیگ رکھا ہوا تھا۔

"یہ کیسے آیا" میں نے گھبرا کر ایئر ہوسٹس سے پوچھا

"اوہ موسیو میں آپ کو بتانا بھول گئی" وہ مسکرائی "آپ کے پیچھے پیچھے پی او اے سی کی خاتون آکر یہ بیگ ہمیں دے گئی تھیں اس وقت جہاز بند ہو رہا تھا میں بہت مصروف تھی بعد میں اس پر آپ کے نام کا ٹکٹ پڑھا تو یہاں لا کر رکھ دیا تھا۔ کیا آپ خوش نہیں ہیں"

یہ جہاز نو گھنٹے تک سیدھا اڑے گا یعنی کراچی تک کہیں رکے گا نہیں گویا یہ میری سب سے لمبی پرواز ہوگی۔ یہ جیٹ نہیں ہے یعنی نہ کامٹ ہے نہ بوئنگ۔ چار پنکھے مسلسل نو گھنٹے تک گھومتے رہینگے اور پہلے یہ سوئز پر سے گزرے گا (شاید ابھی گزر رہا ہے) اور پھر حجاز پر سے جہاں میں اپنے کمزور عقائد کے باوجود جینا اور مرنا چاہتا ہوں اور پھر یہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصوں اور خلیج ـــ پر سے اڑتا ہوا کراچی پہنچ جائے گا یا نہیں پہنچے گا اور کہیں رستے ہی میں رہ جائے گا۔

"معلش" میں فرنچ ایئر ہوسٹس سے کہتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

دہلی

ایک رات

دلّی کی فضاؤں میں عشق اور خوف رچا ہوا ہے۔

میں دلّی کے ہوائی اڈّے پر اس طرح اُترا جیسے ایک بچہ ہمک کر ماں کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر فوراً ہی یوں ڈر گیا جیسے اسے ماں کی بجائے کسی ڈائن کا چہرہ نظر آجائے۔

میں کھرا دلّی والا ہوں۔ وہیں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا مگر آج میں اس آغوشِ مادر جیسے شہر میں اجنبی اور گھبرایا ہوا سا ہوں کیونکہ آج یہاں میرے نئے وطن کے خلاف منصوبے بندھتے ہیں مجھے اور میرے بچوں کو مفلوج اور اپاہج کر دینے کی سازشیں ہوتی ہیں۔ آج دلّی کی راجدھانی پاکستان دشمنی کا سب سے بڑا مرکز بنی ہوئی ہے۔

میں یہاں ایک شب کے لیے ہوں۔ کل صبح مجھے ماسکو روانہ ہونا ہے جہاں سوویت ادیبوں کی یونین نے مجھے عظیم روسی مصنف طالسطائی کی پچاسویں برسی میں بُلایا ہے۔ ابھی پی۔ آئی۔ اے نے دو گھنٹے میں کراچی سے دلّی پہنچا دیا جہاں سے کل صبح روسی جہاز ۱۰:۳۰ بجے مجھے بارہ گھنٹے میں ماسکو پہنچا دے گا۔ یہ نومبر کا مہینہ ہے۔ رات کو خنکی بڑھتی جاتی ہے اور میں عجیب و غریب جذبات میں گرفتار دلّی کی گلیوں میں تنہا گھوم رہا ہوں۔

دلّی میرا پہلا پردیس ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہاں مجھے کسی رہنما کسی ترجمان کی ضرورت نہیں۔ میں نے ٹیکسی والے پر راستے بھر شہر سے واقفیت کا رعب جمایا اور نئی دہلی کے جنپت ہوٹل میں سامان رکھ کر پیدل ہی پرانی دلّی کی طرف چل پڑا۔ جی ہاں ہم لوگ نئے شہر کو دہلی اور پرانے کو دلّی کہتے ہیں۔

منٹو روڈ پر سے ہوتا ہوا میں حوض قاضی پہنچا۔ سامنے اینگلو عربک کالج ہے جہاں میں نے چار برس تعلیم پائی۔ یہاں میں نوجوان ہوا تھا۔ کیا کیا مناظر یادوں کی آنکھوں سے گزر رہے ہیں۔ یہ اجمیری گیٹ

ہے اور یہ حوض قاضی۔ بائیں ہاتھ کو لال دروازے کی طرف رستہ جاتا ہے جہاں چچا سائل رہتے تھے اور دائیں ہاتھ کو چاوڑی بازار سے ہوتے ہوئے جامع مسجد پہنچ جاؤ اور وہاں سے اُردو بازار یا مٹیا محل ہوتے ہوئے کوچہ چیلان جہاں میں ۱۹۴۷ء تک رہتا تھا۔ کوچہ چیلان جہاں مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور حکیم مومن خاں اور ان سے پہلے خواجہ میر درد رہتے تھے اور میر پنجہ کش خوشنویس اور ـــــ اور ـــــ

اور اب میں اس شہر میں ٹرانزٹ یعنی سفری قیام کر رہا ہوں میرے گھر میں ہندو شرنارتھی بیٹھے ہیں۔ میری ننھیال ددھیال اُجڑ چکی ہے میرے دوست یا مارے گئے یا بھاگ گئے۔ کاش میں ماسکو نہ جاتا کسی لاش کے سرہانے کھڑے رہنا کوئی خوشگوار بات نہیں۔

میرے بچپن کی برقعہ پوش پردہ نشین خواتین اور ان رنگ برنگی ناریوں میں کتنا فرق ہے۔ بہت یا شاید بالکل نہیں۔ ڈولیاں کاروں موٹر رکشاؤں میں بدل گئی ہیں اور عورتیں فیشن ماڈلوں میں میرے بچپن کی دلّی میں جب بے پردہ خواتین بھی پُرانے خاندانوں سے آتی تھیں تو ڈولیوں میں اور برقعے پہن کر۔ یہ اچھا ہے یا بُرا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ کراچی اور لاہور سب بے پردہ ہے مگر میں تو دلّی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ ہائے میر تقی میر

جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

"اوے سردار جی: نی گھماؤ گے پیسے میٹر کے حساب سے دیں گے"

"بیٹھو بادشاہو ٹیکسی تہاڈی ہے جو چاہو دو بے شک جہاں چاہے چلو"

نومبر کی سرد رات میں دلّی والا ایک بار پھر دلّی دیکھنے نکلتا ہے۔

لال قلعہ تاریخی اعتبار سے تو مغل بادشاہ شاہجہاں نے بنایا تھا مگر اصل میں وہ ہندوستان کے سب مسلمانوں کی تعمیر اور ملکیت تھا۔ لال قلعہ جسے ایک زمانے میں دلّی والے پیار سے لال حویلی بھی کہنے لگے تھے۔ یہ سُرخ اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور جامع مسجد کے مقابل ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ان دونوں کے بیچ میں خانم کا بازار تھا۔ مگر وہ انگریزوں نے ڈھا دیا اور پورا علاقہ میدان ہو گیا اور پھر یہاں افواج کی پریڈ ہونے لگی تاکہ باغی مسلمانوں پہ فاتح انگریز کی ہیبت بیٹھ جائے۔ میرے سامنے پریڈ بند ہو گئی تھی مگر ہم لوگ لال قلعے میں پک نک کرنے جاتے تھے۔ دیوان خاص میں بیٹھتے تھے۔ موتی مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور قلعے کی کچی پکی روشوں پر چہل قدمی کرتے تھے۔

اب اس قلعے پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ رات کو جھنڈا اُتار لیا جاتا ہے۔ مگر دن بھر تو لہراتا ہے۔ اور یہ جامع مسجد ہے جہاں ہم کم از کم جمعے کی نماز ضرور پڑھتے تھے۔ خوبصورت وسیع شاندار جامع

مسجد جمعۃ الوداع کو لاکھوں آدمی مسجد میں اور مسجد کے باہر نماز ادا کرتے تھے۔ بعض اوقات پورا پریڈ کا میدان بھر جاتا تھا۔ عیدین کی نماز بھی یہیں ادا ہو جاتی تھی گو عید گاہ بھی تھی مگر ہم سے دور واقع تھی۔

اور یہ اُردو بازار جہاں ہر دکان پر خواجہ حسن نظامی کے ایجاد کردہ بورڈ لگے ہوئے تھے۔ اُردو۔ اُردو۔ اُردو۔ اُردو بولو۔ اُردو لکھو۔ اُردو پڑھو۔ علمی اور ادبی کتابوں کی دکانیں۔ ساقی بک ڈپو۔ مولانا سمیع اللہ احراری کی دکان۔ مکتبہ انجمن ترقی اُردو۔

باہر نکلو بھائی سردار صاحب شہر سے باہر نکلو یہاں میرا دم گھٹا جاتا ہے۔ آؤ پُرانے قلعے چلیں۔ مشہور تھا کہ یہ قلعہ کورو پانڈو کے زمانے کا ہے۔ یعنی مہا بھارت کے زمانے کا۔ ہم لوگوں نے کبھی اس کی تحقیق نہ کی اور میں آج بھی اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔ تحقیق کے لیے پوری دنیا کی عمارتیں اور تہذیبیں موجود ہیں۔ یہاں تو میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ دلّی کا پُرانا قلعہ ہے اور یہاں ۱۹۴۷ء میں دلّی والے بھاگ بھاگ کر پناہ لیتے تھے اور یہ مہاجرین کیمپ کہلاتا تھا۔ دلّی کی ہزاروں شریف زادیاں جنھوں نے عمریں گھروں میں بیٹھ کر گزاریں یہاں بے پردہ اپنے عزیزوں کو تلاش کرتی تھیں اور بے پردگی کے خوف سے ٹھوکریں کھاتی تھیں۔

اور یہ ہمایوں کا مقبرہ ہے جہاں چاندنی رات میں پک نک ہوتا تھا۔ گرمی کے دنوں میں بھی اس کے لمبے اور ٹھنڈے برآمدے کیسا آرام پہنچاتے تھے۔ اس مقبرے کے سامنے بہادر شاہ بادشاہ گرفتار کیے گئے تھے اور ان کے بیٹوں اور بھتیجوں کو گولی مار دی گئی تھی۔

اور یہ آگے حضرت نظام الدین اولیاء ہیں۔ بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی باؤلی نظر آتی ہے۔ آج کے بچے باؤلی کے معنے بھی نہ جانتے ہوں گے۔ میں بھی نہیں بتاتا۔ اور یہ خواجہ صاحب کے سامنے حضرت امیر خسرو دفن ہیں۔ خواجہ صاحب میں دو عرس ہوتے تھے۔ شاید اب بھی ہوتے ہیں۔ ایک خواجہ صاحب کا اور ایک امیر خسرو کا جو اپنے مرشد کی وفات پر باہر گئے ہوئے تھے اور چھ مہینے بعد جب دلّی پہنچے اور مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور پھر روایت کے مطابق یہ دوہا کہہ کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو دیس آپنے سانجھ بھئی چودیس

اور آگے کئی میل صفدر جنگ سے الجھتے ہوئے اور آگے چلو اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں حاضری دو۔ یہاں میری خاندانی ہڈواڑ بھی ہے۔ میرے دادا علاؤالدین خاں علائی یہاں دفن ہیں اور میرے چچا ضیاء الدین خاں عالی بھی جن کا تخلص میں نے اُڑا لیا تھا۔ خاندانی رواج کے مطابق میں بھی یہیں دفن ہوتا مگر اب نہ جانے کہاں دفن ہوں گا۔ اگر زندگی کے یہی لیل و نہار رہے تو شاید کسی

جہاز میں جل بھن کر میری خاک ہوا میں مل جائے گی۔ یا کسی دریا، کسی سمندر کی لہروں کی نذر ہو جائے گی۔
اور یہ قطب کی لاٹھ آج کتنی عجیب لگ رہی ہے۔ رات کو دروازہ یوں بھی بند رہتا ہے لیکن دن بھی ہوتا تو میں کیوں اُدھر جاتا۔ وہاں سے اس لاش کا منظر بہت صاف دکھائی دیتا جس کا نام دلّی ہے۔ قطب کی لاٹھ کی بھی ایک تاریخ ہے۔ مگر آج میں مورخ نہیں ہوں۔

"اے میاں واہی ہوئے ہو" ایک گونجتی ہوئی آواز آتی ہے۔ "دلّی کیا تمھارے باپ کی جائداد تھی جو آہیں بھر رہے ہو۔ انقلابات عالم میں تمھارے تھی یا تمھاری دلّی کی بساط ہی کیا ہے۔ کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ اپنے نئے وطن میں تم اپنے اسلامی نام کے باوجود آزادی سے گھومتے پھرتے ہو آزادانہ کاروبار کرسکتے ہو تمھاری عورتوں کی عصمتیں محفوظ ہیں۔ تمھارے بچوں کا حال اور مستقبل محفوظ ہے۔ تمھارا دین تمھارا ایمان محفوظ ہے۔ تمھاری زبان اس کا رسم الخط محفوظ ہے۔" یہ آواز کس کی ہے شاید تاریخ کی۔ تاریخ کی۔ تاریخ جو بیدردی کی حد تک صاف گو ہے۔

اچھا تو سردارجی واپس چلو اور مجھے جلدی سے ہوٹل پہنچاؤ مجھے آج کے دلّی والوں سے کوئی عناد نہیں کوئی پرخاش نہیں۔ وہ بھی مجھ جیسے عام آدمی ہیں اور ان کی اکثریت بھی بے گناہ سکھ ہندو مہاجرین پر مشتمل ہے۔ مگر میں دلّی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میرے باپ کی جائداد نہ سہی۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کا ورثہ ضرور ہے جو ہم سے۔ مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ یہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ اب ایک متعصب قوت کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے۔ جو ہر اس چیز کو مٹانے پر تُل گئی ہے جس پر کسی قسم کے اسلامی رشتے کی چھاپ ہو۔ ہاں بھائی میں دلّی کا سفرنامہ نہیں لکھ سکتا۔ میرا احساس بہت تلخ ہو چکا ہے۔ اور میرا رہا سہا علم تلخی کی آنچ پر پگھل کر ہوا ہو گیا ہے۔

میں جنپت ہوٹل کے کمرے میں دلّی کی گلیوں، یادگاروں اور فضاؤں سے چھپ کر بیٹھ گیا ہوں اور بے چینی سے صبح کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ روسی ہوائی جہاز جلد سے جلد مجھے اس شہر سے دور لے جائے۔ اب مجھے اپنا دل اس طرح دھڑکتا ہوا محسوس نہیں ہوتا جیسے دلّی کے ہوائی اڈے پر ہوا تھا۔ مجھے اپنی ہجرت پر ذرا افسوس نہیں ہے۔ نہ کچھ مہاجرین کی طرح کوئی ناز یا فخر ہے بلکہ مجھے پاکستان ایک جنت کی طرح نظر آرہا ہے جہاں میں اپنے نام، اپنی زبان اور اپنے ایمان کی کھلی آزادی برقرار رکھ سکتا ہوں۔ پاکستان جو میری پناہ گاہ ہے۔ جو میرا گھر ہے۔ میرا وطن ہے۔ جس نے مجھے اور میری نسلوں کو ایک حال اور ایک مستقبل کی ضمانت دے رکھی ہے اور جو ایک عظیم نصب العین ایک عظیم منزل ایک عظیم میدان کار ہے۔

اور اب ایک کھرا دلی والا دلّی کے ہوٹل جنپت کے کمرہ ۲۳ میں بیٹھے بیٹھے کھڑا ہو گیا۔ اور بے اختیار ایک نعرہ گونجا۔ پاکستان پائندہ باد۔

پسِ تحریر

یہ نہایت مختصر تحریر میرے اولین جذبات کی ترجمانی تھی جو مجھ پر اپنے مولود اور پہلے وطن دہلی سے کے قیام یک شب میں طاری ہوئے۔

اس میں ترمیم کی ضرورت اب بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس وقت یہی میری سچائی تھے۔ یہ شعری یا نثری انداز تحریر کا مسئلہ نہیں جس میں ایک تشنۂ فن ساری عمر بہتری کی کوشش کرتا ہے (گو بہت کم نظر ثانی کے علاوہ کچھ اور ہو نہیں پاتا) یہ ایک خاص وقت یا دور میں جذبات و خیالات کا معاملہ ہے، تاثرات کا معاملہ ہے۔ ماضی میں ترمیم، تحریف، تصحیح کی گنجائش نہیں ہوتی، ہاں تبدیلی کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے.... اکثر تبدیلی ہوتی بھی رہتی ہے.... بلکہ ہر لمحہ لکھنے والے کے ذہن میں کچھ نہ کچھ تغیر لاتا ہے۔ اسے کوئی نہ کوئی نئی بات بتاتا اور سکھاتا ہے۔ مگر نیا احساس، ارتقاء، تبدیلی اپنی جگہ، اولین احساسات ماضی کا ریکارڈ بن جاتے ہیں۔ ان کو چھیڑنا انھیں مسخ کرنا ہے۔ وہ میری لُٹئے میں میرے لئے... یا کسی کے لیے بھی.... مناسب نہیں۔

۱۹۸۲ اور ۱۹۸۴ء کے اوائل میں دہلی کے تین سفر اور کئے۔ دورانیہ ایک بار ایک ہفتے کا اور ایک بار دو ہفتے کا تھا (کچھ اور شہر بھی دیکھے) ۱۹۶۱ء کے بعد ۱۹۸۲ء میں پہلی بار ہندوستان جانا ہوا تھا۔ اکیس برس کا فصل بڑا ہوتا ہے۔ یہ دورے بھی مختصر تھے مگر قیام یک شب سے تو زیادہ تھے۔

اصل بات تو یہی ہے کہ مکاں کو مکیں سے شرف ہوتا ہے۔ میری دِلّی میرے دِلّی والوں پر مشتمل تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر وہ نہ رہے۔ میں وہاں نہ رہا، اور وہ دِلّی بھی نہ رہی۔ اب کچھ نئے دوست پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ مگر بُعدِ مکاں کے سبب ابھی ہم ایک دوسرے کو نہ پوری طرح جان سکے ہیں نہ آزما سکے ہیں۔ شاید یہ کبھی ممکن نہ ہو۔ حالات ہی ایسے رہتے ہیں۔ کہ امن مستقل کی امیدیں بندھتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں۔ خدا کرے دونوں ملکوں میں دوستی اور تعاون کی راہیں کھل کر محکم ہو جائیں۔

مگر یہ دیکھا کہ یہاں صرف مذہبی شادینیت کے عناصر اور اینٹی پاکستان اسٹیبلشمنٹ کے اراکین ہی نہیں بلکہ ساٹھ لاکھ سے زیادہ عام ہندوستانی رہتے ہیں۔ ان میں اچھے بھی ہیں جو پاکستان کے دشمن نہیں ایسے بھی ہیں جو ہند پاک دوستی اور علاقائی امن کے کھلے منادی ہیں۔ ایسے بھی جنہیں اپنی جہد بقا سے ہی فرصت نہیں۔ عام لوگ غریب محنت کش بہت اچھے لوگ اچھے شعرا اچھے ادیب، اہلِ دل دانشور، خوبصورت اور خوش مزاج خواتین و حضرات، پیارے پیارے بچے

لاکھوں پیچھے، ان سب نے پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑا، نہ ایسا چاہتے ہیں۔ میں ان کی طرف سے کیوں بدگمان رہوں۔ میں دِلّی کو غیر مشروط طور پر کیوں بُرا کہوں۔ میری ان سے کوئی لڑائی نہیں، میری دِلّی سے کوئی لڑائی نہیں۔ مجھے دِلّی کو ڈانٹ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ مگر وہ ریکارڈ ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ ان تین سفروں کے تجربے کے بعد میں نے سوچا۔۔۔ اور یہ میری آج کی کیفیت ہے۔ وہ پہلی کیفیت بھی سچی تھی اور آج کی بھی۔

جب ۱۹۸۲ء میں دِلّی گیا تھا تو وہاں کے احباب و اصحاب نے ایک استقبالیے میں میرے لیے محبتانہ طور پر یا ڈپلومیسی کے سبب "فرزندِ دہلی" کا لقب استعمال کیا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس لقب کو قبول نہیں کیا (تفصیل کے لیے۔۔۔۔ جنگ کراچی) بلکہ یہ واضح کیا کہ (مختصراً) دِلّی یقیناً میرا ماضی تھی مگر میرا حال اور مستقبل پاکستان ہے یہ کہ دِلّی نئے دِلّی والوں کو مبارک ہو۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آہ دہلی کیوں کہ وہ میری ملکیت نہیں تھی۔ میں کہوں گا کہ واہ وہ دہلی جو نئے پرانے دہلی والوں نے بنائی ہے اور واہ کراچی اور واہ لاہور اور واہ اسلام آباد جو میں نے اور نئے پرانے پاکستانیوں نے بنایا ہے اور بنا رہے ہیں۔ نہیں دوستو مجھے مہمان سمجھو اور میری نئی عُرفیّت مانو تب تعلقات کا مزا آئے گا۔ میں دِلّی سے گیا تو صرف اکیس برس کا تھا۔ پاکستان نے پورے پینتیس برس میری پرورش کی ہے۔ میں فرزندِ دہلی نہیں تخلیقِ پاکستان ہوں"

میں نے یہ کہا اور پہلے تو احباب اور اصحاب قدیم و جدید کو ایک ثقافتی دھچکا لگا اور کچھ اخبارات نے میری اس "طوطا چشمی" پر مجھے بُرا بھلا بھی کہا مگر بعد میں انہی سب نے یہ بھی کہا کہ اس شخص کا، اس پاکستانی مزاج کا سچ یہی تھا۔ اس سے اتفاق اختلاف اپنی جگہ یہ اپنے وطن کی سچی زبان تو بولتا ہے۔ یہاں آکر للّو پتّو تو نہیں کرتا۔ اس بہ ظاہر بدکلامی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے دو مہینے کے اندر اندر دوبارہ بلایا گیا۔ جن حلقوں نے بلایا وہ پاکستانی مزاج کو سمجھنا چاہتے تھے۔ تکلفات اور ظاہرداری کچھ تعلیم نہیں کرتی۔ تعلیم و تفہیم صرف سچائیوں کے باہمی تبادلے اور خواہشِ اشتراک سے ہوتی ہے۔ میں نے شاید کچھ سکھایا بھی ہو مگر سیکھا بہت۔

ہاں دِلّی اب بھی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے۔ اور اس طرح سارے جنوبی ایشیا بلکہ تمام عالمِ اسلام کے لئے قابلِ احترام۔ دِلّی اب بھی ان علماء و اولیا کی یاد دلاتی ہے جنہوں نے جنوبی ایشیا میں ایک عشق انگیز اور دانش خیز فضا قائم کر دی تھی۔ مگر وہ اور دِلّی ہے۔

دِلّی میں اب بھی مسلمان اقلیت طرح طرح کی کٹھن آزمائشوں میں مبتلا رہتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے غریب محنت کش بھی خوش نہیں۔ نئی دہلی کی نئی تعمیرات پرانی دِلّی کی روز بروز بڑھتی ہوئی بوسیدگی کے جواب میں کوئی معقول معذرت پیش نہیں کر سکتیں۔ پرانی دِلّی اتنی گندی اور خستہ ہو چکی ہے کہ اس میں سے گزرنا ایک دردآمیز امتحان ہوتا ہے۔

لیکن اس نئی اور پرانی دہلی کے امتزاج نے ایک کلچری فضا بھی قائم کر رکھی ہے جس میں بقائے اردو کی کوششیں

اور تحریکیں اور نہایت ٹھوس کام دیکھ کر امید بندھتی ہے۔ دلّی کی ہوا میں موسیقی رچ گئی ہے کلا کے نئے نئے مکتب ابھرے ہیں۔ آزاد فکری اور روشن خیالی کے گوشے جا بجا نظر آتے ہیں۔ شاید میں دلّی کا نیا سفرنامہ بھی لکھوں گا۔ سیاسی الجھاؤ ذہن صاف نہیں ہونے دیتے۔

کاش وہ وقت آئے اور جلد آئے جب ہم دلّی کو امنِ عالم اور باہمی تعاون کا با عمل، خوش نیت منّاد پائیں:
اور اگر ایسا ہوا تو وہ کتنا اچھا وقت ہوگا۔

رُوس

طالسطائی کے ساتھ چند لمحے

اب میں پہلی بار ایک ایسے ملک کی طرف چلا جو آزاد دنیا سے بالکل الگ اور مختلف کہا جاتا ہے۔ جمہوریہ شورائیہ روس۔ کمیونسٹ روس۔ سرخ روس۔

نومبر انیس سو ساٹھ کی ایک صبح دلی سے ایک روسی طیارہ لے کر روانہ ہوا۔ یہ طیارہ جٹ تھا مگر بوئنگ جیسا نہیں بلکہ اس میں صرف دو انجن تھے۔ اور اندر مغربی طیاروں جیسے آرام و آسائش کا انتظام نہیں تھا بلکہ کسی قدر کھردرے پن کا احساس ہوتا تھا۔ میں فرسٹ کلاس کا مسافر تھا اور میری نشست کسی قدر کھلی کھلی تھی مگر وہ بوئنگ کی سی بات کہاں۔ کمر پر باندھنے کی پیٹی کافی بھاری تھی اور پرانی بھی تھی۔ کرسی مضبوط لوہے کی معلوم ہوتی تھی۔ میری کرسی کے بالکل سامنے ہوا بازوں کا کمرہ تھا۔ جسے کاک پٹ کہتے ہیں۔ اس کا دروازہ بے حد موٹے اور مضبوط لوہے کا تھا۔

یہ زندگی کے بارے میں روسی نظریۂ افادیت کا پہلا عملی مظاہرہ تھا جو میری نظر سے گزرا۔ نازکی، لطافت اور مضبوطی اور پائداری میں کس کا انتخاب کیا جائے۔

جہاز تقریباً ایک دم اونچا ہو گیا اور گھنٹے بھر میں اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں پر اڑنے لگا۔۔

امالا یاز۔ امالا یاز۔ آس پاس بیٹھے ہوئے روسی بولے۔ اور سب کھڑکیوں سے جھانکنے لگے۔ کوہ ہمالیہ کو انگریزی میں ہمالا یاز کہتے ہیں، شاید روسی میں بھی ہمالا یاز کہتے ہوں گے مگر وہ "د" کی آواز ابتداً ادا نہیں کر سکتے اس لیے امالا یاز بولتے ہیں۔

میں کھڑکی سے متصل بیٹھا تھا، مجھے نیچے دیکھنے کے لیے جھکنا بھی نہیں پڑا۔ ایک عجیب و غریب ناقابل بیان منظر نظر سے گزر رہا تھا، اول تو اس خیال سے ہی تھرتھری آ گئی کہ میں عظیم الشان ناقابل تسخیر کوہ ہمالیہ پر اڑ رہا ہوں۔

نئے ہمالا سے فصیلِ کشورِ ہندوستاں

اللہ اکبر کیا زمانہ ہے کہ ایک دو انجنوں والی مشین پر پھیلائے ان بلندیوں کے اوپر سے گزر رہی ہے جہاں دیوتاؤں کے مسکن تھے میں نے اور بھی غور سے دیکھنا شروع کیا۔ شاید اسی علاقے میں کہیں شو اور پاربتی جہاز کی آواز سے پریشان ہو کر بھاگتے ہوئے یا اپنے محلوں میں چھپتے ہوئے نظر آجائیں اور اپنے مہاراجہ اندر بھی تو ہمالیہ ہی کی چوٹیوں پر سبھا لگاتے تھے مگر ابھی تو صبح ہے وہ رات بھر کے ناچ رنگ سے تھک کر آرام کر رہے ہوں گے، بھلا اس سردی میں چہل قدمی کرنے کیوں باہر نکلیں گے۔ راجے راجے ہوتے ہیں۔

مگر ہمالیہ بالکل ویران اور خاموش ہے۔ کہیں کہیں گہری گہری وادیاں، برف پوش پہاڑیوں اور چٹانوں کا سلسلہ توڑ دیتی ہیں۔ دور تک سبزہ گھاس آبادی کا نشان نظر نہیں آتا۔ ہواؤں کا رُخ کچھ ایسا ہے کہ انجنوں کی آواز بھی آنی بند ہو گئی ہے۔ ہم ایک مکمل سناٹے میں ساڑھے پانسو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑ رہے ہیں، چاروں طرف اصطلاح کے مطابق ایک ملکوتی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ بلندی۔ خاموشی اور برف۔

اللہ اکبر۔ یہ منظر شاید پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئے۔ مطلع بالکل صاف ہے۔ ہوائی موسم نہایت عمدہ ہے۔ جہاز کے انجن اچھی حالت میں ہیں اور میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور نیچے ہمالیہ کے وہ سلسلے گزر رہے ہیں جن تک کوئی مہم پسند کبھی پہنچے تو پہنچے کم از کم یہ فقیر تو خواب و خیال میں بھی ان چوٹیوں پر قدم نہیں رکھ سکتا۔

یکایک جہاز نیچا ہو گیا جیسے ہوائی اڈے کے قریب ہوتا ہے، ہم اک دم پہاڑوں پر جھک سے گئے۔ پائلٹ کی آواز لاؤڈ اسپیکر سے گونجنے لگی۔ اور روسی مسافر تقریباً ایک دوسرے پر گر گر کر باہر جھانکنے لگے۔ میں گھبرا گیا۔ روسی زبان کا ایک لفظ سمجھ میں نہیں آر ہا تھا میں نے برابر والے صاحب کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر انگریزی میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بات کرنی چاہی مگر وہ شانے ہلا کر رہ گئے۔ اب میں نے دوڑ کر ایئر ہوسٹس کو پکڑا۔

"وٹ از دس۔ ڈو یو نو انگلش مس۔ کین یو ٹیل می وٹ از گوئنگ اون" مس کچھ نہ کچھ انگریزی جانتی تھی: "لُک تھرو دو ونڈو۔ لک کو ئیکلی" میں دوڑ کر اپنی نشست پر واپس ہوا اور نیچے دیکھا تو خدا کی شان نظر آئی۔

سفید پوش چوٹیوں کے درمیان کئی فرلانگ لمبی ایک جھیل تھی۔ جس کا رنگ بڑی حد تک نیلگوں تھا اور اس کے گرد چاروں طرف لمبے لمبے سوکھے سوکھے درخت کھڑے تھے۔ اس سردی میں اس اُونچائی پر جبکہ چاروں طرف برف ہے، ایک دم ایک ایسی جگہ جہاں پانی نہ جما ہو واقعی ایک حیرت انگیز بات تھی اور پائلٹ مسافروں کی دلچسپی کے لیئے جہاز کو خاصی دور سے نیچے لے آیا تھا۔ اس وقت ہم کوئی تیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہے تھے۔ جھیل کوئی پچیس یا بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہوگی۔ یا اس سے کم یا اس سے زیادہ کیونکہ محدّب شیشوں کی وجہ سے سطح کے فرق کا اندازہ ٹھیک نہیں ہوسکتا۔

روسی ایئر ہوسٹس ایک موٹی لمبی تڑنگی لڑکی تھی اور بہت کم مسکراتی تھی۔ میں نے سگرٹ مانگے تو اس نے کئی طرح کے سگریٹ پیش کیے جن میں تھری کاسلز بھی تھا، اور چینی اور روسی سگریٹ بھی۔ میں نے اس بہانے سے اس سے دو چار سوال بھی کیے۔ وہ انگریزی اٹک اٹک کر بولتی تھی۔

"یہ علاقہ کشمیر کا تھا۔" وہ مجھے عرب سمجھ کر بولی "کشمیر ہندوستان اور پاکستان کے بیچ میں ایک ریاست ہے جس پر دونوں ملکوں کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے اور اب ہم افغانستان کی سرحدوں پر سے گزرتے ہوئے پامیر کے سلسلہ کوہ پر گزریں گے اور پھر تاشقند آجائے گا جو ازبکستان کا دارالسلطنت ہے۔"

پامیر آریا اور مغل حملہ آور، مسلمان قسمت آزماؤں کے خاندان اور نہ جانے کون کون ان سلسلوں سے گزرتے ہوئے ہندوستان میں آتے نظر آئے۔

ساڑھے تین یا چار گھنٹے بعد ہم تاشقند کے ہوائی اڈے پر اُترے جسے روسی تاشکنت کہتے ہیں۔ اُترنے سے پہلے میں نے دو گرم جرابیں پہنیں اور دو پل اوور۔ چمڑے کے دستانے اور اسکارف اور اوورکوٹ۔ جہاز سے ہوائی اڈے کی عمارت کوئی تیس گز بھی نہ تھی مگر اتنی دیر میں پنڈلیاں گویا جم گئیں۔ ناک سُن ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس وقت درجہ حرارت بائیس ڈگری فارن ہائیٹ تھا۔ یعنی نقطہ انجماد سے بھی دس ڈگری کم۔ ازبک مزدور چمڑے کے ہاف کوٹ اور فل بوٹ پہنے کام کر رہے تھے۔ آہنی تاروں کے دوسری طرف دو موٹے موٹے بچے ہاف کوٹ پہنے سر پر موٹی موٹی ٹوپیاں اوڑھے برف کی گیندوں سے کھیل رہے تھے۔ میں دوڑ کر کسٹم کے برآمدے میں داخل ہوگیا۔ جو انگیٹھی کی طرح گرم تھا۔ اس کمرے میں مرکزی حرارت یعنی سنٹرل ہیٹنگ کا انتظام تھا جو پاکستان ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر کمرے میں ایک طرف لوہے کے پانچ پانچ چھ چھ نلوں کے جو کھٹے لگا دیئے جاتے ہیں جن میں گرم ٹنکی سے آیا ہوا گرم پانی ہر

وقت گردش کرتا رہتا ہے۔ ان ظروں سے ہوا آہستہ آہستہ گرم ہوتی رہتی ہے اور بھاپ گیس، دھوئیں کی گھٹن بھی محسوس نہیں ہونے پاتی۔ کہتے ہیں یورپ، امریکہ جاپان تمام ترقی یافتہ ممالک میں یہی طریقہ رائج ہے۔

تاشقند میں کسٹم کا انوکھا طریقہ دیکھا۔ تمام سامان ایک کمرے میں جمع کر دیا گیا اور ایک نوجوان روسی کسٹم افسر تشریف لائے وہ ہر بات پر اوکے کہتے تھے۔

"اوکے اپنا سامان کھول دیجیے اور باہر چلے جائیے۔ اوکے سب بکسوں کے تالے کھول دیجیے۔ اوکے!"

میں نے حسب عادت اعتراض کیا: "مناسب یہ ہے کہ میرا سامان میرے سامنے دیکھ لیا جائے۔"

"نہیں آپ سامان کھول کر باہر چلے جائیے۔ اوکے!"

"نہیں!"

اب وہ خفا ہونے لگے۔ انھوں نے کچھ کہا جو میں نہ سمجھا۔ میں نے تقریر شروع کی: "میں سوویٹ ادیبوں کی یونین کا مہمان ہوں میں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا ہوں۔ میں ایک ذمہ دار پاکستانی ادیب ہوں اس طرح آپ کے ہمارے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔" میں نے دون کی لی۔ مگر وہ سمجھے ہی نہیں۔ انھوں نے ایرہوسٹس کو ترجمانی کے لیے بلوایا۔

"اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ سوویت ادیبوں کی انجمن کے مہمان ہیں؟"

"مجھے مفت ویزا دیا گیا ہے۔ یہ میرا پاسپورٹ دیکھیے۔"

"ویزا سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں تمام مہمانوں کی اطلاع ہوتی ہے۔"

"میں ایک دن کے نوٹس پر آیا ہوں۔ میرا سامان میری غیر حاضری میں کھولا گیا تو میں اس کا اچھا اثر لے کر نہیں جاؤں گا، میں آپ کی شکایت کروں گا۔"

"اوکے" وہ بولے "اوکے۔ آپ اپنا سامان کھولیے اور یہ فارم بھر دیجیے۔"

"اوکے" میں نے کہا اور سامان کھول دیا اور پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔

ہوائی اڈے کا ریستوران بے ہنگم سا تھا۔ یہ کسی پرانے مسلمان زمیندار کا محل تھا۔ پرانی عمارت اور قدیم نقش و نگار، بڑے بڑے اونچے اونچے ستون۔ ریستوراں کے اندر گرم کافی مفت پلائی گئی۔ روسی آپس میں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ میں بے زبان گھٹا گھٹا سا بیٹھا رہا۔ میرے سامنے میز پر شطرنج کی بساط اور بساط پر مہرے سجے ہوئے تھے۔ میں اکیلا چالیں چلنے لگا۔ دور سے ایک روسی بچہ اٹھ کر آیا اور گھوڑے سے شہ دی۔ ابھی بساط پر مہرے پوری طرح کھلے نہیں تھے کہ اس نے مجھے مات دے دی۔ جھلا کر میں نے پھر

بازی جمائی اور پھر اس نے کوئی پانچ منٹ میں دوسری مات دے دی۔ مجھے شطرنج کی مشق نہیں ہے۔ مگر ایسا بھی کیا کہ یہ لونڈا مجھے یوں ستائے۔ وہ ہر بار شہ دے کر تالیاں بجاتا تھا اور ہر مات پر بھاگ کر اپنے ماں باپ کے پاس جاتا تھا۔ اور زور زور سے ہنستا تھا۔

ائیر ہوسٹس جانے آئی تو میں نے بچے سے اس کی عمر پوچھی۔ بچے نے فرفر ایک لمبا سا جواب دیا۔ "گیارہ برس" اس نے بیزاری سے ترجمہ کیا۔ اور میں پہلی ہی منزل میں تین ماتوں کا بوجھ لے کر ماسکو روانہ ہو گیا۔

پتا نہیں ماسکو تک کتنے گھنٹے کی اڑان رہی۔ اس بار میں سوتا رہا۔ بیچ بیچ میں جاگ کر اپنے ساتھی سے دریائے وانگا کے متعلق پوچھا اور بار بار کھڑکی سے جھانکا بھی مگر سفید پوش یا کھردری بے آب و گیاہ زمین کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ تاشقند سے ایک خوبصورت اور صحت مند چینی لڑکی ایک نوجوان روسی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سوار ہوئی تھی۔ لڑکا تو جہاز میں بیٹھتے ہی سو گیا۔ لیکن لڑکی دیر تک گھومتی رہی۔ اس نے مختلف لوگوں سے باتیں کیں اور مجھ سے بھی۔ وہ نہایت فصیح انگریزی بولتی تھی۔ وہ چمڑے کا کوٹ اور فل بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں زیادہ پوچھا اور اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ شاید وہ لڑکی چینی نہ ہو ازبک ہو۔ یوں تو ہمارے خاندان میں بھی ازبک خون شامل ہے۔ مگر اب تو ہمیں سارا وسط ایشیا منگول یا چینی ہی معلوم ہوتا ہے۔

ماسکو کے مطابق دن کے تین بجے تھے کہ ہم ہوائی اڈے پر اترے۔ ہوائی اڈے کا منظر سخت ڈراؤنا تھا۔ رن وے پر برف کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور چاروں طرف لمبے لمبے بے پتوں کے درخت کھڑے تھے جن کا رنگ سردی اور پالے سے کالا پڑ گیا تھا۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔

یہاں جہاز ہوائی اڈے کے بالکل قریب ٹھہرا۔ مگر برآمدے تک پہنچتے پہنچتے میں اپنے دو سویٹروں، دو جرابوں گرم کوٹ اوور کوٹ کے باوجود سن ہو گیا۔ شرم کے مارے میں کسی کی مدد نہ مانگ سکا۔ یک بارگی اپنے بدن میں سے آہستہ آہستہ جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

"آداب عرض ہے جناب" ایک خوب صورت جوان روسی نے میرے آگے آکر کہا۔

"آداب عرض" سخت حیرانی میں، میں نے جواب دیا۔

"پیارے دوست کیا آپ ہی جمیل الدین عالی پاکستانی ہیں؟"

"جی ہاں"

"مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میرا نام ہے آئزک گولوبیف میں سوویت ادیبوں کی انجمن کی طرف سے آپ کو روس آنے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں اچھے دوستوں کی طرح آپ کی رہنمائی اور ترجمانی کے لیے مقرر کیا گیا ہوں۔" انھوں نے ہاتھ ملانے کو ہاتھ بڑھایا۔

اب میں بالکل سُن ہو چکا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ دستانے اُتار کر ان سے ہاتھ ملاؤں۔ مگر میرا ہاتھ نہ اُٹھا۔ گولوبیف صاحب گھبرا گئے اور انھوں نے مجھے جلدی سے تقریباً کھینچ کر برآمدے میں گھسیٹ لیا۔ پھر انھوں نے میرا اسکارف اُتار لیا۔ اور زور زور سے میری گردن ملنے لگے۔ ان کے ساتھ ایک موٹے سے صاحب تھے جنھوں نے جلدی سے ایک سگریٹ سلگا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"دیکھیے یوں تو آجکل زیادہ سردی نہیں ہے مگر آپ کا پہلا دن ہے۔ اس لیے آپ پریشان ہو گئے۔ ابھی آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں چند منٹ میں ٹھیک ہو گیا اور اب میں نے گولوبیف صاحب کی فصیح اُردو پر غور کرنا شروع کیا۔ بھئی کمال ہے۔ تلفظ تک کی غلطی نہیں کرتا یہ پٹھا۔ بس ٹ کو ت بولتا ہے، سو وہ مجبوری ہے۔

"اچھا عالی صاحب! سامان اُترنے اور تلاش کرنے میں دیر لگے گی۔ کیا آپ عصر کی نماز پڑھیں گے۔ اس ساتھ والے کمرے میں انتظام ہو سکتا ہے اور عصر کا وقت بھی ہو گیا ہے۔"

اُفوہ۔ کیا ہوشیاری ہے۔ یہ امریکی پروپیگنڈے کا جواب ہے کہ دیکھو بھائی مغرب ہمیں کیا کیا کہتا ہے۔ مگر ہماری رواداری کا عالم یہ ہے کہ ہم خود تمھیں تمہارے مذہبی فرائض یاد دلا رہے ہیں۔

خدا معاف کرے۔ میں نے اس شام ماسکو کے ہوائی اڈے پر اس کے لیے نہیں بلکہ اپنے روسی ترجمان کی شرم سے نماز پڑھی۔

ایک بند موٹر جس میں ہیٹر چل رہا تھا، ہمیں لے کر ماسکو روانہ ہوئی جو ہوائی اڈے سے تقریباً اٹھارہ میل دُور ہے۔ راستہ ویران سا تھا۔ مگر سڑک کے دونوں طرف تعمیرات ہو رہی تھیں۔ مزدور چمڑے کے کوٹ اور لمبے بوٹ پہنے کام پر لگے ہوئے تھے۔ ہیٹر کے باوجود مجھے موٹر میں سخت سردی لگ رہی تھی۔ سفر بھی بارہ گھنٹے سے زیادہ کا ہو گیا تھا۔ ہمارے ملک کے مطابق وقت نو دس بجے کا ہو گا۔ میں گزشتہ رات سویا بھی نہیں تھا۔ تھکن اور سردی اور سردی۔

"یقیناً آپ کمیونسٹ تو نہیں ہوں گے۔ ہمیں آپ کے بارے میں آج ہی تار ملا ہے۔ ہم آپ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے" گولوبیف صاحب بولے۔

"جی نہیں، میں تو صرف ایک شاعر ہوں" میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ گویا کمیونسٹ شاعر نہیں ہوتا۔

"یہ تو ایک اچھی بات ہے۔ ہمارے ملک میں شاعروں کی بہت عزت کی جاتی ہے"

"جی ہاں۔ یہ ایک اچھی بات ہے" میں نے سر ہلایا۔

طالسطائی یا ٹالسٹائی یا ٹالسٹانے یا ٹولسٹوائے کی پچاسویں برسی پر کوئی ساٹھ ملکوں کے مندوبین آئے ہیں۔ ہمیں گروپ بناکر موٹریں دی گئی ہیں اور ہر زبان کے مترجمین ساتھ لگائے گئے ہیں۔ اُردو بولنے والا میں اکیلا ہوں۔ اس لیے میرے حصے میں گوبیف صاحب آئے ہیں۔ یہ ماسکو کے اُردو ماہنامے یا سر مایی سوویت نادی کے نائب مدیر ہیں۔ اور مدرستہ الشرقیہ ماسکو کے فارغ ہیں۔ اُردو بہت صاف بولتے ہیں، اور کبھی کبھی محاورے کی ٹونڈی بھی مار جاتے ہیں۔ عراقی کے ساتھ ایک خوبرو اور بانکی روسی خاتون ہیں جو عربی، عراقی سے زیادہ تیزی کے ساتھ بولتی ہیں۔ "کاش میں عرب ہوتا" میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

تو یہ روس ہے۔ پراسرار روس۔ زار اور لینن اور استالن اور خروشیف کا روس یا ہم غریب ادیبوں کے لیے پشکن اور چیخوف، اور گوگول اور دوستوفسکی اور طالسطائی کا اور گورکی کا روس۔ روس بہت بڑا اور بہت پیچیدہ ہے۔ سولہ صوبوں یا سولہ آزاد جمہوریتوں کا وفاق جو دنیا کے کل رقبے کا چھٹا حصہ ہے اور جہاں کئی زبانوں والے بیس کروڑ آدمی بستے ہیں اور جہاں انسانی تاریخ میں کمیونزم یا اشتراکیت کا پہلا تجربہ کیا گیا ہے۔ ایک مہینے میں یہ ملک کیسے دیکھا جائے گا۔ کیسے سمجھا جائے گا۔

اسی شام سے طالسطائی کی پچاسویں برسی کی تقریبات شروع ہوگئیں۔ اب ماسکو کے حساب سے تو شام کے سات بجے ہیں لیکن میرے بارہ بجے ہوئے ہیں۔ کل رات کی بے نوابی دن بھر جاگتے رہنا سردی اور اجنبیت کا احساس جس نے دل میں ایک نامعلوم سا خوف پیدا کر دیا ہے۔

" چلیے پیارے دوست استقبالیے میں جلد چلیے۔ لوگ انتظار کریں گے" گوبیف صاحب مسکرائے۔

"چلیے"

واڈکا اور کیوی یار اور کباب۔ شاشلیک کباب جو ہمارے ہاں سیخ کے کباب کہلاتے ہیں اور خشک میوے اور۔ موٹی بے ہنگم بوڑھی عورتیں اور دنیا بھر کے ادیب۔ ایک بڑے کمرے میں اتنا کچھ جمع تھا کہ گھٹن ہونے لگی۔ مندوبین کو ایک دوسرے سے ملایا جانے لگا۔ سینٹو اور سیٹو ممالک میں سے میں واحد مندوب

تھا۔ مندوبین جو عام طور پر کمیونسٹ تھے، مجھے حیرت سے دیکھتے اور مبارکباد دیتے تھے۔

"یہ ناظم حکمت ہیں۔ عظیم ترکی شاعر" گورنیف صاحب نے تعارف کرایا۔ ناظم حکمت مجھے اپنے خسر کی طرح نظر آئے۔ لمبے مضبوط۔ شاندار۔ سفید مونچھیں۔ مہربان آنکھیں۔ گورا بھبوکا رنگ۔

"السلام علیکم" میں نے جان کر اسلامی سلام کیا۔

وعلیکم السلام" انھوں نے بڑی گرمجوشی سے مجھے گلے لگا لیا۔ وہ انگریزی اٹک اٹک کر بولتے تھے اور روسی بڑی روانی سے۔ گورنیف جو ہوائی اڈے پر میرے استقبال اور بورڈم سے تھک گئے تھے، چپکے سے وادکا پینے والی پارٹی میں شامل ہو گئے اور ناظم حکمت نے ایک ترت پھرت والی چھوٹے قد کی لڑکی جیسی خاتون کو جیسے پھول کی طرح اٹھا کر میرے برابر کھڑا کر دیا۔

"جناب میرا نام مریم سلگا نیک ہے۔ میں تاجیک ہوں اور روسی دولھا سے بیاہی ہوں اور اردو کی طالبہ ہوں۔ یہ تو بتایئے فیض بھائی کیسے ہیں۔"

مریم کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں برابر گھوم رہی تھیں۔ مگر اس کا لمبوترا سا چہرہ بالکل سپاٹ اور بے تاثر تھا۔ مجھے وہ ٹائپ مشین کی طرح معلوم ہوئی۔ میں نے بھی فوراً ٹانکا بھرا۔

"میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ آپ اردو بہت اچھی بولتی ہیں۔ میں آپ کے شوہر کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ فیض صاحب بالکل خیریت سے ہیں"

اب وہ ایک گھومنے والی گڑیا کی طرح میری اور ناظم حکمت کی ترجمانی کرنے لگی۔ ناظم حکمت قد میں مجھ سے بہت لمبے تھے اور ننھی مریم سے تو بہت ہی لمبے تھے۔ اس لیے وہ مجھے سنتے وقت گردن ذرا نیچے کرتی اور ان سے بات کرتے وقت گردن اور ٹھوڑی کو خوب اوپر اٹھا لیتی۔ وہ خوش شکل نہیں تھی مگر تندرست اور پھرتیلی معلوم ہوتی تھی۔

طالسطائی۔ طالسطائی۔ سب نے طالسطائی پر گفتگو شروع کر دی۔ طالسطائی نے سنہ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا اور روسیوں نے انقلاب کے بعد برسوں اس کا بائیکاٹ کیا۔ وہ عظیم مصنف تو ضرور تھا مگر کمیونسٹ نہیں تھا بلکہ اپنے انقلابی عقائد کے باوجود سخت خدا پرست تھا۔ اس لیے انقلاب روس کے بعد اس کی شہرت و عظمت ملک سے باہر زیادہ اور ملک میں کم ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ خروشیف صاحب کے زمانے میں حالات بدلے تو اب اس بین الاقوامی سطح کے اعزاز سے یاد کیا جا رہا ہے۔

اب طالسطائی کی زندگی پر ایک فلم دکھائی گئی۔ سیکڑوں تصویروں کے مجموعے ہمیں دیے گئے اور

ہم سے ان کی شان میں چند فقرے بولنے کی درخواست کی گئی۔ وادکا پیے ہوئے مندوبین ایسے گرم تھے کہ چند فقروں کے بجائے لمبی لمبی تقریریں کرنے لگے۔ وقت گزرنے لگا۔ منتظمین گھبرانے لگے یہاں تک کہ انھوں نے ایک ایک فقرہ فی مندوب کی پابندی لگادی۔

"لیوطالسطائی ایک عظیم مصنف اور ایک اچھے عیسائی تھے" میں نے کہا اور کمیونسٹ مداحینِ طالسطائی بُرا مان گئے۔

"کیا آپ کو مذہب کا ذکر کرنا ضروری تھا" گولوبیف غم زدہ ہو کر بولے اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

جو طالسطائی کو نہیں جانتا وہ ادیب ہی نہیں بلکہ وہ کسی قسم کے ادب کا طالب علم نہیں۔ اور طالسطائی سے تعارف کرانا میرا کام نہیں۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں عالمی شہرت وعظمت کی بلندیاں چھو لی تھیں۔ اور اپنی موت سے پہلے وہ اس سب ہنگامے سے بے نیاز ہو چکا تھا جو آج اس کی یاد میں ہو رہا ہے۔ لیکن ایک بہت چھوٹے ادیب کی حیثیت سے میں اس بہت بڑے ادیب کا یہ اعزاز دیکھ کر اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے لئے کیا جا رہا ہو۔ طالسطائی ۱۹۱۰ء میں مرگیا۔ وہ آج کسی کو وزارت ملازمت ٹھیکے پرمٹ الاٹمنٹ نہیں دے سکتا۔ نہ کسی کو جیل بھجوا سکتا ہے نہ کسی کا گھر کھدوا سکتا ہے۔ نہ کسی پر جھوٹا مقدمہ چلوا سکتا ہے۔ اس سے محبت یا اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کی یاد منانے اس کے احترام میں دنیا بھر کے ادیبوں کو جمع ہونے کی کوئی فوری یا مادی ضرورت نہیں پھر بھی ہم لوگ اس کی علم اشتیاق و احترام سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی تصویریں سینے سے لگائے ہوئے۔ ہم اس کے گھر جانے کے لیے اس سخت جاڑے اور پالے کی پروا نہیں کرتے۔ یہ گھر ماسکو سے کوئی تیس میل دور ایک گاؤں میں ہے جس کا نام ہے یاسنایا پولیانا۔ جب ماسکو میں ٹمپریچر نقطہ انجماد سے بیس درجے کم ہے تو شہر کے باہر اور گاؤں میں کیا عالم ہوگا مگر کوئی پروا نہیں۔ بوڑھے بوڑھے مندوبین فرط شوق سے نام لکھوا رہے ہیں اور ایک عجیب محبت و عقیدت کے نشے سے سرشار ہیں۔ حکومت تقریب کو زیادہ سے زیادہ شاندار بنانے پر تلی ہوئی ہے۔

یہ سب کیا ہے۔ ایک مردہ بے جان بے طاقت بے اثر ادیب کی یاد کے معنی کیا ہیں۔ اس کا کام ہمارے معاشرے میں کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ ایک لمحے میں اس کی کتاب "وار اینڈ پیس" اور دو مربع زمین یا ایک چھوٹے سے مکان کا الاٹمنٹ آرڈر میرے سامنے رکھ دیے گئے۔ اور کہا گیا کہ یا تو یہ تصنیف تمھاری ہوگی یا یہ الاٹمنٹ آرڈر۔ ان میں سے ایک اٹھالو۔ اب میں کیا اٹھاؤں۔ "وار اینڈ پیس" یا الاٹمنٹ آرڈر۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں اور وہ ترش رو سخت گیر

افسر یاد آنے لگے جو بات بات پر میری ذلت کے لئے تیار رہتے تھے : "یار یہ ادیب بنے پھرتے ہیں سالے ذرا ان کی چھٹی کا حساب لگانا۔ اس مہینے تنخواہ توڑ کو اہی لو پھر اپیل پر دیکھا جائے گا" میری نوکری کے شروع کا زمانہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ پھر سرکار دربار میں سیٹھوں اور زمینداروں کی کرسیاں یاد آتی ہیں جو علما فضلا سے بہت آگے ہوتی ہیں اور پھر وزیر اور افسر یاد آتے ہیں۔ فاخرہ لباس پہنے ہوئے گردنیں تانے افسر جو ادیب کو چیونٹی برابر بھی نہیں سمجھتے بلکہ کچھ بھی نہیں سمجھتے اور اپنے سنگی دوست یاد آتے ہیں : "یار یہ گلڈ ولڈ کیا بکواس ہے ادیب کی بہبود ادیب کی توقیر یہ سب کیا نان سنس ہے جتنا وقت اس میں لگاتے ہو ایک چھوٹی سی انڈسٹری قائم کرنے میں لگاتے تو آج تمہارے ادب و دب کی بھی قدر ہوتی اور بال بچے بھی آرام سے ہوتے۔ اب ہر کوئی تو علامہ اقبال نہیں ہوتا تاکہ اولاد آرام سے کتابوں کی رائلٹی کھائے۔" یکبارگی میں نے گولوبیف صاحب سے ہاتھ چھڑا کر دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو بھینچ لیا "کیونکہ آج تک مجھے کوئی الاٹ منٹ آرڈر کوئی پرمٹ نہیں ملا ہے۔" "جی جناب آپ اکیلے کس سوچ میں مبتلا ہیں۔ ہم تو آپ کو باہر تلاش کر رہے ہیں۔ جلسہ ختم پیسہ ہضم" مریم سلگانیک نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں ایسے آرام سے چونکا کہ وہ مجھے غیر ملکی بھی نہ معلوم ہوئی نہ مجھے اس کی بامحاورہ زبان پر حیرت ہوئی حالانکہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں داد طلبی کی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔

اور دوسرے دن سے سرخ روس اپنی پوری وسعت شدت اور اجنبیت کے ساتھ ظاہر ہونے لگا۔

زاروں کے خزانے

"پژالستا۔ پژالستا" (پلیز)

"خراشو" (بہت اچھا)

"سپاسبی بو" (شکریہ)

"دیکھیے روسی زبان کتنی عظیم اور پیاری ہے۔ بالکل اُردو جیسی ہے" گولوبیف صاحب آجکل مجھ پر بڑی محنت کر رہے ہیں مگر میں روسی پر محنت کر رہا ہوں۔

ماسکو میں تقریباً پچاس لاکھ کی آبادی ہے۔ شہر کے بیشتر حصے ایشیا اور یورپ کا امتزاج لگتے ہیں۔ اور ماسکو چونکہ ملک کا دارالحکومت ہے اس لیے یہاں کی آبادی بڑی حد تک ملی جلی ہے۔ وسط ایشیا کی جمہوریتوں کے لوگ ہماری طرح گندمی اور بعض گہرے سانولے ہیں اور شمالی روس کے لوگ پھیکے سفید۔ لباس میں فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ ایشیائی علاقے کے لوگ لمبے لمبے فراک کوٹ اور موٹی موٹی ٹوپیاں پہنتے ہیں اور یورپین روسی عام سوٹ اور فیلٹ۔ تقریبات میں اُونچے طبقے کو چھوڑ کر باقی سب لوگ روزمرہ کا لباس پہنتے ہیں اس کا اندازہ مجھے طالسطائی کی برسی والی تقریبات سے ہوا یہ تقریبات "سرکاری" تھیں یعنی گو انتظام سوویت ادیبوں کی انجمن کا تھا، مگر حکومت کے متعلقہ محکمے تمام کاموں میں شریک تھے۔ خود سوویت ادیبوں کی انجمن سرکاری طور پر قائم کی گئی تھی۔ اصل میں آج کے روس میں سرکاری اور نیم سرکاری کا امتیاز ممکن نہیں پورے ملک میں ایک سیاسی اور سماجی نظام ہے اور دوسرے نظام یا نظریئے کی تبلیغ کی اجازت نہیں اس لیے تمام انتظامی سماجی اور اقتصادی ادارے اسی ایک نظام کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی ہوٹل یا ریستوران میں بیٹھے بیٹھے خیال آتا ہے کہ یہ جگہ سرکاری ملکیت ہے۔ یہ بیرے سرکاری ملازم ہیں۔ یہ کاروبار سرکاری ہے اور اس کاروبار کی آمدنی سرکار کو جاتی ہے تو حیرت سی ہوتی ہے۔

ہوٹلوں کے بیرے یقیناً سست اور لاپروا ہیں۔ کیونکہ وہ سرکاری ملازم ہیں۔ جو چند ضابطوں کے پابند مگر چند ضابطوں کے سایۂ حفاظت میں رہتے ہیں۔ شکایت یا شکایات پر زیادہ سے زیادہ ان کا تبادلہ ہوسکتا ہے یا کچھ عرصے کے لیے ترقی روکی جاسکتی ہے۔ نوکری سے نکالنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں اور میرے ترجمان بھوک سے بیتاب برابر آوازیں لگاتے رہتے ہیں مگر بیرے صاحب یا خادمہ صاحبہ پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔

"آجکل کام بہت زیادہ ہے۔ اور یوں بھی ہمارے ہاں نئے منصوبوں کے لیے زیادہ سے زیادہ کارکنوں کی ضرورت ہے" گولوبیف صاحب صفائی پیش کرتے ہیں۔

روسی اونچا طبقہ کل دیکھا۔ یہ طبقہ ادیبوں فنکاروں سائنسدانوں موسیقاروں اور اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے۔ کل ماسکو کے مشہور مقام بالشوئی تھیٹر میں طالسطائی تقریبات کی بڑی تقریب تھی۔ بالشوئی کے معنی ہیں بڑا۔ یہ تھیٹر زاروں کے زمانے کا ہے۔ اس کا ہال بہت بڑا ہے۔ اور غلام گردشوں میں ریستوران وغیرہ ہیں۔ اسٹیج کی طرف منہ کیا جائے تو بائیں ہاتھ کو سرخ مخملیں پردوں اور کرسیوں سے مزین ایک باکس یعنی خصوصی نشست گاہ نظر آتی ہے جہاں زار بیٹھ اور روسی امرا بیٹھ کر تماشا دیکھتے تھے۔ اب بھی وہاں کوئی عام آدمی نہیں بیٹھ سکتا بلکہ صرف صدر مملکت اور وزیراعظم اور وزرا بیٹھتے ہیں۔

اس شام اسٹیج پر وی۔ آئی۔ پی بیٹھے۔ سوویت ادیبوں کی انجمن کے صدر اور صوبائی یا علاقائی صدر اور بڑے ادیب اور کمیونسٹ زعما۔ بائیں ہاتھ کے باکس میں صدر مملکت برژنیف صاحب اور خروشیف صاحب اور ان کے برابر میکویان صاحب اور دیگر وزرا تشریف فرما تھے۔ یہ حضرات ضابطے کے لباس یعنی سیاہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ خروشیف صاحب نے اپنے سینے پر تمغے بھی لگا رکھے تھے۔ ہم مندوبین کو ہال میں اگلی صفوں پر جگہ دی گئی مگر میں نے احتجاج کیا اور اپنے احتجاج میں کئی مندوبین کو شریک کر لیا۔

"کیوں صاحب ہم لوگ ہزاروں میل دور سے آئے ہیں اور ایسے ایسے عظیم ملکوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آخر ہمیں اسٹیج پر کیوں نہیں بٹھایا گیا؟"

گولوبیف صاحب اور دوسرے ترجمانوں نے روسی میں کھسر پھسر کی۔ ایک صاحب اُٹھ کر گئے اور ایک جواب لائے جو سب تک پہنچا دیا گیا۔

"ان اسٹیج والوں میں باہر کے لوگ وہ ہیں جنھوں نے سوویت اعلان صلح پر دستخط کر رکھے ہیں اور جو بڑے کمیونسٹ ہیں"

یہ اعلان صلح کیا ہے۔ صلح سے روس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے اور امریکہ کا مطلب کچھ اور۔ ہاتھیوں کے ٹکراؤ میں بہت سی گھاس روند دی جاتی ہے۔ گھاس کے تنکوں کو چاہیئے کہ جب تک ہاتھی نہ بن جائیں چپ چاپ نرم نرم زمین کی پناہ لیے پڑے رہیں۔ سب تنکے ایسا کریں گے تب کچھ بچ جائینگے ورنہ سب کے سب ہاتھیوں کی لڑائی میں روند دیئے جائیں گے۔ بھئی ہاتھیوں کی لڑائی خوب ہوتی ہے۔ میں نے یہ لڑائی بچپن میں دیکھی تھی مگر خیر بچپن کے قصوں کا ان باتوں سے کیا تعلق۔ یہ منصب تو صرف شیخ سعدی کا ہے کہ قصوں کہانیوں کی پھلجھڑیوں میں حکمت کے چاند سورج روشن کرتے ہیں۔

منتظمین میں سب سے زیادہ چاق و چوبند مریم سلگا نیک ہے، وہی تاجیک خاتون جو تقریبات کے پہلے عصرانے میں ملی تھی۔ مندوبین کے لیے ہوٹل پیکنگ میں ایک دفتر کھول دیا گیا ہے جو مریم کے زیر انتظام معلوم ہوتا ہے۔ ویسے یہاں کسی بات کا پتا نہیں چلتا کون کس کا افسر ہے کون کس کی نگرانی پر مامور ہے میں چونکہ ہوٹل پیکنگ میں مقیم ہوں اس لیے کبھی کبھار مریم کے دفتر میں جا بیٹھتا ہوں۔ اور وہاں مریم ہی سب سے زیادہ مستعد نظر آتی ہے۔ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ سوویت ادیبوں کی انجمن میں ملازم ہے۔ ایک صبح وہ ناشتے کے وقت ہی آگئی تھی میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو اس کے پاس ایک لمبے تڑنگے روسی کو بیٹھے دیکھا۔

"آیئے جناب" وہ اٹھلا کر بولی "ان سے ملیے"

"یہ کون صاحب ہیں"

"یہ ہمارے چھیلا ہیں۔ آپ کے بہنوئی" مجھے اقرار ہے کہ میں مریم کو صاحب شوہر دیکھ کر بُرا سا مانا تھا۔ بہنوئی صاحب نے اپنا لمبا اور سخت ہاتھ بڑھایا اور روسی زبان میں ایک مختصر سا فقرہ کہا جس کے جواب میں میں نے بھی ایک مختصر سا فقرہ اُردو میں کہا۔ بہنوئی صاحب یورپین روسی تھے اور ماہر ریاضیات تھے۔ وہ کچھ بیزار سے لگے۔ مریم ان کی چاپلوسی کرتی ہوئی لگ رہی تھی۔

مگر۔ ایشیا اور یورپ بہرحال الگ الگ ہیں خواہ وہ سوویت جمہوریتوں کی دستوری لڑی میں پرو دیے جائیں، خواہ مریم تاجیکی سلگا نیک یوکرینی کی بیوی بن جائے۔ یہ بات ماسکو میں اور بھی زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ جہاں سب روسی جمہوریتوں کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مگر ایشیائی دبے ہوئے اور یورپین حاکم قوم کی طرح جیسے اپنے اختلافات اور جونیر سینیر کے قضیوں کے باوجود ہمارے ہاں افسر قوم ہوتی ہے جو بہ حیثیت افسر اپنی قومیت الگ رکھتی ہے۔ واہ بھئی ایشیائیو۔ تم کمیونزم میں بھی نمبر دو ہی رہے۔ اتنی بڑی کابینہ میں ایک مسلمان نام کا وزیر نہیں۔ بڑے جنرلوں میں کوئی مسلمان نام نظر نہیں آتا "عظیم" ادیبوں میں ترسون زادہ

بھی احترامی پروپیگنڈے کے باوجود کچھ "مقامی" ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ماسکو کے بڑے بڑے بازار چوک نشانیاں یادگاریں جن عظیم "لیڈروں، محبان وطن اور ادیبوں کے نام سے منسوب ہیں، ان میں بھی ایشیائی اور مسلمان نام نمایاں نہیں ہیں۔ سابقہ سفید روس اب سرخ روس بن گیا ہے اور اب وسط ایشیا کے علاقوں پر انتداب کی بجائے مکمل روسی قبضہ ہے مگر ساری جمہوریتوں یعنی صوبوں کے شہری روسی نہیں کہلاتے، بلکہ روسی صرف سفید لوگ کہلاتے ہیں اور باقی اپنی اپنی صوبائی خصوصیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔

بھائی گوبو بھیف صاحب میں آپ کی شیریں بیانی اور میزبانی کا نہایت ممنون ہوں۔ مگر یہ کیسے بھول جاؤں کہ میں مسلمان ہوں، اور آپ کے ہاں مذہبی آزادی نہیں ہے۔ مثلاً میں اسلام پر ایک پمفلٹ نہیں چھاپ سکتا۔ ایک دینی تعلیم کا مدرسہ نہیں کھول سکتا میرے بچوں کو دینی تعلیم نہیں مل سکتی۔ میرے دین میں بھی جاگیرداری سرمایہ داری اور استحصال پسندی کی گنجائش نہیں ہے مگر میرے ہاں روح اور جسم کا ایک متوازن امتزاج مقصود رہے خواہ ہم اس پر عمل کریں یا نہ کریں حکم تو ہے —— مگر آپ کے ہاں مجھے صرف جسم ہی جسم نظر آرہا ہے۔

اچھا یہ بڑے مسائل تو اس وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ جب روس کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لیں۔ فی الحال تو ماسکو کی سیر کیجیے۔ ماسکو میں پہلا نمبر کریملن کا ہے جو بہت قدیم ہے۔ کریملین اصل میں ایک قلعہ ہے بالکل ایشیائی وضع کا۔ سرخ چوک یعنی ریڈ اسکوائر کے پیچھے اس کی فصیل نظر آتی ہے جو قلعہ لاہور تو کیا دلی کی لال حویلی یعنی لال قلعے کی فصیل سے بھی چھوٹی اور بے اثر ہے۔ کالی کالی دیواریں کریملن کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اندر ایک وسیع میدان سے جو اونچا ہوتا گیا ہے اور اس کے چاروں طرف عمارتیں ہیں۔ یہ مقام عالمی اشتراکیت کا گڑھ ہے اور دارالحکومت کا صدر دفتر ہے لیکن یہ خفیہ دفاتر ہیں۔ ہم کو کریملن عجائب خانہ دکھایا جاتا ہے۔ جہاں زاروں کے خزائن اور آثار محفوظ ہیں۔ اس ساڑھے چار سو برس کی تاریخ کو دیکھنے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ لیکن پہلی حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ کمیونسٹ روس نے ان قیمتی اشیا کو محفوظ کیوں رکھا ہے؟ یہ تو اس کے حسابوں ماضی کی استحصال پسند قوتوں کے شعار ہیں۔ انھیں توڑ پھوڑ کر عوام کے کام میں لانا چاہیے تھا۔ یہ مرصع تاج۔ یہ لباس، یہ جواہر کروڑوں روپے کے ہوں گے انھیں امریکہ برطانیہ اور فرانس کے جوہری بڑی خوشی سے خرید لیتے اور روسی عوام کے منصوبے کسی حد تک آگے بڑھ جاتے۔

"جی نہیں ہمارا ملک اتنا غریب نہیں ہے" ایک صاحب نے بحث کی: "ہم نے یہ سب اس لیے محفوظ کیا ہے کہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو مسلسل احساس رہے کہ ماضی میں یہ دولت وحشمت صرف چند کو میسر تھی اس

لیے باقی لوگ بھوکے مرتے تھے۔"

ہاں تو بات یہ ہے مگر خیر مجھے اس بحث سے کیا میں تو روسی نقاشی کا یہ نمونہ دیکھ رہا ہوں جس میں حضرت عیسیٰ کو مصلوب ہوتے دکھایا گیا ہے صلیب و دار کا مضمون مجھے ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کربلا میں بھی اور روس میں بھی ۔ لیکن میں خود اپنی شخصیت اپنے ضمیر کو بار بار دار پر چڑھانے سے نہیں چوکتا۔ اس اتنی موٹی روسی انجیل میں جس کی جلد پر حضرت عیسیٰ کی تصویر منقش ہے، روسیوں کے لیے اس وقت بھی سبق موجود تھا، جب یہ کتاب تحریر ہوئی اور اس کی جلد بنی یعنی چودہ سو ننانوے عیسوی میں لیکن اس وقت کے زاروں نے اس کے مضمون کو نہ سمجھا اور فنا ہو گئے اور آج کے کمیونسٹ روسی بھی اس سبق کو نہیں سمجھیں گے اور فنا ہو جائیں گے اور میں بھی نہیں سمجھوں گا اور فنا ہو جاؤں گا۔ اور جو یہ بات سمجھتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے ہیں وہ بھی فنا ہو جائیں گے۔ بس دیکھنا یہ ہے کہ جریدۂ عالم پر کس کس کا دوام ثبت ہوتا ہے اور کس رنگ کس زنگت کے ساتھ۔

اے بھائی جمیل الدین عالی مندوب پاکستان یہ ماسکو کریملن ہے مدرسہ نہیں خانقاہ نہیں۔ یہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اب تو تمھارے مدرسے اور خانقاہیں بھی سوز و ساز سے خالی ہیں چلو آگے چلو یہ دیکھو یہ ملکہ کیتھرائن کی گاڑی ہے، منقش سونے اور چاندی سے لپی ہوئی اسے آٹھ گھوڑے کھینچتے تھے جن کے راتب کی قیمت سولہ آدمیوں کی خوراک سے زیادہ ہوتی تھی مگر اس کے دربار میں جو شاعر ہوں گے وہ اس کے حسن و قیمت کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہوں گے۔ تم کیسے بوگس شاعر ہو کہ گاڑی دیکھ کر گھوڑے یاد آگئے اور تم ان کے راتب کی قیمت جوڑنے بیٹھ گئے۔ اے میاں ذرا یہ زیور کا سیٹ دیکھنا تمام ہیرے کا ہے۔ چاندی کی زمین پر چاروں طرف ہلکا طلائی چھپر کاڑھا ہے اور مسلسل ہیرے جڑے ہوئے ہیں اور روسی لڑکیاں جو کمیونزم کے چالیس سالہ مضبوط اور وسیع نظام کی پیداوار ہیں کس غور کس حسرت کس لالچ سے اسے دیکھ رہی ہیں۔

"جی نہیں یہ آنکھیں لالچی نہیں ہیں ان میں تعجب کی جھلک ہے۔" گولوبیف صاحب شدت سے میری تردید کرتے ہیں: "سوویت عورتیں زیورات سے دلچسپی نہیں رکھتیں۔"

"اچھا تو یہ خاتون جو اس موتیوں کی پوشاک کو گھورے جاتی ہیں انھیں کس بات سے دلچسپی ہے۔ موتیوں کے کام سے یعنی کاریگری سے یا لباس کی تاریخی اہمیت سے یا موتیوں سے؟"

"بھئی آپ کو پوری بات سمجھانی پڑے گی کہ ہماری موجودہ تہذیب میں ہماری قدریں سرمایہ دار دنیا کی قدروں سے کس قدر مختلف ہیں۔"

اچھا ہم قدروں کے اختلاف کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال تو یہ موتیوں کا لباس دیکھ لیں۔ سُرخ روس کے سیاسی قلب میں دنیا کے کمیونسٹ مرکز میں یہ موتیوں والا لباس کیا صرف عبرت کے لیے محفوظ ہے یا اس لیے بھی کہ روسیوں کے تحت الشعور میں دبے ڈھکے طور پر اب بھی جاگیردارانہ شاہانہ اور سرمایہ دارانہ قدروں کے سانپ رینگ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدائن کی فتح پر بہار نام کا ایک سونے چاندی اور جواہر سے مرصع فرش پیش ہوا اور تجویز ہوئی کہ یادگار فتح کے طور پر محفوظ رکھا جائے مگر وہ نہ مانے اور انھوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فوراً فاتحین میں تقسیم کر دیا۔ مائی ڈیر گولوبیف صاحب آپ ہمیں کیا مساوات کا سبق پڑھائیں گے ہم بہت پہلے یہ تجربہ کر چکے ہیں اور جب ہمارا لیڈر ہمارا سردار تئیس برس ایک عظیم تحریک چلا کر رخصت ہوا تو خود اس کے پاس ٹوٹے برتنوں اور پھٹے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اے آنکھ والو دیکھو اور عبرت پکڑو

کریملن کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ یہ تو ہم نے اسلحہ خانہ یا عجائب خانہ دیکھا ہے جو کھلا ہوا اور واضح ہے مگر آج اصلی کریملن کے دفینے کچھ اور ہیں۔

کریملن کی سُرخ چوک والی فصیل کے نیچے سرخ چوک میں سنگِ سُرخ کا ایک چبوترا ہے جس پر سرکاری تقریبات میں سلامی لی جاتی ہے اس چبوترے کے نیچے لینن اور اسٹالین کی حنوط شدہ لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔ ہمیں ایک لمبے کیو میں کھڑے ہونا پڑا۔ میرا نمبر شاید ایک سو پچاسواں تھا۔ پانچ منٹ تک تو میں مضبوطی سے کھڑا رہا لیکن پھر میری پنڈلیاں سُن ہونے لگیں۔ درجہ حرارت حسب معمول نقطۂ انجماد سے بیس یا بائیس درجے کم تھا۔ سانس کے منہ سے باہر نکلتے ہی برف کی پپڑی سی بن جاتی تھی میں اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور پنڈلیوں سے اوپر تک گرم خصوصی جرابیں چڑھا رکھی تھیں مگر بدن گرم ہو کے نہ دیتا تھا۔

"گولوبیف صاحب اب مجھ میں دم نہیں رہا۔"

"اچھا آپ کھڑے رہیں میں خصوصی اجازت کا انتظام کرتا ہوں" وہ لپک کر "مقبرے" کے دربانوں کی طرف دوڑے اُن کی پتلون ایڑی سے اوپر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ ٹخنوں تک معمولی جرابیں پہنے ہوئے تھے۔

"تو ارشش۔ پڑالستا۔ پڑالستا" ایک بہت موٹی اور بھولی اور بوڑھی خاتون ایک ربا ڈلیے گھوم رہی تھیں، مجھے انھوں نے ٹہوکا دے کر ایک چاکلیٹ قسم کی چیز پیش کی۔ مجھ سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں نے جلد جلد ایک ایک پیکٹ خریدا۔

وہ چاکلیٹ نہیں بلکہ آئس کریم تھی۔

"جی ہاں ہم روسی تو جاڑوں میں بڑے شوق سے آئس کریم کھاتے ہیں" گولوبیف صاحب نے واپسی میں توضیح فرمائی "ہمارے ہاں مذاق مشہور ہے کہ ہم نے جرمن فوجوں کو آئس کریم کی ٹکیوں سے مار مار کر بھگا دیا تھا۔"

لینن اور استالین کو ایک تہ خانے میں شیشے کے دو بکسوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے اس نیم تاریک کمرے میں کہیں سے سرخ روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی جو تابوتوں کے شیشوں سے گزر کر ان کے چہروں اور ان کے ساتھ ساتھ پورے ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔

لینن سادہ لباس میں اور استالین پورے فوجی لباس اور تمغوں کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے اور سرخ روشنی کے سبب ان کے حنوط شدہ چہرے گلابی رنگ کے مومی پتلے لگتے تھے۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ لینن کی ڈاڑھی مونچھیں اور استالین کی مونچھیں بھی کسی قدر سفیدی مائل موم کی لگ رہی تھیں۔

کیا لینن کی ممی یعنی حنوط شدہ لاش دیکھنا ایک حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ یہ لینن جس نے اتنی بڑی دنیا میں کئی مضبوط قلعوں کی دیواریں توڑ کر ان میں اشتراکیت کی فوجیں اس طرح داخل کر دیں کہ آج پورا عالم کیمپوں میں بٹ گیا ہے۔

دیوار کریملن پر چھوٹے چھوٹے موکھے یا سوراخ سے ہیں اور ان پر پلیٹ معلوم ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر کتبوں کی سی کھدائی نظر آتی ہے۔ ان سوراخوں میں دنیا کے مشہور کمیونسٹوں کی راکھ دفن کی جاتی ہے اور سوراخ پر کتبہ کھود دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ بھی ایک قسم کی مذہبی عقیدت کا چکر ہے کہ مرد تو کریملن میں دفن ہو۔ اب کریملن میں تو جگہ ہے نہیں اس لیے لاش جلا کر اس کی راکھ ایک سوراخ میں بھر دی جائے گی اور ادھر سے تیغا لگا کر نام لکھ دیا جائے گا جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ یہ صاحب بہت قابل احترام کمیونسٹ تھے۔ ہر کمیونسٹ کے لیے اس سوراخ میں دفن ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ ایک بڑی زبردست کمیٹی بیٹھ کر طے کرتی ہے کہ فلاں صاحب کی راکھ اس مقدس دیوار میں رکھی جانے کے قابل ہے یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دیوار کریملن ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ یہاں سے نپولین اپنی فوجوں کی بربادی کا نظارہ دیکھ کر لوٹا۔ یہیں ظالم آئی وان لوگوں کی ٹانگیں رسیوں میں باندھ کر گھوڑوں سے اس طرح کھنچواتا تھا کہ جسم کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ اور یہیں مشہور روسی بادشاہ پیٹر اعظم نے جنگ روس و سویڈن میں فتح پا کر روس کی مکمل آزادی کا اعلان کیا ہوگا اور پھر لینن اور استالین اور اب خروشچیف صاحب یہاں سے سرخ فوجوں کی سلامی لیتے رہتے ہیں۔ دیوار کریملن ایک طرف یہیں ایک مہری سے ٹھہرا ہوا انوکھا بازو کی طرح کریملن کی آٹھ سو سالہ تاریخ کو ایک لفظ میں ادا کر رہا ہے جو عربی

لفظ اور مصری کا محاورہ ہے اور جو اس نے مصر میں سیکھا تھا اور وہ لفظ محاورہ ہے مالش۔
مالش۔ یعنی کوئی پروا نہیں۔

سیلپنگ بیوٹی

ماسکو کریملن اور ریڈ اسکوائر یا سرخ چوک کو بار بار دیکھ کر بھی جی نہیں بھرتا۔ میں سخت سردی کے باوجود کئی بار لینن اور استالین کے مقبرے پر آچکا ہوں اور جب بھی میں آیا میں نے عورتوں اور مردوں کی لمبی لمبی قطاریں دیکھیں۔ پرانی نسل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس کے تحت شعور میں روحانیت کی جوت جگمگاتی ہوگی اور یہ لوگ کسی نہ کسی عنوان لینن کو مافوق الفطرت ہستی سمجھتے ہوں گے مگر نئی نسل تو ان توہمات سے آزاد ہے وہ تو خالص کمیونسٹ اور دہریے عقائد کے سائے میں پروان چڑھی ہے۔ وہ ایک مردہ بے فیض شخص کا نظارہ کرنے کیوں آتی ہے۔

یہ شخصیت پرستی ہے یا تماشا ہے یا حیرت کا عنصر ہے یا اپنے لیڈر کا احترام ہے اور ایسا احترام کیا معنی رکھتا ہے۔

مگر ان سوالات کے ساتھ ساتھ ماسکو بھی دیکھتے رہنا چاہیے۔ ماسکو اتنی گنجان آبادی اور کثرت کار و بار شوق کے باوجود سنسان اور سہما سہما سا لگتا ہے۔ دن کو بڑی سڑکوں پر سنسان کاریں ادھر سے ادھر گزرتی ہیں مگر وہ شور و شر پیدا نہیں ہوتا جو بڑے شہروں کا خاصہ ہے یا تو ٹریفک کے قوانین اتنے سخت ہیں کہ حادثے کم سے کم ہو گئے ہیں یا لوگ محتاط اور خوف زدہ ہیں، پیدل چلنے والے بھی بھاگ بھاگ کر سڑکیں پار نہیں کرتے بلکہ ایک تنظیمی احساس کے ماتحت چلتے ہیں۔ رات کو تو مکمل سناٹا چھا جاتا ہے سینما تھیٹر بیلے سرکس سب گیارہ بجے تک ختم اور ساڑھے گیارہ تک بازاروں میں ہو کا عالم ہو جاتا ہے۔ ماسکو میں نائٹ کلب بالکل موجود نہیں ہیں نہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کیبرے وغیرہ ہو سکتا ہے یعنی ماسکو کچھ ہو بہرحال یورپین شہر ہے اور اب تو روسی خاصے خوشحال ہو گئے ہیں اور سیر تفریح پر پیسے خرچ کر سکتے ہیں یہاں نائٹ کلب کیوں مفقود ہیں۔

"دیکھیے پیارے بھائی تفریح اور عیاشی میں بہت فرق ہے" گوبیف صاحب تشریح کرتے ہیں۔

یوں روسیوں کے لیے تفریح کی کوئی کمی نہیں۔ سب سے اعلیٰ تفریح بیلے ناچ ہے جو در پردہ موسیقی پر خاموش رقص کا نام ہے۔ بیلے اٹلی سے شروع ہوا اور پورے یورپ میں اختیار کیا گیا اور وہیں سے خوش حال اور بے تحاشا امریکہ میں آیا مگر نہ جانے کیا سبب ہے کہ روسی بیلے آج بھی دنیا بھر میں سب سے بہتر مانا جاتا ہے۔ مجھے دو بیلے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ "سوان لیک" اور "سلیپنگ بیوٹی"۔ سلیپنگ بیوٹی میں اُستادِ فن چیکووسکی کی بنائی ہوئی دھنیں تھیں یا مغربی محاورے میں چیکووسکی کی موسیقی تھی۔ یہ بیلے رقص دیکھنا میری زندگی کی ایک لاثانی مسرت تھی۔ بیلے کے رقاص اور رقاصائیں پندرہ بیس برس تک زیرِ تربیت رکھے جاتے ہیں تب کہیں جاکر کسی ڈھنگ کے اسٹیج پر جگہ ملتی ہے اور یہ تعلیم یہ تربیت نہایت شدید ہوتی ہے۔ موزوں بچوں کو پانچ سات برس کی عمر سے ہی رقص کی تربیت دی جاتی ہے کئی کئی برس تو صرف ہڈیوں کے جوڑ نرم کرنے قلابازیاں کھانے، بدن متناسب کرنے، سانس کی ورزش اور موسیقی کا مزاج سمجھنے میں صرف ہو جاتے ہیں اور اس کے باوجود یا اس کے ساتھ ساتھ بچوں کو عام تعلیم بھی دی جاتی ہے تاکہ صرف کن رس یا تال پسند ہو کر زندگی کے باقی معاملات سے بے بہرہ نہ رہ جائیں۔ محنت اور تربیت کی بھٹی میں گھل کر جو لڑکے لڑکیاں نکلتے ہیں وہ یقیناً حور و غلمان کہلانے کے مستحق ہیں۔ ایک ایک عضو متناسب بھری بھری پنڈلیاں پتلی کمریں سڈول بازو مضبوط سینے اور ادا ادا میں پھرتی ماحصل میں بیلے کا کام ہی پھرتی کا ہے۔ لمحہ بھر میں تاروں کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ ہوا میں اُڑنا پڑتا ہے یعنی ایک شہ پر زمین سے دو دو تین تین بار چھلانگ لگانی پڑتی ہے جیسے ہرن زقندیں بھرتے ہیں۔ کبھی موسیقی کے بہاؤ کے ساتھ نرم قدموں اور انتہائی تیز رفتار کے ساتھ مختلف سمتوں میں گردش کرنی پڑتی ہے بعض اوقات پورے اسٹیج کا چکر لگانا پڑتا ہے اور اس طرح کہ گردن یا ہاتھوں کے مقررہ انداز میں فرق نہ آجائے۔ سانس لینے میں بے قابو نظر نہ آئیں نتھنے تک پھڑکنے نہ پائیں آنکھیں بار بار جھپکتی ہوئی نظر نہ آئیں۔

اے ہم نظر نزاکتِ رفتار دیکھنا

سلیپنگ بیوٹی میں کہانی کے مرکزی کردار بادشاہ ملکہ شہزادی شہزادہ ہیں اس لیے ان کا لباس بھی فاخرہ تھا قدیم یورپ کا شاہانہ لباس۔ زرق برق ریشمی قبائیں مصنوعی بال اور سب کرداروں کا رکھ رکھاؤ بھی پرانی وضع کا بانکلف۔ یقیناً یہ سب کچھ مجھ جیسے ماضی زدہ کے لیے نہایت پسند۔ یہ وہ مناظر تھے مگر ایسے تماشوں کا کمیونسٹ یعنی اشتراکی یعنی عوامی روس میں ہونا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ فن کی یہ قدریں تو بورژوائی کہی جاتی ہیں۔ ان کا ایک مزدور کسان معاشرے میں اتنا بلند مقام کیوں ہے۔

ہائے بھائی کیوں ان بے چاروں سے رہی ہی روایت پرستی کی خوشیاں چھینے لیتے ہو آگے بڑھو اور یہ کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھو۔ یہ کٹھ پتلیوں کا تماشا بھی ایک انوکھی چیز ہے یہاں ہمارے برصغیر جیسی سڑی بسی لنگوٹوں والی کٹھ پتلیاں کھلے کھلے نظر آنے والے تاروں بلکہ نظر آنے والے ہاتھوں کے اشارے پر نہیں ناچتیں بلکہ ایک باقاعدہ نیم تاریک اسٹیج ہے جسکے پیچھے دھوکا دینے والے پردے اور نیچے تہ خانہ ہے جہاں سے انسانی کردار پتلیوں کو چلاتے ہیں پتلیاں کہانی کے ماحول کے مطابق نہایت عمدہ لباس میں ہوتی ہیں اور کرداروں میں بڑا تنوع ہوتا ہے۔ میں نے جو تماشا دیکھا اس کی کہانی پیرس کی "زوال پسند" سوسائٹی کے گرد گھومتی تھی۔ فلرٹ بے وفا بیویاں اور آوارہ شرابی امرا۔ ایک کردار گھوڑا بھی تھا جو اپنے مالک کی بیوی سے فلرٹ کرتا تھا۔ تمام کہانی مغربی معاشرے پر ایک سخت طنز تھی اور بہت کامیاب اور موثر مگر بہت سے مغربی تماشائی بھی دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ گولوبیف صاحب میرے مذاقِ سلیم کے بارے میں مطمئن نہیں تھے اس لیے رہ رہ کر طنزیہ پہلوؤں کی طرف میری خصوصی توجہ دلاتے تھے اور میں ان کے مذاقِ سلیم کی خاطر زور زور سے ہنستا تھا جس کے بعد وہ بھی زور زور سے ہنستے تھے۔ روسی کم ہنستے ہیں مگر جب ہنستے ہیں تو دل کھول کر ہنستے ہیں۔

روسی سرکس بھی نرالی شے ہے۔ دیگر روسی اداروں کی طرح اس میں بھی پھیلاؤ اور کثرت مردماں کا عنصر نمایاں ہے۔ بہت سارے کردار بہت سارے جانور بہت سارے مسخرے بہت سارے کرتب بعض کرتب نہایت خطرناک اور بے مثال تھے۔ ایک نٹ نے جال لگائے بغیر بہت اونچائی سے دو جھولوں کے درمیان قلابازیاں لگائیں اور واپس اپنا جھولا پکڑ لیا۔ اس وقت تماشائیوں کی گردنیں ادھر اُدھر گھوم گئی تھیں اور دم رک گیا تھا۔ یہ یوکرینی سرکس تھا اور ماسکو میں مہمان آیا تھا اس لیے تماشے کے خاتمے پر کرداروں نے یوکرینی عوام کی طرف سے ماسکو کے عوام کے نام ایک منظوم پیغام گایا۔ اس کی طرز اچھی نہیں تھی میں نے دو چار لفظ پکڑ کر ایک دُھن بنانے کی کوشش کی مگر تھوڑا ہی ایک اور گانے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ رخصتی گانا تھا اور اس میں بار بار ایک نہایت خوش آواز اور پیار لفظ آتا تھا۔

دس وی دانیا

دس وی دانیا

دس وی دانیا کے معنی ہیں خدا حافظ یا گڈ بائی۔ مجھے دس وی دانیا روسی زبان کا سب سے زیادہ پیارا لفظ لگا اور میں نے بڑی فراخدلی سے اس کا استعمال کیا۔ گولوبیف صاحب اور مریم تاجیکی اور دوسرے روسی احباب ایسے خوش ہوتے تھے گویا اگر میں دو چار روسی لفظ اور سیکھ لوں تو وہ کشمیر کے معاملے میں حق

استرداد یعنی ویٹو استعمال کرنے کی بجائے اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دیں گے۔

میلے، سرکس، کٹھ پتلی کے تماشوں، سینماؤں اور کھیلوں کے باوجود عام روسی شگفتہ کیوں نظر نہیں آتے۔ بالکل نئی نسل ذرا کھلے مزاج کی لگتی ہے۔ مگر پرانے یعنی ادھیڑ عمر کے روسی بجھے بجھے سے رہتے ہیں۔ ہاں انھوں نے بڑی سختیاں اُٹھائی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم پھر انقلاب، پھر خانہ جنگی، فلاکت، قحط، پھر اسٹالین کی منتینہ سختیاں، استبداد، پہلا دوسرا تیسرا چوتھا اقتصادی منصوبہ پھر جنگ، پھر قحط، ہولناکی، پھر سرمایہ داری سے سامنے کی ٹکر۔ اسپوتنک مونک اور لیونک الگ قومی وسائل کو کھائے جاتے ہیں۔ مائی ڈیر پوئٹ آف پاکستان، یعنی پاکستانی شاعر اور صرف شاعر تم اس نسل کو جھک کر سلام کرو۔ اس نے بڑے کشٹ اُٹھائے ہیں لڑتے لڑتے فاقے سہتے سہتے، اور منصوبوں کی کامیابی کے لیے قربانیاں دیتے دیتے اس نسل کی ہڈیاں گل گئی ہیں۔ آج روس کے ادھیڑ عمر لوگوں کی نسل روس کی سب سے عظیم نسل ہے۔ ان کے چہروں پر جو یہ جھریاں ہیں یہ بڑی قیمتی جھریاں ہیں۔ انھوں نے چالیس برس میں ایک نیم وحشی قوم ایک بربریت زدہ ملک کو تاریخی تاریکی اور اقتصادی بدحالی سے نکال کر برطانیہ فرانس اور امریکہ جیسے پرانے اور امیر اور طاقتور ملکوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا ہے۔

ہاں یہ آنکھیں یقیناً خوف زدہ ہوں گی کیونکہ انھوں نے اشتراکیت کے تعمیر اور پرچار میں بڑی سفاکیاں دیکھی ہیں۔ ایک نیا ان جانا سخت گیر نظام نرم روندیوں کی طرح داخل نہیں ہوتا۔ اس کے جلو میں آندھی اور طوفان ہوتے ہیں۔ لاکھوں بے گناہ اور گناہ گار یعنی اختلافی نظریات والے مارے جاتے ہیں۔ کھیتوں کے کھیت، بستیوں کی بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ بے مقصد اور بے کار خون بہتا ہے اور عام انسانی قدریں، انسانی جذبات کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ ان لوگوں نے اسٹالین کا استبداد دیکھا ہے۔ بیریا کے مظالم برداشت کیے ہیں۔ یہ نازیوں کے شدائد سے گذرے ہیں اور دوسری جنگ عظیم میں روس کے ایک چوتھائی نوجوان گنوا بیٹھے ہیں۔ ان کے دلوں میں جنگ سے خوف اور اس کے لیے نفرت بھری ہوئی ہے۔ ان کی آنکھیں تھکی ہوئی ہیں ڈری ہوئی ہیں۔

مگر یہ نئی نسل کتنی پیاری ہے۔ ان کی لڑکیاں اپنی ماؤں، خالاؤں، پھپھیوں، نانیوں اور دادیوں کی طرح موٹی بھپھس اور شلجمی رنگت کی نہیں ہیں۔ بلکہ سڈول مضبوط جسموں اور روشن آنکھوں کی مالک ہیں۔ ان کے نوجوان اپنے باپوں، چچاؤں اور داداؤں جیسے کرخت چہروں، بھدی بھدی حرکات سے بہت بہتر صفات رکھتے ہیں۔ وہ چوڑے شانوں والے مسکراتے ہوئے لڑکے ہیں جو اپنے ملکی نصاب

کے مطابق تعلیم یافتہ اور کسی نہ کسی کام میں ماہر ہیں یا اچھا ذہن رکھتے ہیں۔ یہ نئی نسل ایک مضبوط اور یک رُخ نظام کی پیداوار ہے اور ایک پروگرام کی بھٹی میں ڈھال کر نکالی گئی ہے۔ اُسے اپنے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی اور نقطۂ نظر کا غیر جانبدارانہ علم ہی نہیں اس پر باہر کی روشنیاں باہر کی آوازیں قطعی بند ہیں، وہ ایک طرح کنویں کا مینڈک ہے مگر اس میں بھی کیا شک ہے کہ وہ کنواں —— روس —— بہت بڑا ہے۔

"روس میں آزادیٔ اظہار نہیں ہے" سرد جنگ کا ایک نعرہ

"روس میں کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ کوئی اور سیاسی پارٹی نہیں ہے" دوسرا نعرہ

"روس میں ایک پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔ یہاں نہ رٹ پٹیشن۔ ہے نہ آزاد صحافت نہ آزاد تجارت اور۔ اور نہ مذہبی آزادی" تیسرا نعرہ

"مگر جناب اسی روس میں کوئی نواب نہیں کوئی جاگیردار نہیں کوئی بیمار بغیر علاج سڑک پر نہیں مر سکتا کوئی آدمی بھیک مانگنے پر مجبور نہیں۔ کسی پر تعلیم کے دروازے بند نہیں۔ کوئی بیکار نہیں رہ سکتا!"

دیکھیے مولانا آپ پھر کمیونزم پر بحث کرنے لگے۔ اس میں کئی بنیادی مسائل اُٹھتے ہیں۔ برطانیہ میں ہر طرح کی آزادیوں کے باوجود روزگار کی ضمانت ہے اور ہر شہری کے لیے مفت علاج ہے اور ہر بچے کے لیے مفت ابتدائی تعلیم ہے۔ اور بوڑھوں اور معذوروں کی پنشن ہے۔ پھر بھی وہ کمیونسٹ نہیں ہے لیکن آج اس مقام پر پہنچنے کے لیے کتنی صدیاں لگیں اور کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا یہ سب سوچنا پڑے گا۔ اور امریکہ ہی کو لیجیے۔ امریکہ میں آزاد تجارت وصنعت نے کچھ اور ہی رُخ اختیار کیا ہے —— اور —— اور۔

چلیے مولانا ماسکو یونیورسٹی چلیں وہاں چند اساتذہ اور طالب علم مندوبین سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔

ماسکو یونیورسٹی ایک عمارت نہیں ایک چھوٹا سا شہر ہے تین سو بیس ایکڑ قطعہ زمین میں ایک الگ دنیا بسی ہوئی ہے یہاں چوبیس پچیس ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کی عمارت ۳۲ منزلہ امریکن اسکائی سکیپروں کی طرح اور ہوسٹل الگ ہیں جہاں سولہ سترہ ہزار طالب علم رہتے ہیں۔ صرف سائنس کے شعبوں میں ریسرچ کرنے والوں کی تعداد دو ہزار ہے۔ اعلیٰ ریسرچ کے شعبے بارہ ہیں۔ پانسو پروفیسر اور دو ہزار جونیئر اساتذہ ہیں اور اساتذہ میں تقریباً چالیس فیصد خواتین ہیں۔ خواتین کا عمل دخل سب فنی شعبوں میں ہے۔ روسی ڈاکٹروں یعنی طبیبوں کی بچاسی فیصد تعداد خواتین پر مشتمل ہے۔ جب مرد موٹے اور مشقت طلب کاموں میں لگ گئے تو ڈاکٹری تعلیم اور دیگر ہلکے کام خواتین نے سنبھال لیے اور خوب

سنبھالے۔ ہائے نواب مرزا شوق

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

یہاں اُردو کے طالب علم کم ہیں اور ان کی اُردو پر ہندی کا اثر بہت زیادہ ہے کیونکہ پاکستان نے سینٹو کے چکر میں اپنے اُستاد ہی نہیں بھیجے پھر بھی شکر ہے کہ اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن مشرقی زبانوں کا ایک اور ادارہ اوریئنٹل لیا ہے۔ جہاں مجھے دعوت پر بلاکر گویا میرا امتحان لیا گیا۔ اوریئنٹل لیا میں اس شام زیادہ تر خواتین نظر آئیں جو شاید ترجمانی کے لیئے زیر تربیت ہیں۔

"آپ کا اُردو کے نئے عظیم ترین شاعر علی سردار جعفری کے بارے میں کیا خیال ہے"؟ ایک لڑکی نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"بھئی آپ تو انھیں پہلے ہی عظیم ترین شاعر کہہ چکی ہیں اب میں کیا جواب دوں"؟

واہ فیض صاحب۔ چونکہ آپ باقاعدہ کمیونسٹ کارکن نہیں اس لیے آپ کا مقام سردار جعفری سے بھی نیچا کر دیا گیا ہے۔ اب اس بے چاری بچی کو کیا معلوم کہ اردو ادب آج بھی کیسے کیسے جواہر آبدار رکھتا ہے۔

اوریئنٹل لیا یا السنہ شرقیہ کے ڈائرکٹر بہت پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بلیغ اُردو بولتے ہیں اور ان کی نظر اب سے بیس پچیس برس پہلے کے اُردو ادب بلکہ ہمارے علاقائی ادب پر بھی کافی گہری ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی سے انھوں نے خاص دلچسپی ظاہر کی۔ آج کی باتیں وہ بہت کم جانتے ہیں یا ظاہر نہیں کرتے۔

یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے ہم ایک لمبی چوڑی سڑک سے گزر رہے تھے کہ بائیں ہاتھ کو دھوئیں کے دل بادل نظر آئے مگر آگ کے شعلے دکھائی نہیں دیتے تھے۔

"یہ ہمارا کھلا یعنی بے چھت بے دیوار کا سوئمنگ پول ہے"۔ گولوبیف صاحب نے بڑے اطمینان اور فخر سے اطلاع دی۔ اللہ اکبر اس وقت درجہ حرارت بائیس زیر صفر ہے دانت سے دانت بج رہا ہے۔ اور کھلے آسمان کے نیچے یار لوگ ایک گہرے لمبے تالاب میں نہا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پانی ہر وقت گرم رکھا جاتا ہے اور جب تک آپ پانی میں رہیں سردی محسوس ہونے کا امکان نہیں۔ گرم پانی سے بخارات بنتے رہتے ہیں جو دس پانچ گز تک فضا میں بھی حدت پیدا کر دیتے ہیں اور نہانے والے بآرام کپڑے بدلنے کے کمروں میں جا سکتے ہیں۔ میں وہاں تیرنے کے لیے بے قرار ہو گیا مگر سوال یہ تھا کہ تالاب میں اُترنے سے پہلے کپڑے اُتارنے کی ہمت کہاں سے آئے گی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تیرنے والوں کو طبی سرٹیفکیٹ دکھانا

ضروری ہے۔

"اب ماسکو پھر دیکھئے گا۔ ایک راؤنڈ لینن گراڈ کا ہو جائے شب بھر ریل سے چلیں گے۔ صبح پہنچ جائیں گے۔ ریل میں ہمارے ڈبے بہت آرام دہ تھے اور گرم۔ پتا نہیں باقی سب بھی ایسے ہوتے ہوں گے یا وہ لیپا پوتی تھی۔ میرے بستر پر تو مضبوط سفید چادر بھی بچھی ہوئی تھی اور مخملیں تکیے۔ باہر برف گر رہی تھی اندر کوٹ بھی نہ پہنا جاتا تھا۔

لینن گراڈ ماسکو سے پہلے روس کا دار الحکومت تھا۔ اسے خاص طور پر آٹھ فیٹ لمبے بادشاہ پیٹر اعظم نے سجایا اور بنایا تھا۔ ماسکو سے بہت چھوٹا اور بہت سرد ہے۔ درجۂ حرارت پچیس زیر صفر ہے۔ شہر کے بیچ میں دریا ہے تو اہتا ہے جس کے اوپر نو پل ہیں جو شہر کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ یہ شہر دلی اور لاہور جیسا لگتا ہے۔ قدیم شریف سنبھلا سنبھلا۔ کہیں کوئی اسکائی سکریپر نظر نہیں آتا جبکہ ماسکو میں چند عمارتیں بیس تیس منزلہ ہیں مثلاً روسی وزارت خارجہ اور ماسکو یونیورسٹی۔ لینن گراڈ کی قدامت اور تہذیب پر روس کو آج بھی ناز ہے۔ یہ ان کا ثقافتی مرکز ہے اور یہاں کے ادیب ہمارے غیر منقسم برصغیر کے دلی اور لکھنؤ والے اہل زبان کی طرح بامحاورہ روسی جاننے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ماسکو والوں بلکہ باقی تمام روسیوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔

"ماسکو تو ایسا ہی دوغلا قسم کا شہر ہے۔ وہاں ہماری گلیوں کے لونڈے بھی مستند مانے جاتے ہیں" وہ فخریہ کہتے ہیں۔ میں خوش ہوتا ہوں کہ چلو ان میں ایک آدھ عیب تو ہم سے مشترک نکلا۔

یوں تو لینن گراڈ میں چپہ چپہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن چند مقامات عالمی حیثیت کے حامل ہیں۔ مثلاً میں نے اس مقام کو دیکھنے پر اصرار کیا جہاں روس کا پہلا شاعر اعظم پشکن اپنے ایک رقیب سے ڈوئیل لڑ کر مارا گیا تھا۔ گو نوبیف صاحب قدرے خفا بھی ہوئے۔

"ارے جناب میرے پیارے دوست کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انقلاب روس میں سب سے زیادہ اہم نام سمولنک کا ہے۔ جہاں لینن صاحب نے نئے روس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ میرے پیارے وہ سمولنف لینن گراڈ ہی میں ہے۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"اور زار کا سرمائی محل بھی یہیں ہے۔ جس پر انقلابیوں نے قبضہ کر کے زوال پسند حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ کیا آپ سرمائی محل نہیں دیکھیں گے۔"

"میں پہلے پشکن کا مقامِ قتل دیکھوں گا"

یہاں پشکن قتل ہوا تھا ۔ وہ ایک خوبرُو جوان تھا۔ اور روسی زبان کا پہلا عظیم شاعر تھا اور اپنی محبوبہ یا بیوی کے ایک عاشق سے لڑ بیٹھا تھا اس کا بلے پتوں والے درخت کے نیچے اس چھوٹے سے پائین باغ میں اس کی اپنے رقیب سے طے شدہ لڑائی ہوئی جسے ڈوئیل کہتے تھے اور جس کا قاعدہ یہ ہوتا تھا کہ چیلنج یا دعوتِ مبارزت دینے والا اپنے مدمقابل کی ہتک کرتا تھا یعنی اس کے طمانچہ مار دیتا تھا یا کوئی سخت بات کہہ دیتا تھا اور ایک ہاتھ کا دستانہ یا رومال نیچے پھینک دیتا تھا اگر مدمقابل کو لڑائی منظور ہوتی (جو عام طور پر منظور ہوتی تھی کیونکہ دوسری صورت میں وہ سوسائٹی میں منہ نہیں دکھا سکتا تھا) تو وہ اس دستانے یا رومال کو اٹھا لیتا تھا اور پھر فریقین لڑائی کے لیے وقت مقام اور ہتھیاروں کا تعین کر لیتے تھے۔ اور پھر دونوں طرف سے ڈاکٹر۔ ساتھی اور جج آجاتا تھا اور طے شدہ شرائط کے ماتحت لڑائی کرا دی جاتی تھی ۔ یہ شیوہ شرفا کہلاتا تھا اور اس شیوہ شرفا میں ایک نغز گو طرحدار شاعر مارا گیا اور یوں مدتوں کے لیے روسی زبان کے تخلیقی چشمے خشک ہو گئے ۔پشکن روس کا سعدی اور غالب ہے اور اس کا مقام قتل میرے لیے سمولنک اور زار کے سرمائی محل سے کم جاذبیت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ کوئی انقلاب خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو بڑے ادب سے زیادہ عظیم نہیں ہو سکتا نہ خوبصورت نہ موثر۔

زار کا سرمائی محل ملگجے رنگ کے پتھروں اور نیلی کھڑکیوں والی ایک بڑی عمارت ہے ۔ یہاں زار لوگ موسم سرما میں قیام کرتے تھے ملکہ کیتھرائن بھی یہیں رہتی تھی ۔ اور پیٹر اعظم بھی جو دیوقامت انسان تھا۔ اور اب اس صدی میں زار نکولس بھی جسے انقلاب کے جھونکے اڑا کر لے گئے ۔ اس کے محل کا بھی وہی حشر ہوا جو تمام محلات کا ہوتا ہے ۔یعنی اب وہ عجائب خانہ ہے ۔

مگر سبحان اللہ زار کا سرمائی محل کتنا عبرت انگیز عجائب خانہ ہے ۔

ایک غلام گردش ہی میں چلیے تو سنگِ مرمر پر بڑا کام ہے اور چھت پر مسلسل منقش کمانیں بنی ہوئی ہیں بڑے بڑے وسیع کمروں میں سونے چاندی کے بڑے بڑے ظروف جھاڑ فانوس بے شمار ہیں ۔ ایک کمرے میں جسے دیوانِ خاص کہہ سکتے ہیں جہاں زار کی کرسی رکھی جاتی تھی اب روس کا ایک بڑا سا نقشہ آویزاں کر دیا گیا ہے اور نقشے پر روس کے بڑے بڑے شہروں اور اہم مقامات کا نشان یاقوتی ستاروں سے بنایا گیا ہے ۔ یاقوتی ستاروں سے یعنی یاقوت کے لمبے لمبے ٹکڑوں کو ستاروں کی شکل میں ترتیب دے کر نقشے پر چسپاں کر دیا گیا ہے ۔ میں نے نظام حیدرآباد کے لوادہ میں بھی اتنے سارے یاقوت یکجا نہیں دیکھے کہیں بھی نہیں دیکھے ۔

اور میں ہی کیا شاید جوہریوں کے سوا کسی نے بھی یاقوت کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں دیکھا ہوگا۔ ان کی قیمت (اگر کوئی بیک وقت ان کی قیمت دے سکے تو) کروڑوں روپے ہوگی۔ یہاں میں نے دہی ماسکو کریملین والا اعتراض کیا کہ آخر یہ شہنشاہی یادگاریں بیچ کر عوام کے کام میں کیوں نہیں لائی جاتیں مگر روسی مزاج عجیب ہے، یہاں بھی طرح طرح کے بہانے تراش لیتا ہے۔ گولوبیف صاحب نے فرمایا آپ عجیب اعتراض کرتے ہیں! یہ روس کی سربلندی اور عظمت کا نقشہ ہے، اسے پیرس کی فلاں نمائش میں سب سے بڑا انعام بھی مل چکا ہے۔

اسی محل سے متصل ایک عظیم الشان خزانہ ہے یعنی آرٹ گیلری! اس کا نام ہرمتاژ ہے جسے روسی ارمتاژ کہتے ہیں۔ ارمتاژ ملک روس کا سب سے بیش قیمت ثقافتی "مقام" ہے جہاں یورپ بھر کے عظیم مصوروں کے عظیم شاہکار جمع ہیں۔

مجھ پر اور قاری پر ظلم ہوگا اگر اس کی سیر کسی قدر تفصیل سے نہ کی جائے اور حالانکہ میں سمولنک جانے کے لیے تڑپ رہا ہوں مگر ارمتاژ کے مرقعے دل کھینچے لیتے ہیں۔

غمزۂ خوں ریز

اب ہر متاثر یا اِرمتاثر کے رنگ برنگ مرقعے قلم کی یک رنگی کا شکار ہو گئے ہیں۔

خامہ انگشت بدنداں کہ انھیں کیا لکھیے

اس نگار خانے میں کیسے کیسے اُستادانِ فن مثلاً رفائیل اور لیونارڈو داونچی کی مشہور تخلیقات سجی ہوئی ہیں جن کے خاکوں دائروں رنگوں اور مرکزی اور ذیلی تصورات کی تشریح کرنے کو ایک ایک کتاب چاہیے اور میں چاہتا ہوں کہ ایک پیرے یا ایک صفحے میں ایسے فنکاروں کی مدتوں کی محنتوں کا خون کر دوں۔ مثال کے طور پر میں یہ تصویر دیکھ رہا ہوں جس کا نام ہے میڈونا بیُوا جو لیونارڈو داونچی کی بنائی ہوئی ہے اب اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ کہ اس میں حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو گود میں لیے ہوئے مسکرا رہی ہیں۔ حضرت مریم کا رنگ گہرا گندمی ہے اور وہ ایک بھورے اور نیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ تقریباً ایک برس کے ہیں اور انہیں کوئی لباس نہیں پہنایا گیا۔ وہ ایک بہت صحت مند بچے لگتے تھے جس کی پنڈلیاں اور بازو بھرے بھرے اور گدرے گدرے ہیں۔ چلیے چھٹی ہوئی بلکہ یہ بھی کچھ زیادہ تفصیل ہو گئی اور سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا۔ نہ میں نے یہ بتایا کہ داونچی کس ملک کس صدی کا مصور ہے نہ یہ کہ قدیم یورپی مصوری پر عیسائیت کے اثرات کس کس طرح مرتب ہو کر کس طرح جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اور ہر عظیم مصور نے کس کس انداز سے حضرت مریم حضرت عیسیٰ اور دوسرے عیسائی ولیوں، راہبوں اور راہباؤں اور مشاہیر کی زندگی پیش کی ہے۔ اور اگر میں سب کچھ بتا بھی دوں تب بھی میں ان خطوط اور رنگوں کی دلآویزی ان گندے لفظوں میں بند نہیں کر سکتا۔ لاؤ یہ تصویر چھاپ کر دکھیں مگر ابھی ہمارے ہاں رنگ دار چھپائی کہاں ویسے ہی سیدھی سیدھی چھپے گی۔ مگر شاید دو چار فن شناس آنکھیں اس بلیک اینڈ وائٹ میں بھی وہ روح دیکھ پائیں جو عظیم اطالوی مصور لیونارڈو داونچی کے مسیحی جذبے نے موقلم کے ذریعے کپڑے پر

منتقل کردی ہے۔

ہاں بچو یہ لیونارڈو داونچی وہی ہے جس نے مشہور تصویر مونالزا بنائی تھی۔

نوادر متاثر یا بعد زار کا سرمائی محل روس کے ثقافتی ورثے ہیں۔ روسیوں کو برابر یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تم ایک عظیم قوم ہو۔ اب چکر یہ ہے کہ روایات اور مروجہ اقدار سے کتنی ہی بڑی بغاوت کا منصوبہ بنالیا جائے انسانی ذہن ایک دم جذباتی روایاتی اور ثقافتی انقلاب کو قبول نہیں کرتا اس لیے بات چیت تعلیم، افہام و تفہیم میں "محاورے" ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور روایت یہ کہتی ہے کہ عظیم قوم وہ ہے جس کا ماضی بھی عظیم ہو۔ چنانچہ زاروں کی شاہانہ شان و شوکت کے مرقعے ان کے جمع کیے ہوئے نوادر، یادگاریں، جواہر سونا روپا موجود ہے اور تم اپنے ماضی کو شہنشاہی استحصال پسندی اور ظلم و جبر کے علاوہ ان یادگاروں اور خزانوں کے ذریعے بھی جان سکتے ہو۔ بس تمہارا ماضی بھی شاندار اور عظیم تھا۔

گولوبیف سے بحث بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنے بقول ایک "پی یارسے" پاکستانی دوست سے بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ مگر پاکستانی دوست اپنی پریشانی اپنی مایوسی کو چھپا بھی نہیں سکتا۔ جو اسے ایک عظیم اشتراکی سرزمین پر پرورشدہ "درشاہانہ آرٹ" کے نمونے دیکھ کر ہو رہی ہے۔ گولوبیف کا اُردو ترجمہ کبوتر ہوتا ہے اور ماسکو اُردو داں فیض نذر انصاری انوار عظیم وغیرہ انھیں کبوتروف کہتے ہیں۔ وہ کبوتر کی طرح معصوم بھی نظر آتے ہیں۔ میں انھیں چھیڑتا رہتا ہوں۔

بھئی کبوتروف صاحب آپ معصوم آدمی ہیں آپ میری بات نہیں سمجھیں گے۔ بات یہ ہے کہ اسلام تیرہ سو برس میں کتنا ہی خراب ہوگیا ہو مگر جب آیا تھا تو اس نے ایک شدید متعصب اور ایک شاندار زبان بولنے والی قوم کے شاندار تصور قومیت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔ جو مسلمان ہوگیا اس کا کوئی ماضی نہیں رہا، کوئی روایات نہیں رہیں کوئی نسل کوئی رنگ کوئی بنائے خوقیت باقی نہیں رہی۔ وہ لات و منات وہ عربی رجز، وہ خاندانی مفاخرت، وہ قبائلی عصبیت سب کے دھوئیں اڑ گئے اور فخر و مباہات کا ذریعہ اور امتیاز کا نشان قرار پایا۔ ایمان۔ عمل۔ تقوے۔

مگر آپ اس بات کو نہیں سمجھیں گے نہ میں سمجھا سکتا ہوں، آئیے آپ کے شاندار انقلاب کی طرف چلیں۔

سمولنک (سمول نِک) ایک بڑی عمارت ہے جہاں سے لینن نے ۱۹۱۷ء کا سرخ انقلاب برپا کیا تھا۔ ایک دائیں بازو کا انقلاب اس انقلاب سے پہلے ہو چکا تھا۔ جب الیگزینڈر کیرنسکی کے حامیوں

نے زار شاہی کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ مگر اس کے بعد اشتراکیوں نے لینن کی قیادت میں اس کا بھی تختہ اُلٹ دیا تھا۔ انقلاب روس ایک الگ اور طویل کہانی ہے لیکن اس کہانی کا سب سے اہم باب سمولنک میں لکھا گیا تھا جہاں میں کھڑا ہوں یہ جو نیچے بڑا ہال ہے۔ اس کے اسٹیج پر لینن صبح و شام تقریریں کرتا تھا۔ منشور پڑھتا تھا۔ ہدایات دیتا تھا۔ فرامین جاری کرتا تھا۔ میں اسٹیج پر چڑھ جاتا ہوں اور سامنے چار ملکوں کے چار مندوبین کو کھڑا کرتا ہوں جو دوران سفر میں میرے دوست ہو گئے تھے۔

عراق کا خالد السلام

ویٹ نام کا نگواین کانگ فوآن

کوریا کا ایتورے لوگاتو

جاپان کا ناکویاناکامورا

"اچھا تو تم اسٹالین ہو۔ تم ٹراٹسکی۔ تم بخارن اور تم مالوٹوف" میں ان کے نام رکھتا ہوں۔

"اب ہمیں انقلاب کے لیے تیار ہو جانا چاہیے"

میں نے یہ نہیں کہا کہ میں لینن ہوں مگر میں لیڈروں کے انداز میں کھڑا تھا میری آنکھیں ضرور چمک رہی ہوں گی میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

ساتھی مندوبین اپنے اپنے نئے ناموں پر بہت خوش ہوئے۔ یہاں تک کہ ٹراٹسکی بھی خوش ہوا۔ مگر وہ انقلاب پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انھیں میری قیادت پر اعتماد نہیں کیونکہ بہرحال ہم سب ایشیائی ہیں۔ یوروپین دُور کھڑے مسکراتے ہیں اور نفی میں سرہلاتے ہیں۔

میں انقلاب ملتوی کر کے اُوپر کی منزل میں پہنچ جاتا ہوں جہاں لینن رہتا تھا۔ ایک کمرہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہ نشست گاہ ہے۔ دو صوفے والی کرسیاں اور ایک بہت چھوٹی سی میز اور کرسی۔ میز پر پرانی وضع کا ٹیلیفون اب تک رکھا ہوا ہے جسے لینن استعمال کرتا تھا۔ یعنی جس کا آلہ سماعت الگ ہوتا تھا اور بولنے کا الگ۔ قلمدان میں وہ قلم اب تک موجود ہے جس سے لینن لکھتا تھا۔ میں نے اپنے فونٹین پن کی سیاہی سے اس قلم کی نب تر کی اور اس قلم سے یعنی لینن کے قلم سے اپنی نوٹ بک پر ایک لفظ بطور یادگار لکھا۔

وہ لفظ میرا راز ہے

اس نشست گاہ کے برابر میں یعنی بیچ کی عارضی دیوار کے بعد ایک اور بھی چھوٹا حصہ ہے جسے بیڈروم کہہ سکتے ہیں۔ ایک طرف دیوار میں گڑا ہوا پرانی وضع کا آتشداں ہے جس سے کمرہ گرم ہو جاتا تھا اور لوہے

کی دو پلنگڑیاں بھی ہوتی تھیں جن کے بیچ میں سرہانے کی طرف ایک چھوٹی سی تپائی رکھی ہے۔ یہاں لینن اور بیگم لینن سوتے تھے۔ اس تپائی پر ایک لاکٹ قسم کی چیز بھی رکھی ہے۔ جو کسی انقلابی سپاہی نے فرط عقیدت سے بیگم لینن کو پیش کی تھی۔ یہ دونوں کمرے ملا کر کراچی کے مارٹن روڈ والے کوارٹروں کے ایک کمرے سے بڑے نہیں ہیں۔ یا ایک چھوٹے سے فلیٹ کے ایک چھوٹے سے کمرے سے بھی چھوٹے ہیں اور یہاں ایک بہت بڑے ملک کے بہت بڑے انقلاب کا بانی، کمیونزم کا سب سے بڑا علمبردار مبلغ اور دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست کا پہلا حاکم لینن رہتا تھا۔ جو زار کے سرمائی محل میں بھی رہ سکتا تھا۔ اور جو کسی بھی روسی نواب جاگیردار سرمایہ دار کا مکان ذاتی قبضے میں کر سکتا تھا مگر وہ اس میں کام کرتا اور سوتا رہا اور نہ تو اس کی بیوی نے اسے کوئی طعنہ دیا نہ اس کمرے کے چھوٹے سائز کی بنا پر سرخ فوجوں اور ان کے بڑے بڑے افسروں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کیا اور نہ وہ خود اس بے سروسامانی پر شرمایا اور ایک کامیاب انقلاب کا خالق بن کر دنیا بھر کے لیے ایک حیرت انگیز یاد چھوڑ گیا۔

نشست گاہ میں آج کے روسی سرکاری اخبار پراوڈا کا ایک تراشا لٹکا ہوا ہے اور ساتھ ہی ایک تصویر بھی جس میں لینن کے ساتھ غالباً استالین بخارن اور مولوٹوف ہیں۔ استالین کی مونچھیں نکیلی اور کالی ہیں اور مولوٹوف ایک سخت جسم کا بالکل نوجوان آدمی ہے۔ پراودا کے معنی ہیں سچائی گویا اس کمرے میں اکتوبر سچائی کی یاد محفوظ ہے جس نے پچاس برس کے اندر اندر آدھی دنیا کو اپنے شعلوں میں لپیٹ لیا ہے۔

میرے کمیونسٹ ساتھیوں نے سمولنک کی زیارت اس طرح کی جیسے مسلمان مکے مدینے کی زیارت کرتے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں سے سخت عقیدت و احترام ظاہر تھا۔ وہ ایک ایک جگہ رک رک کر تفصیل معلوم کرتے تھے اور مترجمین پوری تفصیل سے سمجھاتے تھے۔ انقلاب روس کے مرکز سے تاریخ سیاست کا کون طالب علم بیزاری دکھا سکتا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں کوشش کے باوجود جذباتی عقیدتمندی میں مبتلا نہ ہو سکا۔ میرے دل پر لینن کی سادہ روی کا اثر سمولنک کی تمام انقلابی یادگاروں سے زیادہ ہوا۔ آخر میں ایشیائی ہوں۔

لیکن —— ابھی اپنی عمر کا سب سے زیادہ پر اثر منظر دیکھنا باقی تھا اور وہ منظر لینن گراڈ ہی میں موجود ہے۔

بس ہمیں لے کر دریائے نوا کی طرف روانہ ہوئی۔ ٹمپریچر پچیس زیر صفر ہے یعنی برف جم جانے کے نقطے سے پچیس درجے نیچے۔ روئی کے گالے سے چاروں طرف اڑ رہے ہیں۔ بس گرم ہے مگر کیا خاک گرم

ہے۔ بیٹھ کر اٹھا نہیں جاتا اور سردی کی شدت سے دماغ میں ایک بے نام نشہ سا اترتا چلا جاتا ہے۔ رستے میں آگے والوں اور مترجمین میں کھسر پھسر ہوئی۔ سب نے ایک شخص کو دس دس روبل دیئے ہیں نے بھی پوچھے بغیر دس روبل چندہ جمع کرنے والے کو دے دیے۔ وہ ایک جگہ اتر گیا اور سفید پھولوں کی ایک چادر لے آیا۔

بس ایک بڑے قطعۂ زمین کے آگے رکی ہوئی ہے جس کے اس پار ایک برف کی سڑک ایک پل سے نیچے گزر رہی ہے۔ یہ سڑک اصل میں دریائے نوا ہے جو جم گیا ہے اور یہ قطعہ زمین وہ قبرستان ہے جہاں لینن گراڈ کے پانچ لاکھ شہری دفن ہیں۔ یہ پانچ لاکھ شہری وہ مرد عورتیں اور بچے ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی محاصرے میں صرف بھوک اور سردی سے ہلاک ہو گئے تھے۔ پانچ لاکھ بے گناہ شہری جو لڑنے بھی نہیں گئے اور شہر کے اندر ہی خوراک اور ایندھن کے قحط سے آہستہ آہستہ ہلاک ہو گئے۔

وہاں سامنے دریا کے اس پار جرمن فوجیں پڑی تھیں اور ادھر یہ قبرستان آباد ہوتا جاتا تھا۔ اب اس قبرستان کا رکھ رکھاؤ بڑے بڑے بادشاہوں کے مقبروں سے زیادہ ہے۔ سامنے کی دیوار سنگِ سرخ کی ہے جس پر موٹے موٹے حرفوں میں روسی شاعروں کی نظمیں کھودی گئی ہیں جو ان بے گناہوں کی یاد میں لکھی گئی تھیں۔

مندوبین نے قاعدہ بنا رکھا ہے کہ جہاں کسی کو قیادت سونپنی ہو تو حاضر لوگوں میں سب سے زیادہ آبادی والے ملک کا مندوب چن لیتے ہیں۔ چینی مندوب ہیت سی قان ہوٹل میں رہ گیا تھا کرشن کر پلانی بس سے اترتے ہی واپس بیٹھ گئے کیونکہ ان سے سردی برداشت نہ ہوئی۔ اب اس مجمعے کی قیادت آبادی ملک کی وجہ سے میرے حصے میں آئی اور میں پھولوں کی چادر سنبھالتا ہوا سرخ دیوار کی طرف بڑھا۔ یورپیوں نے ٹوپیاں اتاریں۔ میں نے ترجمان کے ذریعے اپنے ملک کی رسم واضح کر دی کہ ہم ایسے موقعوں پر ٹوپی نہیں اتارتے میں جناح کیپ پہنے ہوئے تھا۔

مقامِ تکریم یعنی جہاں چادر چڑھانی ہے چند فیٹ رہ گیا ہو گا کہ جرمن شاعر ہرٹس فیلڈ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہرٹس فیلڈ جرمنی کے مشہور کمیونسٹ شاعر ہیں ان کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی وہ انگریزی خاصی اچھی بولتے تھے اس لئے میرے دوست بھی ہو گئے تھے۔

"میرے بچے اگر تم برا نہ مانو تو اس موقعے پر یہ اعزاز مجھے دے دو۔ ان لوگوں کی ہلاکت کا سبب میری قوم تھی۔ میں جرمن ہوں اور گو میں نازیوں کی جیل میں تھا مگر بہرحال جرمنی میرا وطن ہے اور مجھے یہاں

سخت شرم اور ذلت کا احساس ہو رہا ہے "

میں نے دیکھا کہ ہرٹس فیلڈ رو رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے چادر ان کے ہاتھ میں دے دی۔ خود ان کا ہیٹ اُٹھا لیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے آنسو پھولوں پر گر رہے تھے۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ روسیوں پر نازی حملے کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

ہم چند ساعت خاموش کھڑے رہے۔ چاروں طرف سناٹا تھا، اور برف اور کمیونسٹ مندوبین کے جذباتی چہروں نے پورے ماحول کو سخت المناک بنا دیا تھا۔

میں یہ منظر کبھی نہ بھولوں گا۔

واپسی میں ہرٹس فیلڈ نے سب کو بس کے آگے روک لیا۔ وہ پائدان پر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اپنے سر سے پھر ہیٹ اُتار لیا۔

" دوستو۔" انھوں نے بلند آواز سے کہا "یہ شخص کمیونسٹ نہیں ہے۔ پاکستان کمیونسٹ نہیں ہے۔ میں سچا کمیونسٹ ہوں مگر — مگر میں اظہارِ تشکر کے لیے آپ کے سامنے پاکستان کو سلام کرتا ہوں۔"

سب نے تالیاں بجائیں کرشن کرپلانی شیشوں میں سے مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ ایک کمزور ایشیائی نے ایک طاقتور یورپین کا دل جیت لیا ہے۔

جمعہ کی نماز میں نے لینن گراڈ کی مسجد تاتار میں پڑھی۔ شہر میں کوئی تیس ہزار تاتاری آباد ہیں۔ یہ اصل میں سخت مشقت کرنے والا طبقہ ہے جو شہر کے لیے مفید بھی ہے مگر جو مذہب مکمل طور پر چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ لہٰذا ان کے لیے اس میں ادائے فرائض کی اجازت ہے۔ امام صاحب کا مکان مسجد کے ساتھ ہے اور انھیں سرکاری وظیفہ بھی ملتا ہے۔ مسجد خاصی بڑی ہے۔ ٹھٹھہ اور ملتان کی عمارتوں کا سا نقشہ ہے، اوپر جالیدار شہ نشین ہیں جہاں شاید خواتین کا انتظام ہے۔ یا کسی زمانے میں وعظ میں مجمع زیادہ ہوتا ہو گا تو لوگ ادھر بیٹھ جاتے ہوں گے۔ امام صاحب زیادہ عربی جانتے ہیں۔ ایک اور صاحب کسی قدر فارسی جانتے تھے۔ حالانکہ گولوبیف صاحب برابر روسی میں ترجمانی کے چکر میں رہے۔ مگر میں نے ایک دو فقرے براہ راست بول کر کچھ نہ کچھ معلوم کرنا چاہا۔ مذہبی تعلیم گھر میں دے سکتے ہیں، دینی مدرسے کی اجازت نہیں۔ مسجد اوقات نماز کے سوا دیگر اوقات میں نہیں کھلتی۔ کسی قسم کے اجتماع کی اجازت نہیں۔ مسجد میں مکتب قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ کس کا فراد کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی :

گولوبیف صاحب سے پھر بحث ہوئی۔

"بھئی آپ کبوتر کی طرح معصوم ہیں اور ہمارے مذہب میں چرند پرند یعنی بے عقل مخلوق کو سوال جواب کی معافی ہے اس لیے میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔" میں ان کا مذاق اُڑاتا ہوں۔

"اچھا سچ سچ بتایئے یہ متضاد باتیں جو آپ کرتے رہتے ہیں کیا آپ دل سے ان سب پر یقین کرتے کرتے ہیں"۔ وہ مسکراتے ہیں۔

"کون سی متضاد باتیں"

"یہی بہت ساری باتیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ آپ مذہبی بھی ہیں اور سرمایہ داری جاگیرداری کے خلاف شدید جذبات بھی رکھتے ہیں۔ آپ عوامی بہبود کے حامی ہیں اور اعتدال پسند بھی۔ آپ کی رائے میں عوام کی نجات کیسے ہوگی؟"

"اس کا جواب میں آپ کو پندرہ بیس برس بعد کراچی سے لکھ کر بھیجوں گا ان شاءاللہ"

سب گیت مرے

لینن گراڈ۔ لینن گراڈ۔

پہلے اس شہر کا نام پیٹرز برگ تھا یا پیٹروگراڈ تھا بہرحال یہ آٹھ فٹ طویل بادشاہ پیٹر کے نام سے منسوب تھا اور پھر پستہ قد لینن کے نام پر لینن گراڈ رکھ دیا گیا۔ ماضی اور حال میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے ملک میں تو صرف مقامات کے نام تبدیل کیے ہیں اور اس پر بھی پرانے خطاب یافتہ اور ریٹائرڈ افسران ناک چڑھاتے ہیں کہ بھئی یہ لاہور میں لارنس گارڈن کا نام باغ جناح کیوں رکھ دیا۔ الگ باغ بناتے۔ کاش وہ پرانے خطاب یافتہ کسی آزاد ملک کی سیر کھلی آنکھوں سے کریں جہاں دورِ غلامی یا دورِ استبداد کے تمام ورثے عوامی ناموں سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ مگر نہ وہ ایسا کریں گے نہ منٹگمری اور لائل پور اور لارنسپور اور جیکب آباد کے نام بدلے جائیں گے بلکہ اگر مجھ جیسے زیادہ زبان درازی کریں گے تو۔۔۔

چلو بھائی لینن گراڈ دیکھو مطلب کی بات کرو یہ باتیں ابھی بہت قبل از وقت ہیں۔ تمہارے جذبۂ قومی کی مثال ایک بونے کی سی ہے جو ایک دیو قامت آدمی سے لڑ گیا اور اس کے گھونسے مارنے لگا۔ اس دیو قامت آدمی نے صرف بونے کے شانے پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ اب بونے صاحب مکے چلائے جاتے ہیں مگر وہ اس آدمی کے لگتے ہی نہیں۔ خالی ہوا میں گھوم کر رہ جاتے ہیں۔ تمہارے ملک کی غلامانہ ذہنیت بڑی دیو قامت ہے۔ پہلے اپنا قد بڑھاؤ پھر مکے چلانا۔

اسپورٹس اسٹیڈیم کی عمارت اتنی اونچی اور اتنی وسیع ہے کہ ایک الگ دنیا معلوم ہوتی ہے۔ یہاں سے تقریباً سارا شہر نظر آ جاتا ہے، اور دریائے نوا بھی۔ کمیونسٹ فن تعمیر میں سائز یعنی وسعت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ماسکو کا کھلا سوئمنگ پول بھی بہت لمبا چوڑا تھا۔ یونیورسٹی نہایت وسیع ہے اور یہاں اسٹیڈیم میں کوئی سوا لاکھ نشستوں کا انتظام ہے۔

"پی یارے بھائی، گو لو بیف یعنی کبوتر روف صاحب جماکر بولتے ہیں:" روس بہت وسیع ملک بھی تو ہے؟"
اس سہ پہر کو ہم ایک عوامی شادی گھر میں لے جائے گئے۔ کبھی یہ کسی نواب صاحب کا محل ہوگا۔ گنبد نما چھتیں۔ بہت سے کمرے۔ ادھر ایک گول کمرہ اور اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر خاتون تشریف فرما تھیں۔ یہ رجسٹرار تھی۔ اب ایک بغلی کمرے سے دولھا اور اس کے شہ بالے اور دوسرے کمرے سے دلھن اور اس کی سہیلیاں لائی گئیں۔ دلھن یورپین یعنی سفید روس کی تھی۔ مگر ایشیائیوں کی طرح لجاتی شرماتی آئی۔ وہ سفید عروسی جوڑا پہنے ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں جھکی جھکی جاتی تھیں۔ دولھا ایک گٹھے ہوئے بدن کا نوجوان تھا اور مؤدب مکلف تھا۔ دونوں ان رجسٹرار خاتون سے کچھ فاصلے پر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"کیا آپ نے ایک دوسرے کے کاغذات دیکھ لیے ہیں" وہ بولیں۔

دونوں نے اثبات میں سر ہلائے۔

"کیا آپ دونوں اس شادی پر دل سے اور بر بنائے محبت رضامند ہیں؟"

دولھا نے زور سے دا کہا دا DA یعنی ہاں اور دلھن کی آواز اس کی شرمائی ہوئی آنکھوں سے آئی۔ شاید اس نے زبان سے بھی جی ہاں کہا ہوگا۔

اب کچھ اور گفتگو ہوئی جس کا ترجمہ میں نہ سُن سکا۔ اس وقت ماحول سخت مقدس ہوگیا اور ہم لوگ بولنے چالنے کی بیہودگی جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ چند لمحے بعد ان خاتون نے ایک تقریر شروع کر دی اور میں نے گو لو بیف صاحب کو جھنجھوڑا تو انھوں نے بمشکل تمام آخری فقروں کا ترجمہ کیا۔

"میں سوویت قانون کے مطابق آپ دونوں کو میاں بیوی قرار دیتی ہوں۔ میری آرزو ہے کہ آپ دونوں ہمیشہ خوش رہیں۔ از راہِ کرم اس گھر میں اسی تقریب کے لئے دوبارہ نہ آیئے گا۔"

مطلب یہ تھا کہ اگر آپ لوگ طلاق لے لیں اور پھر دوبارہ شادی کریں تو بیشک وہ آپ کا قانونی حق ہے مگر یہاں نہ آیئے گا۔ یہ کتنی خوبصورت بات ہے۔ یہ شادی گھر لینن گراڈ میں اپنی قسم کا پہلا گھر ہے۔ جہاں شادی کی چند پرانی اور رسمی خوشیاں زیادہ خرچ کیے بغیر میسر آجاتی ہیں۔ سیدھا سادا قانون تو یہ ہے کہ رجسٹری کے دفتر میں جاؤ کاغذات پیش کرو اور شادی رجسٹر کرالو مگر اس میں برات کا مزہ نہیں آتا۔ مدتوں سوویت سوسائٹی یہ "عیاشی" بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اب کہیں جاکر ذرا جمی ہوئی ہے تو اتنے سے مزے کی گنجائش نکلی ہے۔ ہاں کاغذات سے کیا مطلب ہے۔ کاغذات کا قصہ یہ ہے کہ سوویت شہری

کے لیے ایک مقامی پاسپورٹ ہوتا ہے جس میں اس کے متعلق جملہ اطلاعات درج اور تصدیق شدہ ہوتی ہیں۔ بڑے خطرات مول لیے بغیر یہ ممکن نہیں کہ آپ ایک شادی کراچی میں اور دوسری ڈھاکے میں اور تیسری پشاور میں فرمالیں اور شہر بہ شہر نام بدلتے رہیں یا آپ کسی گھناؤنے مرض کے شکار ہوں اور اس کے باوجود ایک تندرست معصوم لڑکی پلّے سے باندھ لائیں۔ آپ کے کاغذات میں شادی کے وقت میڈیکل سرٹیفکیٹ کی پڑتال لازمی ہے اول تو منسوب یا منسوبہ خود ایک دوسرے کے کاغذات کی پڑتال کرلیں گے، ورنہ وہ متین خوش مزاج رجسٹرار خاتون منٹ بھر میں آنکھیں بدل کر سارا پردہ فاش کردے گی۔

ہائے اُردو غزل کا شاعر وہ اگر یہاں پہنچ جائے اور فراق و انتظار کے امتحانوں سے گزر کر عرض مطلب زبان پر لائے تو محبوبہ پاسپورٹ اور طبی سرٹیفکیٹ مانگے گی۔

مآلِ سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

کمیونسٹ سوسائٹی میں عائلی قوانین کئی مرحلوں سے گزرے ہیں آزادی۔ پابندی۔ سخت پابندی اور پھر میانہ روی اور پھر پابندی اور پھر کسی قدر آزادی۔ ایک بار طلاق سخت مشکل بلکہ ناممکن بنادی گئی تھی ایک بار جائز ناجائز کا فرق اڑادیا گیا تھا۔ جنگ کے زمانے میں حالات کے تقاضوں نے مزید ترمیمات کرائیں۔ لاکھوں نوجوانوں کے جنگ میں کام آنے سے ریاست کو زیادہ سے زیادہ بچوں کی ضرورت ہوئی تو افزائش نسل پر زور دیا گیا۔ اب ایک اعتدال کی صورت ہے۔ طلاقیں جائز ہیں مگر ناپسند کی جاتی ہیں۔ دو بیویوں کی اجازت "مسلمان" جمہوریتوں میں بھی نہیں ہے۔

شادی کے بعد دولہا دلھن سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ دولہا بہت خوش تھا۔ وہ انجینیئر تھا اور دلھن بھی انجینیئر تھی۔ دولہا کے دوستوں نے بتایا کہ اس نے ایک بڑے رقیب سے لڑکر معرکہ سر کیا ہے اس لیے اپنی خوشی نہیں چھپا سکتا۔ دلھن پر پہلے ایک ادیب عاشق تھا، وہاں ادیب کا مطلب ہم جیسا کافی ہاؤسیا نہیں بلکہ جو ادیب کا پیشہ اختیار کرنے کے قابل ہوجاتا ہے وہ اپر کلاس یعنی اونچے درجے کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ادیبوں کی جماعت بہ حیثیت جماعت روس کے اعلیٰ ترین طبقوں میں شمار ہوتی ہے جس کی آمدنی بیشمار ہوتی ہے اور عزت و تکریم وزرا اور جرنیلوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

تو وہ انجینیئر جو غریب نہ تھا مگر ادیب کی طرح امیر نہ تھا اُس شرمیلی سفید روسی لڑکی کو ایک ادیب سے جیت کر لا یا تھا اور یہ ایک ایسا ہی واقعہ تھا جیسے اپنے ملک میں ایک جونیئر صحافی یا کلرک کسی سی ایس

پی یا بن کے مالک کو شکست دے دے۔

" آپ یہاں چند لفظ بولیے" گولوبیف صاحب نے کھسر پھسر کی۔

" میں کیا کہوں۔ بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو ادیب کا طرفدار رہوں۔ وہ بے چارہ اس وقت نہ جانے کس عالم میں ہوگا۔"

" بھئی آپ پاکستانی عوام کی طرف سے انہیں مبارکباد پیش کیجیے۔ اس کا اثر سب پر بہت اچھا پڑے گا۔ اور دولھا دلھن پر بھی اور رہا وہ ادیب تو صاحب سوویت ادیب آپ جیسا نہیں ہوتا۔"

شادی کی مجلس جلسے میں تبدیل ہوگئی۔ روسی ہر تقریب کو عوامی رنگ ضرور دیتے ہیں عوام کی بات ضرور کرتے ہیں۔ پیتے ہیں تو ایک دوسرے کا جام صحت نوش کر کر کے تقریریں بھی ضرور کرتے ہیں۔

سب لوگ شمپئن پی رہے تھے۔ رنز   ۔اس کا رنگ فرنچ شمپئن کی نسبت ذرا گدلا تھا۔ وہ سنہراپن مفقود تھا جو اصلی فرنچ میں ہے۔ ہم نے سیب کا عرق مانگا۔ مجھے سیب کا عرق روس کا سب سے لذیذ مشروب لگا۔ میٹھا گاڑھا مفرح اور سستا۔

"تووارش دولھا اور تووارش دلہن" میں کھنکارا۔ تووارش کے معنی ہیں دوست رفیق۔ کامریڈ۔ کامریڈ کو ہندوستانی یا برطانوی انگریزی دانوں نے کمیونسٹوں اور کمیونسٹ خیالات کے لوگوں کا لقب مقرر کر رکھا ہے۔ حالانکہ کمیونسٹوں کا اصلی خطابی لفظ ہے تووارش۔ رفیق۔ ساتھی۔ مگر میں نے روس میں بہت کم ایک دوسرے کو تووارش یا کامریڈ کہہ کر خطاب کرتے سنا۔ میں نے چونکہ یہ لفظ نیا نیا سیکھا تھا اس لیے اسے استعمال کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جیسے میں بات بات پر سپاسی بو (شکریہ) کہتا ہوں۔

"تووارش دولھا اور تووارش دلھن" میں نے کہا" میں آپ کو اپنی طرف سے اور اپنے ملک کے عوام کی طرف سے اس مبارک موقع پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

گولوبیف صاحب نے سچ کہا تھا۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ دولھا دلہن اور ان کے میکے اور سسرال والے گویا باغ باغ ہو رہے تھے۔ وہ مجھے میرے ملک کا بہت بڑا آدمی سمجھ رہے تھے اور ایک دوسرے سے بار بار کہتے تھے۔ پاکستانسکی۔ پاکستانسکی یعنی پاکستانی۔ پاکستانی۔

میں یہ رنگ دیکھ کر ایک دم اینگلو عربک کالج دہلی کے اسٹیج پر چڑھ گیا اور سال چہارم کے جوشیلے طالب علم کی حیثیت سے میں نے فلسفہ شادی پر ایک نہایت پُرمغز تقریر کی۔ میں نے انھیں چند قیمتی نصیحتیں بھی کیں اور بطور خاص دلھن کو سسرال والوں کے دل جیتنے کے گُر بتائے۔ جس پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ

گیا۔ کیونکہ وہاں سسرال کا چکر ہی نہیں ہے وہ بے چاری نہ جانے کیا سمجھی ہوگی۔ ابھی میں فلسفہ شادی پر حکمت کے موتی رول رہا تھا کہ دولہا نے جام کا رُخ میری طرف کر کے روسی میں کوئی تقریبی لفظ بولا اور اس نے اور اس کے ساتھیوں نے میرا جام صحت پی لیا۔

تب ان کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے بھی سیب کے شربت کا تیسرا گلاس پی لیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بسیار گوئی کی بورڈم کے باوجود گولوبیف صاحب نہایت شان سے باقی مترجمین کو دیکھ رہے تھے اور باقی مترجمین اپنے منہ دہن پر تاسف اور شرم کی نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ بہرحال گولوبیف صاحب کا پتّھا تیز جا رہا تھا۔

اس شادی میں کل ملا کر کوئی ساٹھ ستر افراد شریک ہوئے اور کل خرچ ڈیڑھ سو روبل آیا۔ روبل ایک پونڈ میں عام نرخ سے چودہ آتے تھے اور اگر سفری چیک بھنا کر لیے جائیں تو ایک پونڈ میں اٹھائیس۔ سیاحوں کو ترغیب دینے اور غیر ملکی زرِ مبادلہ بڑھانے کی ترکیبوں میں سے ایک یہ بھی ہے مگر حساب کے لیے ایک پونڈ کے چودہ روبل ہی سمجھنے چاہئیں۔ گویا تقریباً ایک روپیہ برابر ہے ایک روبل کے۔ ایک سو پچاس روپلے میں سے پچاس دولہا نے دیے۔ پچاس دلھن نے یا اُن کے عزیزوں نے اور پچاس شادی گھر نے یا یہ کہ وہاں کے رعایتی نرخوں نے تقریب سستی کر دی۔ نہ لڑکا یا اس کے والدین قرضدار ہوئے نہ لڑکی کے والدین۔ سب خوش آئے اور خوش گئے۔ نہ بری کا چکر نہ جہیز کا جھگڑا۔

"اے خدا کی مار ایسی شادی پر نوج ہوا" میرے کانوں میں ایک پاکستانی آواز آئی۔ میں نے مفلر زور سے لپیٹ لیا کم از کم آج میں یہ نہیں سننا چاہتا۔

لینن گراڈ سے ماسکو واپس چلے تو وہی آرام دہ ریل۔ گرم کمرے اور کافی اور گپ۔ میرے کمرے میں چار ساتھی جمع ہوئے۔ جرمن شاعر ہرنس فیلڈ کرشن کرپلانی ڈائریکٹر انڈین ساہتیہ اکیڈمی، منگول چوئی ژی لین جی مدجسے ہیں چنگیز خاں کے اصل نام تموجن سے پکارتا تھا اور لینا یوکرینی۔ لینا یوکرینی کا ترجمہ ہوا ہیلن آف یوکرین۔ ہیلن انگریزی جانتی تھی اور کرشن کرپلانی پر مامور تھی۔ وہ گروپ کی سب سے خوبصورت تو نہیں مگر سب سے جاذبِ نظر اور فیشن ایبل عورت تھی کیونکہ وہ ایک بار انگلستان ہو آئی تھی۔ دوسری روسی عورتیں اسے رشک سے دیکھتی تھیں کیونکہ وہ ہونٹوں پر کوئی نرم اور روشن سرخی لگاتی تھی اور گالوں پر گلابی پاؤڈر۔ ایک دوسری مترجم خاتون نے مجھ سے ایک دن چپکے سے اس کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نیلے ڈورے مصنوعی ہیں۔ سرخی پاؤڈر اور نیلے مصنوعی ڈورے یہ سب آج

بھی روس میں نیم عیاشی کے مترادف ہیں ۔ باب ہیر یعنی تو بڑا بال جوانا پلکیں کاٹنا بھنویں باریک اور اونچی کر لینا اور بہت کھلے گلے کا لباس ، یہ بھی روسی خواتین کے لیے حیرتناک اور معیوب امور ہیں

کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

برفباری بہت بڑھ گئی اور گاڑی کو ایک اسٹیشن پر گھنٹوں کھڑے رہنا پڑا ۔ ہم لوگ برداشت نہ کر سکے ۔ ڈبے گرم رکھے گئے مگر چلتی گاڑی میں طاقت نہ تھی ہم گھبرا گئے سو نہ سکے ۔ ——— پھر میری تحریک پر اُس رات سب نے اپنے پہلے عشق کی کہانیاں سنائیں ۔ پھر کہانی سنانے کی تحریک میرے کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں پہنچ گئی اور جب ہم ماسکو پہنچے اور میں نے برف کی سفیدی پر سورج کی زرد زرد کرنیں دیکھیں تو میں اس گروہ مندوبین کی پندرھویں کہانی سُن رہا تھا -- یہ کہانیاں بہت دلچسپ مگر ایک سی تھیں کچھ لوگ سناتے سناتے رو دیے خاص طور پر چینی بہت رو یا ۔ منگول جیسا جسیم شحیم قدآور اور سدا بہار آدمی بھی رو دیا ۔ چنگیز خاں کو روتے دیکھنا ایک عجیب تجربہ تھا ۔ عورتیں تقریباً سبھی آبدیدہ ہوئیں ۔ پھر سب ہنسے ۔ اظہار جذبات کے بعد سب کے چہروں پر ایک طمانیت سی تھی جو زندگی میں بہت کم نصیب ہوتی ہے اب ان کی کہانیاں میری یادوں کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ بن چکی ہیں کبھی سناؤں گا ۔ ابھی نہیں ۔

پلیٹ فارم پر سب نے میرے شکریے کی قرارداد منظور کی اور دوسری قرارداد میں مجھے کنڈیم کیا گیا ۔ (اس وقت کنڈیم کا اُردو محاورہ نہیں سوجھ رہا) کہ میں نے سب کی رات آنکھوں میں کٹوا کر سب کے راز سمیت لیے اس صبح جب سب کے ساتھ میں بھی کھلی کھلی اور بوجھل آنکھیں لیے ہوٹل پیکنگ چلا تو مجھے پہلی بار اپنے ایک پرانے گیت کے بول یاد آئے ۔

خود لکھوں یا کوئی اور لکھے
سب گیت مرے
کچھ سنتے ہیں کچھ گاتے ہیں
سنگیت مرے
سب گیت مرے

عشق آباد گرم ہے

"آپ ہیں بیردی مرادکر با بائیف۔ آپ ترکمانستان کے ادیبوں کی انجمن کے معتمد ہیں" سوویت ادیبوں کے صدر دفتر میں ایک دراز قامت ادھیڑ عمر کے صاحب سے ملایا گیا۔

"السلام علیکم" میں نے تکا مارا۔

"وعلیکم السلام" وہ نشانے پر بیٹھا۔ انھوں نے اسلامی جواب دیا

دوسرے دن وہ کوئی دس مندوبین کو لے کر عشق آباد روانہ ہوئے جو ترکمانستان کا دارالخلافہ ہے اور جہاں ایک شاعر مخدوم قلی کی دوسو پچیسویں برسی منائی جارہی تھی ہمارے ساتھ سفید روس کا کوئی مندوب نہیں تھا۔ بے چارہ منگولین قانوناً روسی تھا سو وہ کیا روسی تھا۔ سفید روس کے ادیب آخر یوروپین ہیں اور ترکمانستان بہرحال ایشیائی جمہوریہ ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ الجھن ہوئی کہ یار لوگ، یہاں تک کہ ایشیائی بھی اشک آباد بولتے ہیں خود بیردی مرادکر با بائیف کو عشق آباد الگ الگ لکھ کر دکھایا تو انھوں نے عشق آباد پر صاد کیا۔ تلفظ بگڑ جانا روسی زبان کا اثر ہے جس میں "ق" کی آواز نہیں ہے۔

ماسکو سے ایک چار پنکھوں والا ایلوشائین لے کر اڑا وہ ڈرائی کاؤنٹ کی طرح تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے چار پنکھے تھے حالانکہ گنتھر صاحب مشہور امریکی صحافی نے لکھا ہے کہ روسیوں کے پاس چار پنکھوں والا جہاز ہی نہیں ہے۔ ممکن ہے میری یادداشت غلط ہو لیکن گنتھر صاحب کا بیان کئی جگہ ویسے بھی غلط ثابت ہو چکا ہے۔ ایلوشائین کی نشستیں حسب معمول مختصر اور تکلیف دہ تھیں مگر سفر آرام سے کٹا۔ ایک بار ہم ادلوں کے طوفان میں پھنس گئے۔ خالد اسلام عراقی بڑا پریشان ہوا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا" اس نے کہا۔ "مگر میں نے سنا ہے ترکمان لڑکیاں بڑی بانکی اور طرحدار

ہوتی ہیں انھیں دیکھے بغیر مرنا بڑی فضول بات ہے"

"آہا ہا آہا! گولو بیف صاحب انجن روم یعنی کاک پٹ یعنی پائلیٹ کے کمرے سے تقریباً ناچتے ہوئے آئے۔ ان کی کبوتر جیسی آنکھیں چمکنے لگیں "عشق آباد گرم ہے بڑے مزے کا موسم ہے سب خبر آگئی ہے"

"کیا ٹمپریچر ہے جناب کبوتر دت صاحب"

"اجی مزا آرہا ہے وہاں تو صرف دس ڈگری ہے"

یعنی نقطۂ انجماد سے دس درجے اُوپر ہے اور گولو بیف صاحب اور دوسرے روسی خوشی کے مارے بے حال ہو رہے ہیں۔

یہ کیسپین (کیس پی ین) ہے۔ وہ سمندر یا جھیل جو روس اور ایران کے مابین حائل ہے۔ نیلا سمندر۔ کناروں پر برف کی لکیریں ضرور نظر آئیں جیسے سرد ے کے لمبے لمبے تکیے بچھے ہوئے ہوں مگر وہ پانی نیلا تھا۔ بالکل نیلا۔ جیسے شمالی ایران کی نازنینوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس سمندر سے روسی اور ایرانی کیوی یا یعنی مچھلی کے سُرخ اور سیاہ انڈے نکالتے ہیں اور اس میں جنگی کشتیں بھی کرتے ہیں۔

عشق آباد کے ہوائی اڈے پر چار یا پانچ ہزار مردوں اور عورتوں کا ہجوم موٹے موٹے فرغلوں اور کوٹوں اور کمبل نما چسٹروں میں ٹھٹھرتا ہوا ہلکے ہلکے نعرے مار رہا تھا۔

میں نے جہاز سے اتر کر دائیں بائیں ذرا گردن اُٹھا کر دیکھا اور عجز و انکسار کے تیور بنائے۔ میں نے جلدی جلدی سوچا کہ مجھے اس ہجوم سے کیا کیا کہنا چاہیئے۔ میری نظروں کے سامنے کئی فوٹو گرافر مووی کیمرے والے اور مائیکروفون والے کھڑے تھے۔ میں نے اپنی قومی ٹوپی ذرا بانکپن سے ماتھے پر ٹیڑھی کی۔ و۔ آگے بڑھا۔ لیکن وہ سارا مجمع دوسری طرف مڑ گیا۔ صرف چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ میری ٹوپی کی طرف انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر اپنی قراقلی ٹوپیوں سے موازنہ کرنے لگے۔

وہ مجمع صرف ایک مندوب ایک شاعر کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ شاعر جو میری یاد میں سب سے خوبصورت بوڑھا اور بانکا آدمی ہے۔ اور وہ شاعر تھا ناظم حکمت۔

ناظم حکمت جس ترکی کے شاعر ہیں اب وہ زبان ترکمانستان کی ترکی سے خاصی مختلف ہو گئی ہے لیکن ان کے ترجمے روسی اور روسی جمہوریتوں کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ وہ ترکی کے جلاوطن کمیونسٹ تھے جنھیں روس میں پناہ دی گئی تھی۔ وہ کمیونسٹ ترکمانستان میں ایک ہیرو کی طرح پوجے جا رہے تھے۔ اس بکھرے ہوئے مجمع کے علاوہ، سامنے کئی سولہ کے لڑکیوں کی قطار لگی ہوئی تھی جو اُن سے ہاتھ ملانے

اور ان کے آٹوگراف لینے کے لیے بے قرار کھڑے تھے۔ سردی سے ان کی ناکیں سرخ ہوگئی تھیں اور ان میں سے بہتوں کے پاس دستانے بھی نہیں تھے۔

ہمارے ممدوح کا نام تھا مخدوم قلی لیکن پڑھے لکھے لوگ بھی مختم قلی بول رہے تھے۔ وہی بات کہ چونکہ روسی رسم الخط ہر جمہوریت میں لازمی ہے۔ اور پڑھنے والے زیادہ تر روسی ہی کے ذریعے اپنی چیزیں بھی پڑھتے ہیں اس لیے "مقامی" تک مخدوم کو مختم کہتے ہیں۔ مخدوم قلی ترکمانستان کے میاں نظیر اکبرآبادی تھے۔ عوامی شاعر جو ترکی میں لکھتے تھے ——— ان کا زمانہ دوسو پچیس برس پہلے کا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کے مشاہیر میں نہیں ہوں گے۔ ورنہ فارسی کی معرفت ان کا نام اور کلام ہندوستان میں ضرور پہنچ جاتا۔ اب ہر جمہوریت کو ایک ایک قدیم عوامی ادیب چاہیے تاکہ اس کے سہارے بے ضرر قسم کے ثقافتی ہنگامے ہو جایا کریں۔ چنانچہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر مخدوم قلی لے آئے گئے۔ ان کی دوسو پچیسویں برسی کی تقریبات کی مختصر فہرست کچھ یوں تھی۔

صبح۔ عام جلسہ۔ وزیر اعظم جمہوریہ کی تقریر اور پیغامات

دوپہر۔ بڑا ظہرانہ

سہ پہر۔ تقریریں

شام۔ ان کی زندگی پر مبنی ایک طویل ڈراما، ناچ رنگ، تقریریں

دوسری صبح۔ گھوڑ دوڑ جہاں ایک صاحب مخدوم قلی بنا کر تقسیم انعامات کے لیے ہیلی کاپٹر میں لائے گئے۔

ٹیلی ویژن پر تقریریں

شام۔ کتابوں کی نمائش

رات۔ عشائیہ اور تقریریں

اللہ اکبر۔ ہمارے ہاں پورے ملک کے سب سے بڑے ادیب اقبال کی یاد بھی اس طرح نہیں منائی گئی۔ پورا عشق آباد مخدوم قلی کی تصویروں سے مزین ہے۔ ہر آدمی مختم قلی پکار رہا ہے۔ ترکمان خوش ہیں اور فخر سے گردنیں تان کر باتیں کر رہے ہیں۔ میں خوش نہیں۔ میں دل ہی دل میں ان تقریبات کا اقبال کی برسی والی تقریبات سے مقابلہ کر رہا ہوں اور کڑھ رہا ہوں مگر پھر بھی سینہ پھلا پھلا کر بات کر رہا ہوں رات کے جلسے میں میری تقریر سے ہنگامہ بپا ہوگیا۔ ہوا یوں کہ جب اسٹیج کا پردہ اٹھایا گیا اور مخدوم قلی کی ایک بے حد لمبی چوڑی تصویر برآمد ہوئی تو ترکمانیوں نے اپنے قومی ترانے کی دھنیں بجائی تھیں۔ سب کھڑے ہو گئے تھے۔ زیادہ تر مقررین

نے فضول قسم کی تقریریں کی تھیں۔ کمیونسٹ مندوبین تو سوویت نظام کی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتے۔ خالد اسلام بولے تو مخدوم کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے سوویت عوام کی خوشحالی پر اظہار مسرت کرنے لگے۔ کوئی صاحب ترکمانستان کے عوام کے نام اپنی حکومت کی طرف سے خصوصی پیغام محبت دینے لگے۔ میں ڈرا سہما بیٹھا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں نے جو گزارش کی وہ کچھ یہ تھی۔

"آپ نے اپنے عظیم شاعر کی یاد میں اپنا قومی ترانہ بجایا تو مجھے اپنا عظیم شاعر اقبال یاد آ گیا۔ ہم لوگ بھی اس کی یاد میں قومی ترانہ بجاتے ہیں۔ میں کوئی اعلیٰ عہدیدار یا وزیر یا سفیر نہیں ہوں جو اپنے ملک کی طرف سے مخدوم قلی کو کوئی گراں بہا تحفہ پیش کروں۔ ہمارے پاس ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہمارا قومی ترانہ ہے جو ہم سب پاکستانیوں کی دولت ہے۔ مجھے ساز بجانے نہیں آتے جو میں آپ کے سازوں میں اس ترانے کی شیرینی اور لذت بھر دوں لیکن مجھے اس کے بول یاد ہیں ۔۔ میں پاکستانی عوام کی طرف سے آپ کو پاکستان کا قومی ترانہ پیش کرتا ہوں۔"

اب میں اسٹیج سے تقریر کے باکس سے ہٹ کر بیچ میں کھڑا ہو گیا اور اپنے گلے اور سینے کی پوری طاقت سے گانا شروع کر دیا۔

پاک سرزمین شاد باد
کشور حسین شاد باد

سب سے پہلے ناظم حکمت اچانک کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ ساتھ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے وزراء عہدیدار اور مندوبین اور لمحہ بھر میں پورے ہال کے مرد اور عورتیں۔ اور میں سب کچھ بھول گیا۔ میں بھول گیا کہ یہ لوگ فارسی نہیں ترکی بولتے ہیں اور یہ کہ مجھے کل پانچ منٹ بولنے کی اجازت ہے اور یہ کہ یہ جلسہ مخدوم قلی کی یاد میں ہے۔ اور میں گاتا رہا۔

پاک سرزمین شاد باد
کشور حسین شاد باد

اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ تمام لوگ اکھڑے اکھڑے لہجوں میں میرے ساتھ گنگنا رہے ہیں اور بہت سی آوازیں صاف تلفظ ادا کر رہی ہیں یہاں تک کہ بینڈ ماسٹر بھی اپنے عملے سمیت کھڑا ہو گیا اور دو سازندے مجھ سے سُر ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاجیک مندوب میرے الفاظ صاف ادا کر رہے تھے کیونکہ تاجیک فارسی زبان بولتے ہیں۔

میں مڑ کر دائیں ہو رہا تھا تو بردی مراد کا بابائیف آداب کو بالائے طاق رکھ کر دو دو اپنی نشست سے

دوڑ کر آئے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یہ اسلامی اخوت کے سوکھتے ہوئے سوتے تھے۔ یا ایشیائیت کی ہم آہنگی یا میرے اندازِ محبت کا جواب مگر مجھے ایک لمحے کے لیے ان کے سینے میں بڑی فرحت بخش گرمی محسوس ہوئی۔ انھوں نے میری پیشانی چوم لی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ میں جل سا گیا۔

گولو بیف صاحب پیچھے سے دوڑ کر آئے: "آپ صبح کا ناشتہ ناظم کے ساتھ کریں گے۔ یہ انھوں نے خود فرمایا ہے۔"

ہال میں تقریباً پانچ منٹ تک تالیاں بجتی رہیں اور میں اپنی نشست پر سب سے غافل آنکھیں بند کیے گنگنا تا رہا۔ شاید میں بھی رو رہا تھا کیونکہ مجھے اپنی آواز بھرائی ہوئی لگی۔

پاک سرزمین کا نظام
قوتِ اخوتِ عوام
قوم ملک سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

شاید میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ منزلِ مراد۔ وہ قوتِ اخوتِ عوام میری زندگی میں اپنا جلوہ نہ دکھا سکے گی یا ممکن ہے کہ ایک آدھ جھلک دکھا جائے۔ وقت عام طور پر بہت سستی سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی اس کی تیز رفتاری نظر بھی آنے لگتی ہے۔

ناظم حکمت کے ساتھ

عشق آباد مغربی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے شہروں کی طرح لگتا ہے۔ آخر ہے نا ایشیائی شہر۔

ترکمان موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں امپورٹ پورے روس میں بند ہے اور صنعتی ترقی کل چالیس سال سے شروع ہوئی ہے اس لیے سفید روس میں بھی امریکہ اور برطانیہ اور فرانس کی مصنوعات کی سی نزاکت کہاں بلکہ مجھے تو یہ خیال ہے کہ ہماری کپڑملوں کا کپڑا روسی کپڑے سے بہتر نظر آتا ہے۔ پھر یہ تو وسط ایشیا ہے جو صدیوں پس ماندہ رہا۔ اور اب بھی ہے۔

مگر خالد اسلام آف عراق جو ویسے بہت افرد اشین بنتا ہے یورپ کی برتری اور ایشیا کی کمتری کے چکر میں مبتلا نہیں ہے بلکہ ترک طرحداروں میں گرفتار ہے ترکمان طرحدار ہیں غضب کے لوگ۔ عورتیں تو عورتیں ہیں ان کے مرد بھی عباسی خلفا کے عہد میں ایک مفتوح طبقے کی حیثیت سے بغداد پہنچے تو آہستہ آہستہ خلافت پر عملاً قبضہ کر لیا اور پھر عربی ادب اور اس سے فارسی ادب وثقافت میں نفوذ کر گئے یہاں تک کہ حافظ شیراز سے سمرقند و بخارا ہتھیا بیٹھے پھر جو فارسی کے ذریعے چلے تو اردو غزل گو استادوں کا بیڑا کر دیا اور آج تک گاہ گاہ یلغار کر جاتے ہیں۔

"آپ حضرات سے ہم اردو والوں کی پرانی شناسائی ہے" میں ترکمان ادیبوں کی تفصیل بتاتا ہوں۔ انکل پچو مگر وہ خوش ہوتے ہیں۔

ترکمانستان متحدہ شورائیہ روس کی شاید سب سے پس ماندہ جمہوریت ہے۔ ایک لاکھ ستائیس ہزار مربع میل کے علاقے میں کل پندرہ سولہ لاکھ آبادی ہے۔ اس کا ایک تہائی حصہ عشق آباد میں مصروف شوق رہتا ہے اس پرانی اور مشہور سرزمین کا تقریباً اسی فیصد حصہ ریگستان ہے۔ سیاہ ریگستان۔ قراقم عشق آباد ترکمانستان کے انتہائی جنوب میں ایرانی سرحد سے تھوڑی دور ہے یہاں سے مشہد دو تین سو میل دور ہوگا جس کے آگے پاکستان

ہے۔ پاکستان، مجھے جنوب سے گرم گرم خوشبوئیں آتی ہیں۔

"ہمارا سب سے بڑا مسئلہ آبپاشی کا ہے۔ ہمیں نہریں چاہئیں" ترکمان ہمیں جملہ حالات اور اعداد و شمار سے آگاہ کرتے ہیں۔

"ہمارے بڑے لیڈر یہاں سے گزرے تھے اور انھوں نے بھی آبپاشی کی ضرورت پر زور دیا تھا۔" مگر اس وقت سے اب تک نہروں کی تعداد کچھ خاص تو بڑھی نہیں ہاں کام ضرور ہو رہا ہے۔ ہمیں سب منصوبے دکھائے جاتے ہیں۔ نہریں۔ پل۔ بند۔ بجلی گھر۔ تعمیری اور صنعتی منصوبے۔

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

"دل صاحب بے شک وسط ایشیا کے اس پس ماندہ علاقے میں بڑا کام ہو رہا ہے" ہم سرٹیفکیٹ دینے کے انداز سے باتیں کرتے ہیں اور بے تاب ہیں کہ شہر واپس چل کر استقبالی تقریبات کے مزے اڑائے جائیں مگر یہ تو غلط بات ہے۔ لانے والے اتنی دور سے اتنا کرایہ خرچ کر کے لائے ہیں مفت میں تماشے دیکھ کر چل دینا نہایت نامناسب بات ہوگی۔ یہ لیجئے آپ اسے گوجرانوالہ کہہ رہے تھے یہاں تو ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی ہے کچھ غزلیں وزلیں سنائیے۔ انٹرویو دیجئے۔ اسٹیشن نیا ہے ابھی زیر تعمیر ہے۔ ہم کو شہتیروں اور ملبے کو پھاند کر جانا پڑا۔ چنگیز خاں پھلانگنے میں بھدے گر گیا اور کورین گڈے کو بھی دبا لیا۔ کوریائی اپنے پستہ قد اور گٹھے ہوئے بدن کی وجہ سے گڈا کہلاتا تھا۔ وہ چنگیز خاں کے نیچے دب گیا اور بعد میں اس نے اعلان کیا کہ اس کا انتقام وہ ایک منگول لڑکی کو آٹھ آٹھ آنسو رلا کر لے گا یعنی وہ ایک مغلانی سے فلرٹ کرے گا اور پھر اسے دھوکا دے گا۔

"بھا بھا بھا بھا" چنگیز خاں بادلوں کی طرح گرجا ــــ وہ ہنس رہا تھا ــــ مغلانی تم پر انگوٹھا بھی رکھ دے گی تو اٹھ نہیں سکو گے میاں کورین پدے۔ مگر پدے صاحب کو اپنی گلفامی پر ناز تھا وہ منگولیا کی فتح کا منصوبہ بناتے رہے اور انھوں نے خالد اسلام کو اپنا رازدار بنایا۔

"نالش" خالد اسلام نے راز کو اہمیت ہی نہ دی "یار منگولیا بہت دور ہے تم ترکمانستان ہی میں جھنڈے گاڑ دو تو ہم جانیں۔ دیکھو یہ ہرنیاں کیسی کلیلیں کرتی پھرتی ہیں۔ یہاں پہلی بار مجھے اپنی قدیم اور شاندار اور دولتمند عربی زبان سے نفرت ہوئی ہے کیونکہ میری فصاحت و بلاغت یہاں بالکل فلیٹ جا رہی ہے کاش میں پس ماندہ ترکمانی بولتا:

ہاں ترکمانیاں یا ترکنیں واقعی ہرنیوں کی طرح چلبلی اور تیز تھیں مگر دشیرنیوں کی طرح طاقتور اور سخت مزاج بھی تھیں۔ ان کی بھنویں کمانوں کی طرح تھیں اور چہرے کتابی۔ اردو ادب کی کئی تشبیہات چلتی پھرتی نظر آتی تھیں فارسی ادب کی بہت سی تشبیہات کو بھی زندگی ترکمانستان ہی سے ملی۔ مخدوم قلی کی یاد میں جو ڈراما

اسٹیج ہوا تھا اس میں ایک رقص بھی رکھ دیا گیا تھا۔ اس رقص میں لڑکیاں شلواریں یا پشوازیں پہن کر نہیں ناچیں نہ انھوں نے نرت کی نہ بھاؤ بتائے نہ خالی آنکھوں سے کام چلایا۔

وہ چمڑے کے فل بوٹوں اور اسکرٹوں میں ناچیں مجھے ان میں سے کسی کے چہرے پر غازے کی تہیں یاد نہیں نہ آنکھوں میں پنسل کے ڈورے یاد ہیں نہ لبوں پر مصنوعی سرخیاں۔ وہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کی تھیں جیسے پٹھانوں کا رنگ ہے مگر ان کے تیکھے نقوش لمحہ لمحہ دل پر چھریاں مارتے تھے۔ وہ ناچ بھی آزادی کے متوالوں کا ناچ تھا جس میں قدیم ترکمان حریت پسندوں کی ایرانی حکام سے آویزش کی کہانی تھی۔ اس میں رقاصوں کو تیز اور بلند بانگ موسیقی پر بڑی سرعت کے ساتھ گھومنا پڑتا تھا۔ رقاصاؤں کے ہاتھوں میں چمڑے کے ہنٹر تھے جنھیں وہ فل بوٹوں کے دھماکوں کے ساتھ ہوا میں لہرا کر تیز آوازیں پیدا کرتی تھیں پورے آدھے گھنٹے کی مشقت کا اثر ان پر بظاہر کچھ نہ معلوم ہوا۔ جب وہ اسٹیج پر قطار باندھ کر داد وصول کرنے کھڑی ہوئیں تو ان کے چہروں سے تھکاوٹ کا اظہار نہ ہوا۔ ہاں ایک کامنی سی لڑکی مجھے یاد ہے کہ اس کے پتلے پتلے نتھنے تیزی سے پھڑک رہے تھے۔

مگر یہ سرخیاں دور رہی دور کلیلیں کرتی رہیں اور خالد الاسلام جس کا نام ہم نے قیس عراقی رکھ دیا تھا، برابر ترکمانی زبان بولنے کی مشق کرتا رہا اور ہم عشق آباد دیکھتے رہے۔ عشق آباد ۱۹۴۸ء میں ایک خوفناک زلزلے کا شکار ہو گیا تھا جس سے وہ آج تک نہیں پنپ سکا۔ مگر مرکزی ذرائع نے شہر کو دوبارہ آباد ضرور کر دیا ہے۔ شہر کے باہر ایک فوارہ باغ ہے جس کے وسط میں لینن کا مجسمہ نصب ہے۔ گولوبیف صاحب نے بڑے فخر سے بتایا کہ زلزلے میں بھی یہ مجسمہ یونہی قائم رہا۔ پتا نہیں ان کا کیا مطلب تھا کیا وہ لینن کو مافوق الفطرت آدمی کہہ رہے تھے یا اس میں کسی جدید روحانیت کا دخل تھا یا خالص جذباتی عقیدت جو کمیونسٹوں میں ممنوع کہی جاتی ہے۔ بھائی گولوبیف صاحب اب تو پیشانی زلزلے بھی رنگ و روغن دیکھ کر تباہی پھیلاتے ہیں۔ سفید رنگ بچے رہتے ہیں اور ہم کالے نیلے پیلے بھورے لوگ خاکستر ہو جاتے ہیں اور پھر آپ ہماری مدد کو آتے ہیں۔

شہر میں صنعت نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور آس پاس معدنیات نکالنے کا کام زور شور سے ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان سیاہ رنگ صحراؤں میں تیل، گندھک، پوٹاشیم اور جپسم بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جپسم پر مجھ کو بلوچستان یاد آیا آخر کو یہ سب ملحقہ علاقے ہیں۔ مگر خداوندا یہ تیل کا قصہ کیا ہے۔ عرب، عراق ایران، ترکمانستان اور بلوچستان ایک ہی قسم کے علاقے ہیں اور کم و بیش ایک ہی حلقہ معدنیات میں چلے آ رہے ہیں مگر تیل کے سوتے ہمارے ملک تک پہنچتے پہنچتے کیوں خشک ہو گئے ہیں۔

"میرے پیارے برادر مانو تو میں کہوں کہ پہلے اپنے ذہن کے سوتے کھولو پھر تیل کے چشمے آپ ہی ابل

پڑیں گے۔" گولوبیف صاحب خالص پارٹی لائن کی بات کرتے ہیں۔
مگر اس بار انھوں نے بالکل سچ کہا۔
ترکمنستان قدرتی روس نہیں ہے۔ وسط ایشیا کا خطہ ہے جو اب روس کی سیاسی وحدت میں شامل ہوگیا ہے۔ اصل روس کیا ہے۔ اس کا سیاسی نقشہ اس طرح بدلتا رہا ہے کہ خود آج کا سفید روس کبھی جیبوں بادشاہوں اور جمہوریتوں میں بٹا ہوا تھا۔ بہرحال ترکمانستان کبھی مملکت روس میں نہیں تھا پورا وسط ایشیا روس میں نہیں تھا نہ اس علاقے میں اور سفید روس میں نسلی یا لسانی اشتراک تھا۔ اس پر زاروں کی تاخت انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ شاید وہ ہندوستان تک اپنی سرحدیں بڑھانا چاہتے تھے کیونکہ اس وقت سلطنت برطانیہ نے ہندوستان کے پورے برصغیر کو زیر نگیں کر لیا تھا اور وہ ایران اور افغانستان دونوں پر سیاسی اقتدار قائم کر چکی تھی۔ عالمی سیاست ہمیشہ ایک سی رہی ہے۔ آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے پنڈت چانکیہ فرما گئے ہیں
"اے مہاراج آپ اپنے ہمسائے پر اس سے پہلے حملہ کیجیے جب وہ آپ پر حملہ کرنے کے قابل ہو جائے۔"
اور مہاراج ادھیراج زار الیگزانڈر دوم شہنشاہ روس نے مہا پنڈت چانکیہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان پر برطانوی قبضے کے پیش نظر وسط ایشیا کے ان دور دراز علاقوں پر پہلے انتداب پھر تسلط کی سوچی اور یہ مسلمان علاقے آہستہ آہستہ پہلے سلطنت روس اور پھر جمہوریہ شورائیہ روس میں ضم ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ رسل و رسائل کی کمی اور مقامیوں کی آزادروی نے کمیونسٹ حکومت آنے تک یہاں باقاعدہ روسی حکومت قائم نہ ہونے دی۔ کبھی یہ باجگزار ہو جاتے تھے کبھی بغاوت کر کے قبضے سے نکل جاتے تھے کبھی پھر زیر انتداب آجاتے تھے یہاں تک کہ ۱۹۲۵ء میں ازبکستان اور ترکمانستان اور ۱۹۳۰ء میں تاجکستان بھی باقاعدہ سوویت یونین میں شامل ہو گئے۔

"جی ہاں بات یہ ہے کہ یہ مسلمان علاقے لامرکز تھے۔ اسلامی سلطنت کا روحانی مرکز ختم ہو چکا تھا۔ الگ الگ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئی تھیں اور ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں۔ نتیجہ یہ کہ کوئی کسی علاقے کو لے اڑا کوئی کسی کو۔" میں آہ بھر کر گولوبیف صاحب اور دوسرے صاحبان کے آگے "اسلامی" سلطنت کے زوال پر تقریر کرتا ہوں اور پان اسلامزم کا فلسفہ بتاتا ہوں۔ میں جذباتی ہو رہا ہوں اور بار بار مجھے علامہ اقبال کا شعر یاد آرہا ہے جس کا ترجمہ کرتے وقت گولوبیف صاحب بُرا مان رہے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

"بھئی تم بالکل ری ایکشنری اور لاعلم آدمی ہو" برردی مراد کر بابائیف جو ایک بزرگ آدمی اور مشہور ترکمانی شاعر اور میرے میزبان ہیں، ایک دم پھٹ پڑتے ہیں: "پتا نہیں کس دنیا کی اور کس قسم کی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔ گیا اس کے ذمے دار ہم ہیں کہ قدیم اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی، ہم ہر وقت تاریخ پڑھ پڑھ کر آہیں بھرنے کے لیے ہی رہ گئے ہیں تمہیں نظر نہیں آتا کہ اس ویران ترین خطہ ارضی میں ہر جگہ بجلی پہنچی ہوئی ہے۔ ہر قریے میں ہر گاؤں میں اور ہر گھر میں کم از کم ایک بلب موجود ہے۔

ہر گاؤں کے ہر گھر میں بجلی اور ہر مزدور کو کام اور ہر کسان کے لیے کلخوز یعنی مشترکہ زراعت کی زمین اور ہر بیمار کے لیے اسپتال۔ تم دیکھتے ہو کہ نہیں دیکھتے"

"ہاں میں دیکھتا ہوں" میں ان کے غصے کی پروا نہیں کرتا وہ بزرگ آدمی ہیں اور ایک معمولی ناکتہ" ایشیائی علاقے میں سفید روسیوں کی موجودگی میں ایک غیر ملکی سے بحث کر رہے ہیں۔ میں ان کی مجبوری سمجھتا ہوں "مگر کیا آپ لینن صاحب یا اب خروشیف صاحب کی کسی پالیسی پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ کیا آپ تبلیغ کر سکتے ہیں۔ کیا آپ اپنی زندگی اسلامی یا کسی بھی مذہبی قانون کے مطابق گزار سکتے ہیں؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے چیخ چیخ کر اعتراض کرنے کی۔ مجھے جو کہنا ہو، اپنی سویت میں علاقائی کونسل میں کہہ سکتا ہوں۔ صوبائی کونسل میں کہہ سکتا ہوں۔ میں منتخب ہو کر پریزی ڈی یم میں جا سکتا ہوں اور اپنی بات منوا سکتا ہوں"

"کیا آپ واقعی پریزی ڈی یم میں جا کر اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ کیا روسی کابینہ میں کوئی مسلمان وزیر ہوا ہے یا اب ہے؟"

مگر یہ گفتگو بہت طویل تھی اور ناخوشگوار بھی، ایسے مسائل چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں سے طے نہیں ہوتے۔ گویا بڑی ملاقاتوں سے طے ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بابائیف صاحب پر ترکمانستان اور ازبکستان اور تاجکستان اور قزاقستان کے سوویت یونین میں شامل ہونے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ نہ مجھے کسی آزاد جمہوریہ کے بارے میں یہ کہنے کا حق حاصل ہے ـــ مگر مجھے دنیا کے نقشے کے بارے میں سوچنے کا حق تو حاصل ہے۔ مجھے یہ حق تو حاصل ہے کہ قوموں، سلطنتوں، جمہوریتوں کے بنتے بگڑتے جسموں اور رُوحوں پر سوچ بچار کروں۔ آج کی وطن پرستی اور قومی انفرادیت پر غور کروں۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ دنیا میں جب سے تاریخ شروع ہوئی ہے کبھی کوئی ایک وطن ہزار بارہ سو برس سے زیادہ نہیں رہا، یہاں تک کہ لسانی وحدتیں بھی دو ڈھائی ہزار برس سے زیادہ پرانی نہیں ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بھی بولیوں لہجوں کے فرق پیدا ہو کر ان کی انفرادیت ختم ہو جاتی

ہے اور یہ ایک نسل بھی کوئی بڑا رشتۂ اخوت نہیں ہے۔ خود آریہ نسل کے لوگ آج سینکڑوں قومی وحدتوں میں بٹے ہوئے ہیں اور صدیوں سے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ اور۔ اور۔ اس سب کے باوجود سب انسان ایک جیسے ہیں۔ سب زندہ رہنا چاہتے ہیں اور سعی بقا میں مبتلا رہتے ہیں اور عشق کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں اور ظلم کرتے ہیں اور رحم کرتے ہیں اور۔ اور پیدا ہو کر مرجاتے ہیں۔ اور کیا یہ سچ نہیں کہ انسان ہر دور میں نئے نئے خدا بناتا رہتا ہے۔ قبائلیت، جاگیرداری، شہنشاہیت، سرمایہ پرستی، قوم پرستی، جمہوریت، اشتراکیت، کیا یہ سب انسانی تاریخ کے تدریجی خدا نہیں ہیں۔ ابھی چالیس سال پہلے علامہ اقبال نے یورپ کے اثرات پر ایک ضرب لگائی تھی

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

مگر اب یورپ میں بین الاقومیت کے رجحانات پیدا ہوئے تو ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملکوں میں ابھی قومیت اور وطنیت کی لہر آگئی ہے جو قرنوں بلکہ صدیوں چلے گی۔

"بھائی کیا تم نے اپنے شہر اپنے ملک کے تمام مسائل طے کر لیے ہیں"؟ ناظم حکمت بڑی نرمی اور شفقت سے پوچھتے ہیں۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔" نالش" میرا جی کہتا ہے۔

ناظم حکمت خوب آدمی ہیں۔ آجکل میں ان سے متصل کمرے میں رہتا ہوں۔ روزانہ ناشتے سے رات کے کھانے تک ہم ہر وقت ساتھ رہتے ہیں۔ وہ انگریزی بڑی مشکل سے اور روسی فر فر بولتے ہیں۔ انہیں کسی قدر فارسی بھی آتی ہے اس لیے جب گولوبیف صاحب نہیں ہوتے تو میں اُن سے انگریزی اور زیادہ تر فارسی بول کر کام چلاتا ہوں۔ ان سے فارسی بولنے میں مجھے کوئی تکلف نہیں کیونکہ وہ میری غلطی نہیں پکڑ سکتے۔ ان کی نئی بیگم کوئی بیس بائیس سالہ پولش نژاد خاتون ہیں اور بہت خوبصورت ہیں وہ بالکل گلابی ہیں اور ان کی آنکھیں سبز ہیں۔ ان کا لباس نہایت مہنگا ہے آخر کو بڈھے کی جوان بیوی ہیں اور بڈھا بھی وہ ادیب ہے جس کے ترجمے چودہ پندرہ زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔

"یار کیا تم صرف ناظم حکمت کے مداح ہو، کیا تمہیں اس کا یقین ہے"؟ عراقی خالد اسلام مجھ پر پھبتی کستا ہے ——— اور منگولین چی مُر زور زور سے اپنا چنگیز خانی منہ پھاڑ کر ہنستا ہے۔ گولوبیف صاحب ترجمہ کرتے کرتے اپنی کبوتر جیسی آنکھیں مٹکاتے رہتے ہیں۔ ایک دن بیگم ناظم حکمت نے بھی میری نیازمندی کا امتحان لیا۔ وہ اس وقت ایک سنہری ہار پہنے ہوئے تھیں اور ان کے بالوں کا اسٹائل سخت ونڈرفل تھا۔

"اچھے دوست آپ ناظم کی طرح کمیونسٹ کیوں نہیں ہیں آپ تو ایک حساس اور تعلیم یافتہ آدمی ہیں" انھوں نے بڑے سبھاؤ سے کہا۔

"کیا کمیونسٹ ہونے کے بعد میں ناظم کی طرح خوش قسمت ہو سکتا ہوں"

وہ بہت خوش ہوئیں۔ ترجمہ ختم ہوتے ہوتے ان کا گلابی رنگ گہرا سرخ ہو گیا۔ وہ ایک کشمیری سیب لگ رہی تھیں۔

"جی ہاں میری ایک چچازاد بہن مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اور وہ غیر شادی شدہ بھی ہے"

"آہ مادام افسوس کہ میں غیر شادی شدہ نہیں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی عورت آپ سے زیادہ خوبصورت ہو سکتی ہے اب میرا کمیونسٹ ہونا میرے لیے قطعی بیکار ہے۔ نہیں مادام میرا چانس نکل گیا"

ناظم حکمت نے کہنی ماری "برخوردار" انھوں نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا خلاصہ علامہ اقبال نے ایک مصرعے میں کر رکھا ہے

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ

اب بردی مرادکر یا بائیف ہمیں ایک دو انجن والے چھوٹے سے جہاز میں ایک شہر کی طرف لے کر اڑے جس کا نام لوگ بار بار "میری" بتاتے تھے "میری" انھوں نے کہا بڑا قدیم شہر ہے۔ عشق آباد تو جدید ہے یہ اس کا نام اصلی نام بھی نہیں ہے۔ پہلے اس کا نام تھا پولتوراتسک (پین ساکن) اور یہ کوئی قابل ذکر مقام نہ تھا۔ ہمارا اصل شہر تو میری ہے"۔ ارے بھائی ترکمانو خدا کے لیے تم تو اپنے ناموں کا صحیح تلفظ کر لیا کرو۔ اس شہر کا نام مرو ہے میم پیش واؤ (رے ساکن) لو میں تمھیں جہاز میں بیٹھے بیٹھے بتا دوں کہ یہ شہر نسطوری عیسائیوں کے دور اقتدار میں تقریباً چھٹی صدی عیسوی میں بنا تھا۔ یہاں سے ابو مسلم خراسانی نے امویوں کے خلاف عباسی تحریک خلافت کو فوجی مدد دینے کا آغاز کیا تھا اور یہیں چنگیز خاں نے مسلمان آبادی کا پہلا قتل عام کیا تھا جس میں تقریباً دس لاکھ آدمی مارے گئے تھے اور یہ شہر صدیوں مسلمان فاتحین کا کیمپ رہا ہے۔ وہ ایران سے فتوحات پر جاتے وقت یہیں قیام کرتے تھے اور ادھر ادھر پھیلنے کے منصوبے بناتے تھے۔ تمھاری آج کی کئی جمہوریتوں میں کرغیزستان، ازبکستان، تاجکستان میں اسلام اسی راستے سے پہنچا ہے۔ بولو کیا کیا مقام دکھاؤ گے۔

مگر شاید مرو میں کوئی تاریخی مقام باقی نہیں ہے یا کوئی اور بات ہے کیونکہ ہم شہر کی بجائے ایک کلخوز کے قریب اتار دیے گئے جہاں ایک بے آرام اور خطرناک حد تک ٹھنڈا ریسٹ ہاؤس ہے۔ کلخوز اشتراکی یا پنچایتی فارم کو کہتے ہیں جہاں گاؤں کی آبادی مل جل کر اجتماعی سطح پر کھیتی باڑی کرتی ہے۔ روس میں دیگر تمام ذرائع

پیداوار کے ساتھ ساتھ زمین بھی "ریاست" یعنی ملک کی ملکیت ہے۔ کوئی جاگیردار نہیں کوئی زمیندار نہیں۔ کسان کو تھوڑے سے ذاتی مویشی اور مرغی خانے وغیرہ رکھنے کی اجازت ہے ورنہ سب کچھ ریاست کا ہے۔ یعنی خود اس کا ہے۔ اور سب کی محنت کا ثمر انھیں اجتماعی منافع کی تقسیم سے ملتا ہے۔ کلخوز دنیا بھر کے زراعتی نظام میں ایک عظیم الشان تجربہ ہیں۔ ان کے بارے میں چلتی چلاتی بات کہہ دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ دراصل یہاں بھی مسئلہ آزاد ملکیت یا اجتماعی ملکیت اور دونوں کے حسن و قبح کا ہے جو کچھ ہم نے دیکھا وہ ایک نمونے کی طرح تھا۔ ہم نے گاؤں کے پنچایتی دفتر میں مکھیا صاحب سے سوال جواب بھی کیے۔ ہر صحت مند آدمی کو کام ضرور کرنا پڑتا ہے۔ بچوں سے محنت نہیں لی جا سکتی عورتیں مردوں کے کام میں بساط بھر ہاتھ بٹا سکتی ہیں مگر ان پر کھیت میں محنت فرض نہیں۔ ہر آدمی کی کارکردگی کے پیمانے مقرر ہیں اور گو زیادہ کام والوں کو کوئی خاص انعام نہیں ملتا۔ مگر کم کام کرنے والے کا جینا دشوار رہے۔ ٹریکٹر اور جدید آلات مہیا کیئے جاتے ہیں تمام پیداوار حکومت خرید لیتی ہے اور نرخ گھٹانے بڑھانے کی اجازت گاؤں والوں کو نہیں ہوتی۔ بلکہ مارکیٹ کے نرخ بھی حکومت خود مقرر کرتی ہے۔

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ابھی تک لوگ گدھوں پر سواری کر رہے ہیں"۔ کسی نے ایک ترکمان کی طرف اشارہ کیا جو آرام سے ایک لمبی فرغل پہنے اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا ایک گدھے پر بیٹھا چلا جا رہا تھا۔

"ہاں بھائی جان یہ بہر حال ایک پسماندہ علاقہ ہے"

دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے مگر ہموار اور صاف گھر ہیں۔ ایک اوسط گھر دو چھوٹے چھوٹے بکوڈی کے بنے ہوئے کمروں پر مشتمل تھا شاید دیواریں مٹی یا اینٹ کی ہوں گی۔ مگر چھت یقیناً لکڑی کی تھی سوزنی کا فرش تھا جس پر کھانے کی ایک لمبی سی میز تھی۔ ہم فرش پر بیٹھ گئے۔ باہر بادل تھا یا گھری کہر اس لیے بجلی روشن کر دی گئی اور ترکمان دیہاتی میزبان کی بیوی نے کھانا ہمارے آگے رکھ دیا۔ وہ چھینٹ جیسے کپڑے کا رنگ برنگا لباس پہنے ہوئے تھی اور ہماری دیہاتنوں کی طرح پلو کی نقاب سے بار بار چہرہ ڈھانکتی تھی۔

"قورمہ۔ دولمہ۔ چلاؤ۔ پلاؤ۔ شیش کباب" گھٹ گھٹ ترکمان میزبان نے نام بتانے شروع کیے۔ ہمارے سیخ کباب وہاں شیش کباب کہلاتے ہیں (حالانکہ بات الٹی ہے کیونکہ اصل میں کباب اُدھر سے آیا ہے) اور ہمارے کبابوں سے زیادہ وزنی ٹھوس اور لمبے ہوتے ہیں۔ قورمہ بے گھی کا۔ دنبے کے گوشت کی بوٹیاں شاید اُبلی ہوئی۔ مرچ بالکل ندارد۔ نمک اور شاید کالی مرچ۔ دولمہ یہ تھا کہ گلی ہوئی بوٹیوں کو سبزی کے اوپر رکھ چھوڑا تھا۔ ہماری طرح قیمہ بنا کر سبزی میں بھرا نہیں گیا پلاؤ میں یہ لمبے لمبے چاول اور چربی سے صاف بوٹیاں

اور نمک، چلاؤ کو وہاں بالکل دیہاتی اور ذرا گھٹیا کھانا سمجھا جاتا ہے یعنی صرف چاول اور نمک۔ ذرا دیر میں نان آئی موٹے موٹے پھلکے اور پھر ایک بڑے تھال کے برابر روٹی آئی جسے چرک کہتے ہیں۔

"آہا ہا ہا۔ گو لو بیف صاحب انگلیاں چاٹ رہے ہیں"۔ کیا آپ کے یہاں بھی ایسے لذیذ کھانے ہوتے ہیں"

میں بھنایا ہوا تھا مدتوں بعد تو پلاؤ قورمے کی شکل نظر آئی مگر نہ مزہ نہ حلاوت نہ مرچ نہ مسالہ آدمی اپنی چیز کھائے تو قاعدے کی کھائے ورنہ غیر ملکی کھانوں ہی کی اجنبیت سے مزا لے میں نے ترکمان مہمان کو بتایا کہ ان کھانوں نے برصغیر ہند و پاک پہنچ کر کیا شکلیں اختیار کی ہیں مرچ مسالے کی آمیزش نے انہی ناموں میں کیا لذت پیدا کر دی ہے۔ ترکمان خوش تھا بار بار ترجمے کو اپنی خاتون خانہ کی طرف رُخ کر کے زور سے دہراتا تھا۔ وہ دوسرے حصے یا کمرے میں ایک بانس کی آڑ لیے بڑی دلچسپی سے سنتی تھی ایک بار اُس نے کوئی بالکل ٹیکنیکل سوال کیا۔ شاید یہ پوچھا تھا کہ گوشت مسالہ ملا کر بگھارا جاتا ہے یا بھننے کے ساتھ ساتھ، بہرحال کچھ اسی قسم کا سوال تھا جس کا جواب میں نے ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ دیا تاکہ یہ بات ثابت رہے کہ میں ایک ہرفن مولا آدمی ہوں اور میری معلومات عامہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مگر وہ ترجمہ سنتے سنتے ہنسنے لگی۔ وہ مجھے نظر نہ آئی مگر اس کی آواز کھنکتی ہوئی معلوم ہوئی پھر وہ ایک دم شاید احتراماً اندر چلی گئی میں شرمندگی کے مارے فوراً باہر نکل آیا اور اندر گرمی لگنے کا شکوہ کیا جس پر سب بشمول چنگیز خاں حیران ہوئے کیونکہ اس وقت ہوا برفانی تیر و نشتر کی طرح چل رہی تھی۔

ہم نے گاؤں کا اسکول بھی دیکھا جہاں موٹے موٹے صحت مند بچے پوستین پہنے برف کے گولوں سے کھیل رہے تھے۔ انھیں روسی اور ترکمانی دونوں پڑھائی جاتی ہیں۔ ہم نے اسپتال بھی دیکھا اور کوآپریٹو بنک بھی اور اجتماعی مویشی خانہ بھی، گاؤں کے لوگوں میں بھی کم اور بڑے درجے کا فرق نظر آیا۔ فرق شاید انسان کی قسمت میں لکھا ہے۔ مگر وہاں کوئی بھوکا کوئی ننگا کوئی بھکاری اور کوئی لنگڑا لولا نظر نہیں آیا۔ سنا ہے انگلستان اور امریکہ میں بھی تعلیم اور کام اور علاج سب کا حق ہے اور سب کو ملتا ہے مگر وہ مغرب ہے اور یہ ایشیا ہے بلکہ پسماندہ وسط ایشیا۔ اس اسکول اس اسپتال اس اجتماعی کاروبار کی قیمت شاید بہت دی گئی ہے اور برسوں دی گئی ہے مگر اب یہ جگہ رہنے کے قابل معلوم ہوتی ہے۔

"یعنی روسی زبان یہاں بھی لازمی ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ ترکمانی بھی پڑھتے ہیں اور روسی بھی کیونکہ روسی زبان سولہ جمہوریتوں میں مشترک ہونے کی وجہ سے پورا ملک ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو سمجھ سکتا ہے اور اب یہ دور دراز جمہوریتیں ایک

دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہیں۔ زبان کے اشتراک نے شورائیہ روس کو ایک مضبوط بنیاد عطا کر دی ہے۔"

"کمال ہے" میں نے کہا "کیا آپ لوگوں میں صوبہ پرست عناصر نہیں ہیں جو لسانی آزادی کے نام پر ایک قومی زبان کی مخالفت کرتے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"بھئی اس معاملے میں تو آپ لوگ بھی امریکیوں کی طرح ہو گئے ہیں۔ جن کے پورے ملک میں انگریزی بولی جاتی ہے حالانکہ وہاں بے چارے کروڑوں اطالوی یونانی فرانسیسی اور جرمن بھی بستے ہیں۔"

"بھئی آپ کھل کر بات کیجیے آپ کا سوال کیا ہے۔ دیکھیے نا ہماری ریاستیں اپنی اپنی زبان محفوظ رکھتی ہیں اور اسے استعمال کرتی ہیں مگر ملک بھر کے لیے ایک زبان تو ہونی چاہیے نا۔"

"مگر ہمارے وہ تو کچھ اور بات کہتے ہیں آپ سے اور امریکیوں سے زیادہ عقلمند تو وہ لوگ ہی نکلے۔"

اب میں دیوانہ وار ہنسنے لگا وہ مجھے سخت بیوقوف سمجھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے اور جب مجھے سکون ہوا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھیں آخر تک پتا نہ چلا کہ یہ سب فساد اُردو زبان کا تھا۔ اُردو۔ جو ہماری زبان تھی پیارے

مسیحا نفسے می آید

اٹھیے چلیے ہمیں سرزمین روس سے رخصت ہونا ہے۔

بھئی واہ مولانا گولوبیف صاحب آپ نے ہمیں پورے وسط ایشیا میں دکھایا بھی تو چھوٹا سا ترکمانستان جہاں عشق آباد کے علاوہ باقی سب کلخوز ہی کلخوز ہے۔ کلخوز یعنی اجتماعی کھیتی باڑی کا دھندا۔ اب کلخوزوں کی افادیت تو ماہرین اقتصادیات ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہ بھی ایسے ماہرین جنھوں نے آزاد تعلیم حاصل کی ہو۔ ہمارے ہاں سوویت اقتصادیات کا کوئی شعبہ ہی نہیں اور سوویت اقتصادیات تو بہت مختلف چیز ہے اور کل کی بات ہے ہمارے ہاں تو یونیورسٹیوں میں اسلامی اقتصادیات تک کا شعبہ نہیں ہوتا جس پر ہماری ریاست کی اساس رکھی گئی تھی اور جسے اب تک ہم اپنے عزائم اپنی سیاست اپنی زندگی کی شہ رگ سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ چونکہ ہمارے علمی "اسلاف" سب مغربی ہیں اس لیے ہمارے جدید اکابر اساتذہ جو کچھ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اس کے لیے مغرب کی عینک لگانی اور مغرب ہی کی زبان بولنی پڑتی ہے۔ جب ان کا یہ حال ہے تو میں غزل گو آدمی کس شمار قطار میں ہوں اور غزل کو بھی کون مانتا ہے لہٰذا میں آپ کے اس "عظیم سوویت تجربے" پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ یوں بھی میں "آزاد دُنیا" کا آدمی ہوں آپ کو معلوم ہے نا کہ مغرب نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ایک تو آپ کی کمیونسٹ دنیا جسے وہ آہنی پردے والی دنیا کہتے ہیں اور دوسری دنیا جسے وہ فری ورلڈ یعنی آزاد دنیا کہتے ہیں، اس آزاد دنیا میں پرتگال شامل ہے اور اس کا غلام ملک انگولا بھی اور ہندوستان شامل ہے اور اس کا غلام خطہ کشمیر بھی اور ہانگ کانگ بھی شامل ہے جہاں آبادی چینی ہے مگر جہاں ابھی تک برطانوی یونین جیک لہراتا ہے اور جیسیوں غلام ملک تمام تو میں اور بظاہر آزاد ملک بھی شامل ہیں جہاں مغربی امداد کے بل پر آمریت قائم ہے اور اس کے بغیر بھی آمریت قائم ہے۔ یہ سب آزاد دنیا ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ یہاں فری اینٹر پرائز ہے یعنی آزاد معیشت اور ملکیت، حالانکہ ان علاقوں کے بہت سے لوگ یہ کہتے

ہیں کہ مثلاً ملکیت اور معیشت کے چشمے تو صرف چند بڑے گھروں میں پھوٹتے ہیں، باقیوں کے حصے میں صرف آزادی آئی ہے جسے ان علاقوں کے دانشور فریڈم آف ایکسپریشن یعنی آزادیٔ اظہار کے گل قند میں ملاکر چاٹتے رہتے ہیں۔ گل قند آپ نہیں جانتے ارے میاں وہی جسے آپ شوگر کوٹنگ کہتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں وہ ایک مرکب کی شکل میں ہوتا ہے بس گلاب کے پھولوں کو شیرے میں آمیز کرکے تیار کرلیا جاتا ہے اور دیگر فوائد کے علاوہ اس کی تعریف یہ ہے کہ تلخیوں کو اس میں ملاکر آسانی سے معدے میں پہنچادیا جاتا ہے اور منہ کا مزا خراب نہیں ہونے پاتا۔ کاش آپ حکیم بھوڑے میاں کے دواخانے والے گل قند کی حلاوت سے آشنا ہوتے ویسے اب تو ہمارے ہاں اس میں بھی گلاب کے پھولوں کے بجائے گھاس پھوس کا استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال۔ آئی ایم ویری سوری۔ میں گلخوز کے معاملے پر چپ رہوں گا۔ یہ منصب تو علامہ اقبال کا تھا، سر کا خطاب بھی لیا اور پھر بھی فرمایا کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور پھر فرمایا کہ

یہ زمیں تیری نہیں
میرے آبا کی نہیں
تیری نہیں میری نہیں

اور کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا حالانکہ آج ہماری آزاد دنیا میں ایسی بات کرنے والے کا نام کئی رجسٹروں میں درج ہوجاتا ہے جن میں بہت سے رجسٹر غیر ملکی سفارت خانوں کے بھی ہوتے ہیں۔ خود ہمارے ملک کا حال دیکھیے کہ ایک سیاسی تبدیلی ہوئی اور صدر ایوب خاں نے جاگیرداری اور زمینداری ختم کرنے کے بعد بھی زمینداروں کو اچھے خاصے وسیع قطعات زمین پر قابض رہنے دیا تب بھی جاگیردار اور زمیندار لوگ آج تک ان سے دشمن ہیں اپنے تمام وسائل کی مشترکہ قوت ان کے خلاف کام کرنے میں لگا رکھی ہے نا بابا زمین کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے یہ کسی کی نہ ہو مگر جسے مل جائے وہ آسانی سے نہیں چھوڑتا۔

اے جناب کیا اچھا ہوتا کہ آپ مجھے سمرقند و بخارا دکھاتے جو میرے ثقافتی ورثے میں شامل ہیں۔ ہم ہندوستان پاکستان کے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی سخت انٹرنیشنل یا پان اسلامک ہے ہم ایرانیوں یا عربوں کی طرح اپنے آپ کو جغرافیائی حدود کا پابند رکھ کر نہیں سوچتے بلکہ سب مسلمان قوموں، ملتوں اور جمہوریتوں

کی ثقافت اور ان کے کارناموں اور ان کی یادگاروں کو اپنا مال سمجھتے ہیں مثلاً علامہ اقبال تھے تو کشیری برہمن زادے مگر مسجد قرطبہ کے دعویدار بنے رہے حالانکہ قرطبہ اسپین کا ایک شہر ہے چنانچہ ان کے پیرو یعنی ہم لوگ آج بھی سمرقند و بخارا سے اپنا ناتا جوڑے رکھتے ہیں جو ایک زمانے میں اسلامی علوم و فنون کے گہوارے تھے۔

خیر مقام شکر ہے کہ اب پاکستان میں جغرافیائی حدود والی قومی عصبیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے اور مہاجرین تو باہر والے کہلانے لگے ہیں اور اندر والے اصلی پاکستانی۔ اب دانشور ہڑپا اور ٹیکسلا کے قدیم بدھ آثار میں پاکستان کی قومی عظمت کا سراغ لگا رہے ہیں سچ ہے کوئی چیز گھر کی تو ہو اسلام پھر باہر کا مال ہے، عربی ہے حجازی ہے، یہی بہت ہے کہ اسے مذہب کے طور پر برقرار رہنے دیا جائے مگر اپنی "تہذیب" کے ڈانڈے مقامی چیز سے ضرور ملانے چاہئیں خواہ وہ بدھ مت ہی کیوں نہ ہو۔ ہائے گوبیف صاحب

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ظاہر ہے کہ گوبیف صاحب مجھ سے تنگ آچکے ہیں مگر فرض سے مجبور ہیں اور برداشت کیے جاتے ہیں۔ اصل میں مجھے کسی دوسرے ملک کسی خطے کی خوبی ایک آنکھ نہیں بھاتی، میں جہاں جاتا ہوں اور کوئی اچھی بات یا خوشحالی دیکھتا ہوں تو مجھے پاکستان شدت سے یاد آتا ہے پاکستان جو ایک نصب العینی ریاست کے خطوط پر بنا تھا اور جس کی پشت پر ایک عظیم اور طاقتور مذہب کا ہاتھ تھا وہ مذہب جو ایک فلسفۂ ایک لائحہ عمل ایک روحانی مادی اور عالمی نظام کہا جاتا ہے مگر وہ اسلام اپنے ماننے والوں کے سب سے بڑے دیس میں غریب الغربا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ بہت جلد اسلام کے اصل مفاہیم تلاش کرنے پڑیں گے ورنہ پاکستان میں بھی کوئی نہ کوئی بنیادی گھپلا پیدا ہو جائے گا۔

آیئے ماسکو چلیں اور واپسی کی تیاری کریں۔

مرو کے کلخوز میں آخری رات خوب گزری، ایک مقامی فارم کی طرف سے ایک عصرانہ دیا گیا جس میں لمبی لمبی بلند بانگ تقریروں کے علاوہ شعر بھی سنائے گئے سمجھنے سمجھانے میں سخت دقت پیش آئی۔ پہلے اصل کا ترجمہ روسی میں اور پھر مندوبین کی زبانوں میں کیا جاتا تھا۔ زبان کی لطافت تو پہلی ہی منزل پر ختم ہو جاتی تھی۔ خیال منتقل دوسرے درجے میں ہو جاتا ہوگا مگر بقول کسے مرو کا بین الاقوامی مشاعرہ بے حد کامیاب رہا، شعرا میں چی مد سنفوس یعنی چنگیز خاں اور خالد السلام عراقی اور ناظم حکمت مہاجر ترکی شامل تھے۔

چنگیز خاں:

میرے گھوڑے کے سُم گھس گئے ہیں

میرے خیمے کے پردوں کے ٹکڑے اُڑے جارہے ہیں
ہواؤں کی تیزی میں اولوں کے نشتر
مری قیمتی پوستینوں کو پھاڑے چلے جا رہے ہیں
مگر میں تجھے ڈھونڈتا ہی رہوں گا
یہاں تک کہ تو چین کے نرم ریشم کی مانند
اک دن مری گود میں آگرے گی۔

خالدالسلام:

عراق کی کوکھ تیل جَن کر بھی سوکھی
دیے جلیں دور پار بستی میں اور عراقی
سیاہ راتوں میں چھپکے روئیں
عراق ماتا
ہمیں ترا دوُدھ کب ملے گا
عراق ماتا
عراق ماتا
ہمیں ترا دوُدھ کب ملے گا

جمیل الدین عالی

اپنا قول کہ قولِ اکبر
گھر کی مرغی دال برابر

ناظم حکمت:

طبیب حاذق
اگر مرا نصف دل یہاں ہے
تو دوسرا نصف چین میں ہے
کبھی یہ ترکی کا ہے دوانہ
کبھی ہے یونان میں نشانہ

جہاں بھی جس شہر جس زمیں پر بھی ظلم
کے تیر چل رہے ہیں
وہیں مرا دل بھی چھد رہا ہے
مجھے نہیں دل کا عارضہ اے طبیب حاذق
وہ عارضہ اس زمین میں ہے

وہ رات سخت سرد تھی۔ ہماری قیام گاہ کے کمرے انگیٹھیاں جلاکر گرم کر دیے گئے تھے۔ مگر ملحقہ باتھ روم نہیں تھے (باتھ روم کا ترجمہ مناسب نہیں ہے) چنانچہ ضرورت پر باہر جانا پڑتا تھا۔ وہ مقام کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ سب کا نشہ ہرن ہوگیا۔ میں یوں بھی گرم ملک کا آدمی واپسی تک یخ ہوکر رہ گیا اور گھنٹے بھر میں نمونیے کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب میں کمرے میں پڑا پڑا ضبط نہ کرسکا تو آوازیں نکالیں۔

" دکتور۔ دکتور۔ اڈاکٹر۔ ڈاکٹر؛" خالد السلام عراقی چیخنے لگا۔

کوئی صاحب شہر بھاگے اور گھنٹہ بھر میں

مسیحا ئے نمی آید

وہ حسین تھی مہ جبین تھی خوش گمان تھی خوش یقین تھی اس کی آنکھ انگبین تھی۔ اس کی گفتگو رشین تھی۔

مجھے اس رات پہلی بار اس پرانے پٹے پٹائے مصرعے کے معنی سمجھ میں آئے۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ایک خاتون تھیں۔ بائیس تیئیس برس کا سن۔ میں بخار کو اور بخار مجھے بھول گئے۔ گولو بیف صاحب جو میری بیماری سے سخت پریشان ہوگئے تھے، اب خوش خوش نظر آنے لگے۔ وہ مترجم کمپاؤنڈر غرضیکہ سب کچھ بن گئے۔ میں دل ہی دل میں انھیں کوسنے لگا۔

"اجی جناب ہمارے ہاں پچاسی فیصد ڈاکٹر خواتین ہوتی ہیں اور یہ تناسب دوسری جنگ عظیم کے بعد قائم ہوا ہے کیونکہ مردوں کی ضرورت محاذ جنگ پر اور کارخانوں اور کھیتوں میں تھی عورتوں نے جہاں اور بڑے بڑے کام کیے وہاں یہ بھی کیا کہ ملک کی طبی ضروریات پوری کرنے کا بیڑا اٹھالیا —"

بھئی واہ میں نے جی میں کہا۔

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اول تو ہمارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم حرام ہی سمجھی جاتی تھی۔ آئے تو کیا یاروں کو خط لکھوانے ہیں۔ نوج

عورتوں کو پڑھنے لکھنے سے کیا علاقہ؟ اور جہاں شہروں میں "تعلیم نسواں" قسم کی چیز رائج بھی ہے تو ہزار ہا دوسری مشکلات درپیش ہیں۔ علمی اداروں میں نشستیں "محفوظ" ہوتی ہیں جن کے لیے قابلیت کے ساتھ ساتھ کسی "بہت بڑے" کی سفارش نہایت ضروری ہے۔ بھئی گولوبیف صاحب تمہارا سسٹم ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر ہونا کمیونسٹ۔

اس میحانے علاج خوب کیا نہ جلدی نہ پھٹکری۔ باہر سے برف اٹھالایا اور کہا چباؤ۔ ہم خون دل پینے اور لخت جگر کھانے پر تیار تھے برف کیا مال ہے۔ چنانچہ کٹرکٹر چبائی۔ پھر ایک گرم پیالی کافی کی عنایت ہوئی۔ پیتے ہی قے ہوگئی۔ پھر برف عنایت ہوئی پھر کافی اور پھر برف اور جب صبح دم دروازۂ خاور کھلا تو ہم ناظم صاحب کے ساتھ انڈے اور توس اڑا رہے تھے۔

"آپ کا معدہ خراب تھا" گولوبیف صاحب نے اطلاع دی۔ کاش میری بیماری طویل ہوجاتی مگر مسیحا صبح کی چائے پی کر ایک رقیب کی موٹر میں رخصت ہوا۔ رقیب اس کا شوہر تھا۔

"دس وی دا نیا" (سلام رخصت) اس نے کہا۔ ان الفاظ میں اس وقت کتنی نغمگی تھی۔

"بھئی گولوبیف صاحب کیمونسٹ کیسے بنتے ہیں"

"اجی بڑا مشکل ہے بھائی جان۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سب روسی کیمونسٹ ہیں۔ نہیں جناب شاید سب ملا کر اس بیس کروڑ آبادی کے ملک میں کوئی اسی لاکھ کیمونسٹ ہوں گے۔ بچپن سے جوانی تک مختلف تربیتی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں آپ کی درخواست پر غور ہوتا ہے اور پھر بھی پارٹی صرف بہترین لوگ رکنیت کے لیے منتخب کرتی ہے۔ بہترین کی تعریف یہ ہے کہ آپ میں کس حد تک ڈسپلن اور اپنے فلسفے پر اعتقاد ہے:

یعنی وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔

کیا خوب گویا یہ عیب کیمونسٹ نظام میں بھی ہے۔ بھئی اس عیب سے بچنے کے لیے تو ہم وہاں ہیں جہاں آپ آج ہمیں دیکھتے ہیں۔ اسے میاں کاہے کی وفاداری کیسی استواری بس زیادہ سے زیادہ ایمان کا نام لے لو سو وہ بھی برائے نام ورنہ اپنا شیوہ تو یہ ہے کہ ہر ایک کی ہر بات پر اعتراض کرو اور کیے جاؤ یہاں تک کہ وہ ختم ہوجائے اور اپنی طرف سے کوئی مثبت بات مت کرو بلکہ کوئی دوسرا آئے یا دوسرے آئیں تو ان کے پیچھے پڑ جاؤ اور یہی حشر تیسرے کا اور چوتھے کا اور پانچویں کا یہاں تک کہ کوئی باہر والا فلسفہ کوئی حاکم کوئی فاتح کوئی "مددگار" آکر ہماری روحوں ہمارے جسموں ہمارے ملک پر قبضہ جما لیتا ہے اور صدیوں کے لیے تاریخ کا رخ الٹی طرف مڑ جاتا ہے۔ چھوڑو یار ہمیں اپنی پارٹی کا حال مت بتاؤ۔ ہم تو نو پارٹی مین ہیں جیسے ملکوں کی سرحدوں پر

نومینز لینڈ ہوتی ہے۔

ماسکو واپس ہوئے اور بقول کسے شاپنگ شروع کی سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے "گم" جس کے معنے ہمارے ہاں کھو جانے کے ہیں۔ اس اسٹور میں روزانہ استعمال کی ہر چیز ملتی ہے عورتیں مرد لمبی لمبی قطاریں باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ باری مشکل سے آتی ہے۔ ہم کچھ ایسے غیر ملکی بھی نہ تھے لیکن مہنگائی کا وہ عالم کہ الامان۔ جوتے کی جوڑی چار سو روبل یعنی ٹورسٹ نرخ پر دو سو روپے اور سرکاری نرخ پر چار سو روپے۔ آسانی یہ ہے کہ بہت سی چیزیں قسطوں پر مل جاتی ہیں۔ ہوٹلوں میں اور شہر کے دوسرے مکانات پر جوتے کی مرمت کا خاص انتظام ہوتا ہے کیونکہ ایک جوڑا کئی کئی سال چلانا پڑتا ہے۔ روس میں چمڑے کی کمی ہے۔ یہ کمی چالیس برس سے چلی آرہی ہے۔ جب جاگیرداروں اور زمینداروں نے اشتراکی غلبے کے انتقام میں کھیت جلادیے تھے اور مویشی مار دیے گئے تھے تاکہ اشتراکی حکومت کو جلی ہوئی زمینیں اور مرے ہوئے مویشی ملیں۔ زمین تو صاف ہو کر دوبارہ کام میں آگئی مگر مویشیوں کی قلت آج تک محسوس ہوتی ہے۔

"مگر جناب یہ بھی تو دیکھیے کہ ہمیں بیس کروڑ جوڑے بنانے پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی بے جوتے بے کپڑے کے نہیں رکھا جاتا" گوبیف صاحب مزید توضیح کرتے ہیں۔

ریشمی سامان آرائش اشیا، سنگھار دان، یہ سب واجبی واجبی ہیں۔ ان کا شمار تعیشات میں ہے اور روسی اقتصادیات میں ابھی تعیش کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی۔ رومال، جرابیں، نکٹائیاں سب ایک قسم کے معلوم ہوتے ہیں، رنگوں کا فرق ضرور ہے مگر کپڑے کی اقسام میں فرق نظر نہیں آتا۔

میں نے ایک پرنسپر کو کر لیا اور ایک کیمرہ (جس میں مجھ سے آج تک فلم نہیں بھرا جا سکتا)۔ بوشکا۔ بوشکا۔ نانی دادی یعنی بوڑھی عورت کو کہتے ہیں، ایک بہت موٹی سرخ گالوں اور سفید بالوں والی گڑیا۔ بوشکا۔ یہ نام مجھے بہت پسند آیا۔

سوویت ادیبوں کی یونین میں رخصت کے لیے گئے۔ یہ ایک الگ دنیا ہے۔ باژن صاحب اس کے معتمد امور خارجہ ہیں سوالات مطلب کے ہوں تو جواب جلد جلد دیتے ہیں ورنہ بار بار ترجمہ کراتے ہیں۔ پہلے روس میں مختلف اور صوبائی ادبی انجمنیں تھیں ۱۹۳۴ء میں جب اسٹالین صاحب گھر کے دیگر جھگڑوں سے فارغ ہوگئے تو سب انجمنوں کو ملا دیا گیا۔ گورکی صاحب پہلے صدر مقرر ہوئے۔ حکومت نے عمارت دی ابتدائی کام کے لیے روپیہ دیا۔ کاپی رائٹ قانون پہلے ہی یعنی ۱۹۱۹ء میں لینن صاحب کے حکم سے منظور ہو چکا تھا۔ تنظیم و اشاعت کی منزلوں سے گزر کر یہ یونین آج ایک نہایت محکم اور وسیع ادارہ ہے۔ رکنیت

صرف انھی لوگوں کے لیے ہے جن کا پیشہ ہی ادب ہے جمیل الدین عالی اور قدرت اللہ شہاب جیسے جز وقتیے دُور ہی دھکیل رکھے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ روس میں کل وقتی ادیب بھی ہوتا ہے۔ ابھی ایسا ویسا۔ یہاں تو ہوتا ہی کل وقتی ہے۔ لوگ مسودے تک بیچ کر پیسے کما لیتے ہیں۔ کتاب جب جی چاہے چھاپو۔ یونین سے پیشگی رقمیں ملتی ہیں مگر کتاب کے نفع میں آدھے کی ساجھی ہوتی ہے۔ کوئی بیمار ہو تو گزارہ مل جائے گا۔ کتاب لکھ رہا ہو اور وہ مضمون "منظور شدہ" ہو تب بھی گزارہ ملے گا۔ کل رُکن چار ہزار سے زیادہ ہیں یعنی سوویت یونین میں چار ہزار سے زیادہ تو مستند پیشہ ور ادیب ہیں۔ اللہ اکبر! کتاب چل جائے تو لاکھوں کی تعداد میں جاتی ہے نہ چلے تب بھی کم از کم دس ہزار نکل جاتی ہے۔ بورس پیسٹرناک کو ایک سو دس اراکین کے ووٹ سے یونین سے باہر کر دیا گیا تھا۔ اور انھیں صفائی کا موقع بھی دیا گیا تھا۔ یونین سے اخراج کے بعد بھی وہ ادبی فنڈ کے رکن رہے اور ابھی ان کے خاندان کو ان کے حقوق کا روپیہ دیا گیا ہے۔ بورس کا ترجمہ شدہ ڈراما "میری اسٹوارٹ" ماسکو میں اسٹیج ہو رہا تھا۔ باڈن صاحب نے وہاں جانے کی دعوت دی مگر مجھے بورس میں دلچسپی تھی۔ میری اسٹوارٹ کا آزادی اظہار سے کیا تعلق۔

"جی نہیں ایلیا ایرن برگ صاحب آج کل سخت بیمار ہیں" میں نے جب ان سے ملنا چاہا، یونین نے یہی جواب دیا حالانکہ خالد اسلام ان سے مل بھی آیا تھا ایلیا ایرن برگ اس وقت حکومت سے خفا تھے یا حکومت ان سے خفا تھی۔ بہرحال غیر کمیونسٹ مندوبین ان سے نہیں مل سکے۔ ایرن برگ کمیونسٹ نہیں ہیں۔ وہ نسلاً یہودی ہیں اور انھوں نے ایک بیان میں روسیوں کے تعصب کی سخت مذمت کی تھی۔

" ارے بھئی یہاں ادیب اور ادب کی اتنی قدر کیوں ہے؟"

جناب یہاں تعلیم سو فیصد ہو چکی ہے یعنی شہروں قصبوں کی حد تک یقیناً سو فی صد ہے۔ کچھ پرانے لوگ رہ گئے ہوں گے سو لفظوں اور ہندسوں کی شُد بُد ان کو بھی ہو گئی ہے۔ اور اب آپ سوچ لیجیے کہ پورے بیس کروڑ "فوائدہ" لوگوں کو پڑھنے کے لیے کتنا مواد چاہیے۔ نصابی کتابیں تو الگ رہیں صرف ادب کا حال یہ ہے کہ انیس سو اٹھاون تک سمی نوف کی کتاب نودی میرکی سوا لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی تھیں۔ اور سمی نوف آج کے ادیب ہیں — گھر کی زندہ مرغی — نیدوف کے ناول کی دس لاکھ جلدیں بکی تھیں حالانکہ اس ناول کو حکومت نے اتنا ناپسند کیا تھا کہ اس کی فروخت بند کرنی پڑی۔ ادیبوں کو، الٹی اس طرح ملتی ہے جیسے امریکہ میں فلم اسٹار کماتے ہیں کہ بس "ہٹ" ہو گئے تو سب دلدّر دور۔ ماسکو کے پاس ہی مشہور ادیبوں کا الگ محلہ ہے۔ ادیبوں کا محلہ۔ جہاں ان کی رہائش عام شہریوں سے بہت بہتر ہے۔ ایک ایک گھر میں تین تین کمرے

ہیں جو آج روس کے لیے ایک بڑی نعمت ہیں۔ میں نے گولوبیف صاحب سے بہت اصرار کیا کہ اپنا گھر دکھائیں مگر وہ ہر مرتبہ ٹال گئے۔

"بھئی آپ کی بھابی اپنے میکے گئی ہوئی ہے"

اسی طرح میری اور سب روسی بھابیاں اپنے میکے گئی ہوئی تھیں یہاں تک کہ مریم سلگانیک والے میرے بہنوئی بھی میری ہر فرمائش پر "باہر مصروف" نکلے۔ اور میں ایک عام روسی گھر نہ دیکھ سکا۔ مگر سُنا ضرور کہ دس دس بیس بیس مل کر رہتے ہیں۔ اور مشترکہ باورچی خانے اور غسل خانے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں بیرون خانہ یعنی آؤٹ ڈور سرگرمیوں کا بڑا چرچا ہے اور کلچر فروغ پاتا ہے اور یہ سب کچھ پابندیوں اور پارٹی لائن کے باوجود ہے۔

"مگر یہ دیکھ لیجیے کہ کوئی آدمی کھلے آسمان کے نیچے نہیں سوتا" گولوبیف صاحب میرے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ "بھائی صاحب کل چالیس برس میں اتنی بڑی آبادی کے لیے رہائشی انتظام کرنا اور ایک خانہ جنگی اور ایک جنگ عظیم لڑنا آسان کام نہیں تھا"

یا اللہ اس پورے روس کا احاطہ کیسے کیا جائے۔ سائنس، تعلیم، ایجادات، فوجی قوت اور ایک نئے حیران کن سیاسی نظام کی یہ سرزمین جو دنیا کا چھٹا حصہ ہے اور جہاں سے اسپوتنک اڑتے رہتے ہیں ایک باب ایک مضمون میں اس کا ذکر کیسے آسکتا ہے۔ ہاں ایک بات ایک دم محسوس ہوگئی ہے۔ لینن اور اسٹالین اور خرو شچیف جیسے طاقتور لوگ بھی پورے چالیس برس کے عرصے میں خدا کو اس سرزمین سے نہ نکال سکے۔ میں نے ماسکو میں اذان کی آواز سنی لینن گراڈ میں نماز پڑھی اور ترکمانستان میں قرآن دیکھا۔ سچ ہے انسان بہت عظیم ہے مگر اس کا بنانے والا اس سے بھی بہت عظیم ہے وہ کون ہے وہ کیا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ ابھی سب کچھ جاننا ضروری بھی نہیں۔ تو اے جناب کاؤنٹ لیوٹالسٹائی یا طالسطائی میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپنے ۱۹۱۰ء میں انتقال فرمایا تاکہ ۱۹۶۰ء میں آپ کی پچاس سالہ برسی ہو اور مجھے ادھر آنے کا موقع ملے۔ اگر یہ سنہ کچھ اور ہوتا تو حفیظ صاحب اور فیض صاحب یا صرف فیض صاحب ہی آتے۔ اس وقت میرا موقع لگ گیا تو میں پہنچ گیا ہوں ورنہ یہی انتظار رہتا۔ اب مجھے چند روز پمفلٹوں اور کتابوں میں گزارنے دیجیے تاکہ میں نے جو کچھ دیکھا اور مجھے جو کچھ بتایا گیا اس کا ایک خلاصہ تیار کروں۔ ہمارے ملک میں تو درسی معاملات میں بھی خلاصے ہی چلتے ہیں موٹی موٹی کتابیں کون پڑھے۔

طالسطائی کی تصویر چپ چاپ ہے۔ ان کے چہرے پر ایک ایسا سکون ہے جسے سوویت اصطلاح میں

عظیم کہا جاسکتا ہے۔ یہ تصویر ان کے انتقال کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مداحوں اور قدر دانوں نے ان کے بارے میں ـــ "سب کچھ" محفوظ کر لینے کی تمام تر کوششیں کی ہیں۔

یہ قوموں کی زندگی کی نشانی ہے۔ ہم ہیں کہ حکیم مشرق کی ڈھائی تصویریں لئے گھومتے ہیں ـــ ہائے ایشیائی محاوری میں کیا گئے ہیں۔ ۔ مات مادہ پرست، زندہ پرست، زندگی پرست روسی کیا جانیں"

تیرا مہمان رخصت ہوا

ماسکوا، ماسکوا

تیرا مہمان رخصت ہوا

ماسکوا

اب یہاں سے نظم کا آغاز ہونے والا تھا۔ اگر یہ نظم پوری ہو جاتی تو نہ جانے اس خاکسار کے کلام بلاغت نظام میں اس کا کیا مقام ہوتا؛ حالانکہ خود اس کلام کا کیا مقام ہے۔ لیکن اس شام میں روسی دوستوں کی میزبانی کا حق ادا کر دیتا جنھوں نے رخصتی پارٹی کا انتظام کیا تھا۔

مگر نظم بنی ہی نہیں۔ لاکھ زور مارا کوئی بات نہیں بنی۔ شاید مجھ میں وہ بچہ سا ادیب جو بڑا نہ ہو سکا ابھی تک زندہ ہے۔ وہ نثر تو فرمائشی اور موضوعاتی لکھتا رہتا ہے مگر نظم کی تقدیس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ پتا نہیں کسی مقولہ نویس بزرگ نے کب کہا ہے یا خود میں سوچ رہا ہوں کہ زبردستی شاعری کرنا ایسی عورت سے شادی کرنا ہے جسے تم سے نفرت ہو۔

لیکن ماسکوا بہت شیریں آواز لفظ ہے جسے بگاڑ کر انگریزی بولنے والوں نے ماسکو بنا دیا ہے۔ انگریزوں کی سامراجی ذہنیت نے ان کے کردار میں یہ کمال پیدا کر دیا تھا کہ وہ جن ملکوں قوموں شہروں اور لوگوں کے نام ان کے تلفظ میں ادا نہ کر سکیں انھیں بگاڑ کر ایک نیا انگریزی لفظ ایجاد کر لیا کرتے تھے جو سکۂ رائج الوقت ہو جاتا تھا۔ بہت کم مثالیں ملیں گی جب ان کی زبان عاجز ہو گئی ہو۔ مثلاً انگریزی میں دال ہے لام اور ہی کی آوازیں موجود ہیں مگر دہلی کو ڈیلی کہتے اور لکھتے تھے اور ہم بھی یہی کرتے تھے اور اگر کوئی تلفظ کی اصلیت پر زور دے تو اسے گنوار نا ہنجار جاہل اور گنوار کہ پاگل یا مسخرہ سمجھتے تھے۔

خود روس کو انگریز رشیا کہتے ہیں جبکہ اس کا نام ہے رسیا۔ رسی آ۔ ارے بھائی روس کی کیا بات کرتے

ہو وہ تو مکہ معظمہ تک کو خود ہماری اور ہمارے بچوں کی زبانوں سے میکا کہلواتے ہیں۔ میکا اینڈ میڈینا اللہ اکبر۔ اگر آن پبلک یا گرامر اسکول کا کوئی پاکستانی بچہ سیدھا سیدھا مکہ مدینہ بول دے تو "گھٹیا" کہہ کر چلتا کر دیا جاتا ہے۔

آل رائٹ۔ میں پھر روس کی بات کرتا ہوں۔ روس کی بات یہ ہے کہ میں نے روس دیکھا ہی نہیں میں نے ماسکو، لینن گراڈ عشق آباد اور مرو کے کلخوز ضرور دیکھے اس عالم میں باہر برفانی ہوائیں چلتی رہتی تھیں اور اندر گوہیف صاحب کی ترجمانی کی بیساکھیوں بغیر ایک قدم کسی سمت میں نہیں چل سکتا تھا۔ ایسی صورت میں کونسا مصرع "چلے گا"

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

نہیں جی! — اچھا تو وہ چلے گا

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہائیں ہائیں — کیا ہو گیا ہے۔

اچھا تو میں اب اور دور نہیں جا سکتا۔ ملاحظہ ہو۔

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

بات یہ ہے کہ یہ دنیا ہماری دنیا سے بالکل ہی مختلف ہے ان کی بنیادی قدریں ہر شعبۂ زندگی میں باقی دنیا سے اتنی مختلف ہیں کہ انھیں سمجھنے کے لیے بڑے پیمانے پر مطالعے مشاہدے اور سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ سو بھائی

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

بقول کسے روسی لٹریچر کمیونزم کا پروپیگنڈا ہے۔ مغربی لٹریچر کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈہ ہے اپنے ہاں آزادیٔ فکر ہی موجود نہیں تو کیا سوچیں گے کیا لکھیں گے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

"محترم دوستو میں یہاں آکر بہت خوش ہوا ہیں آپ کا اور سوویت ادیبوں کی یونین کا بہت ممنون ہوں۔"

کچھ یوں میں نے اپنی تقریر ختم کی اور لوگوں نے اخلاقاً اور طوعاً و کرہاً تالیاں بجائیں۔

مجھے ایرانڈیا میں نشست ملی۔ یہ بوئنگ نہیں تھا بلکہ چار پنکھوں والا کوئی لیٹرن ہے جو جودہ

پندرہ گھنٹے میں دہلی پہنچائے گا۔ کسٹم پر گولو بیف صاحب مجھ سے اور میں ان سے مل کر آبدیدہ ہوئے۔
میرے ساتھ اپنے پریشر کوکر اور ان کی کتابوں کا بوجھ خاصا بڑھ گیا تھا۔ سوویت ادیبوں کی یونین نے زائد کرایہ بھی ادا کیا۔
میں ان کی اس شرافت کا ذکر بطور خاص کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ ہمارے علما کے وفد نے بھی بیشمار
تحفوں کے علاوہ (جو مجھے نہیں ملے) ایسی سیکڑوں مراعات حاصل کیں۔ مگر انھوں نے اپنے سفرنامے میں ایسی
چھوٹی چھوٹی" باتوں کا ذکر نہیں کیا۔

گولو بیف صاحب جہاز کے زینے تک پہنچانے آئے۔ میں نے انھیں جوتے کا ایک جوڑا اور یونین کے
لیے کتابوں کے تحفے پیش کیے تھے جس سے وہ غیر ضروری طور پر متاثر تھے۔ زینے پر ہم دونوں گلے ملے۔ اس
وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ زمین کی جغرافیائی سرحدیں مٹ گئی ہیں نہ وہ کمیونسٹ روسی ہیں نہ میں پاکستانی
مسلمان بلکہ ایک ہی ماں کے دو شیر خوار بچے ہیں معصوم و منزہ۔ ہماری ذہنی کشمکش ختم ہو چکی تھی ہم اپنے
سیاسی اور سرکاری فرائض اور نصب العینی احتیاطیں بھول چکے تھے ہم دو انسان تھے جو امن کے ساتھ زندہ
رہنا چاہتے ہیں اور بس۔

دروازہ بند ہو گیا۔ سپر کانسٹی لیشن کی فرسٹ کلاس نشستیں بہت آرام دہ ہوتی ہیں۔ یہ بطور خاص
وی آئی پی سیٹ تھی ایک کونے میں صرف ایک ہی کرسی نصب تھی کشادہ نرم اور پاؤں کے لیے بہت
کھلی کھلی جگہ۔ باقی لوگ دور دور کر کے بیٹھے تھے مگر مجھے یہاں بٹھا دیا گیا۔ میں نے سوچا کاش یہ پرواز بہت
دیر تک چلے کم از کم دو چار دن تو چلتی رہے۔ مگر ہوا یہ کہ جونہی میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا دروازہ کھل
گیا۔ دو روسی اندر آئے اور کپتان کی طرف گئے۔ اور پھر اعلان ہوا۔

"برف باری اور کہر پڑ رہی ہے۔ جہاز آج رات نہیں جا سکتا۔ کل اسی وقت جائے گا"

نیچے اترے تو گولو بیف صاحب غائب' ایر انڈیا کے ہندوستانی منیجر نے سخت افسرانہ لہجے میں ہدایات دیں۔
وہ اردو یا ان کے بقول ہندی اتھوا ہندوستانی اچھی طرح جانتے تھے مگر انھوں نے کرخت انگریزی میں بات
کی۔ اس جہاز میں غیر روسی شاید دو ہی تھے ایک میں اور ایک کنیڈین بڑی بی جو سیاحت کر رہی تھیں۔ انھوں
نے ہمارا سامان واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک ہی رات کی بات ہے۔ پتلون ہی میں سو جائیے۔ بین الاقوامی
سفری ضابطہ یہ ہے کہ فرسٹ کلاس کے مسافر فرسٹ کلاس ہوٹل میں ٹھہرائے جائیں اور خرچ ہوائی کمپنی دے
گی بشرطیکہ مسافر اس ملک کے نہ ہوں جہاں سے جہاز چل رہا ہے۔

ذکر نیا ہوٹل یا ہوٹل یوکرین اول درجے کا ہوٹل ہے۔ پیکنگ ہوٹل جہاں میں شام تک تھا اچھا ہے

مگر اتنا بڑا اور جدید نہیں۔ اصل میں یہ سیاحوں کا ہوٹل ہے جہاں مغربی قسم کی آسائشیں بھی مل جاتی ہیں، سیاحوں پر نگہداشت آسانی سے ہو سکتی ہے اور یہیں ان ٹورسٹ بیورو کا دفتر بھی ہے۔

یہ ان ٹورسٹ بیورو بھی عجب چیز ہے۔ آپ کے قیام طعام موٹربس سیر تماشے سب کا انتظام کر دیتی ہے۔ ایک ہی ایجنسی ہے جس کی شاخیں تمام ملک کے اہم حصول میں قائم ہیں اس کے علاوہ کسی اور بیرونی ایجنسی کو کام کرنے کی اجازت نہیں۔ ایک سو بیس روپے روز میں اول درجے کی رہائش۔ چار وقت اول درجے کا کھانا۔ مقررہ اوقات کے لیے ترجمان اور عجائب گھروں مثلاً ماسکو کریملن وغیرہ میں داخلے کا خرچ شامل ہے۔ شاید مقررہ وقت کے لیے ٹیکسی بھی اسی رقم میں مل جاتی ہے۔ سگریٹ وغیرہ سینما، تھیٹر، سرکس وغیرہ کے لیے الگ خرچ کرنا ہوگا۔ مگر خود بیورو کوئی پچیس روپے روز نقد بھی دیتی ہے جس میں کسی حد تک کام چل جاتا ہے۔ سیکنڈ کلاس نرخ بھی ہوں گے مگر میں ٹھہرا فرسٹ کلاس مسافر اس لیے میں نے اپنا وقار کم نہ ہونے دیا۔ اوّل درجے کا نرخ پوچھ کر سگریٹ منہ میں ٹیڑھا کر لیا اور اپنے کمرے میں آ گیا کیونکہ مجھے تو دوسری شام کو واپس آنا تھا۔

ہمارے لیے مفت کمرے اور ساٹھ روبل فی یوم کا انتظام ہوا یعنی ساٹھ روپے یا ساٹھ روبل میں کھاؤ پیو گھومو۔ مگر پہلی رات ہی کٹھن پڑی۔ ان ٹورسٹ کا دفتر بند ہو چکا تھا میں اور کینیڈین خاتون کھانا کھانے بیٹھے تو آٹے دال کا بھاؤ کھلا۔ کوئی بیرا کوئی ملازم انگریزی نہیں جانتا۔ اب گولوبیف صاحب کی قیمت معلوم ہوئی جنھوں نے گھنٹے گھنٹے بھر بیاروں بیروں کو سمجھا بجھا کر ہوٹل ہیکلنگ میں پراٹھے تک پکوا دیے تھے۔ اور اس آسانی کی وجہ سے ہم خود بھی کچھ نہ سیکھنے پائے تھے، ہم نے زور مار کر دو چار لفظ یاد کیے۔

ماسلا = مکھن

منرل واادا = فقط پانی (عام روسی پانی کچا سا لگتا تھا، اس لیے ہم زیر زمین سے نکالا ہوا پانی نوش فرماتے تھے)

چرنک = روٹی

شُشلیک = کباب

چائے = چائے (دیکھا آپ نے چائے ہر جگہ چائے ہے مگر ہم ٹی بولتے ہیں)

کینیڈین خاتون بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں صبح کا ناشتہ انھی کے ساتھ کروں۔

ہائے رے مجبوری۔

رات کٹ گئی لیکن صبح سخت بورڈم ہوئی۔ کینیڈین خاتون نے دوڑ بھاگ کر کے ایک ترجمان حاصل

کرنا اور چل دیں۔ وہ اتوار کا دن تھا اور اِن ٹورسٹ بند۔ مگر انھوں نے شاید اپنے سفارت خانے کی خدمات حاصل کر لیں۔ میں نے پہلی بار شدید تنہائی محسوس کی، ڈیڑھ مہینے کی مسلسل جھک جھک اور گپ بازی کے بعد چپ کا روزہ کھائے جاتا تھا۔ پڑھنے کو اخبار کتاب کچھ نہیں۔

میں پھر ریستوران پہنچا کہ شاید کوئی اور غیر ملکی پلّے پڑ جائے اور جونہی میں دروازے میں داخل ہوا عین سامنے والی میز پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔

میں اس کا نام نہیں جانتا تھا اور نہ اب جانتا ہوں مگر وہ پوری دنیا میں ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے، وہ اکیلا صرف وہی ایسا آدمی ہو سکتا ہے جس کی مونچھیں تین انچ چوڑی، چھ انچ لمبی اور چار چار انچ نیچے جھکی ہوئی ہوں، میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا جسے کوئی بھی ایک بار دیکھ لے تو عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ وہ ایک موٹا تازہ پستہ قد آدمی تھا۔ بہترین لباس پہنے مونچھیں لگائے کیوی یار کھا رہا تھا

"ہو اِز گڈ ڈے" اس نے فصیح انگریزی میں مجھے آواز دی۔ اور میری جان میں جان آئی۔ ریستوران میں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔

وہ ناریلوں کا تاجر تھا۔ مشرق بعید کے کسی ملک کا بڑا تاجر جو بار بار روس آتا جاتا تھا۔ اور اچھی خاصی روسی بول لیتا تھا۔ وہ سخت شیخی خورا تھا اس نے مجھے دنیا بھر کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا۔ میں فرانسیسی زبان بھی جانتا ہوں اور اسپینی بھی۔ تم کون ہو۔ اچھا ادیب ہو۔ ہاں تم کوئی بڑے ادیب ہو گے جو یہاں گھوم رہے ہو۔ میں نے بھی خوب شیخی ماری۔ میں نے اپنی تصانیف کی تعداد عبدالعزیز خالد کی تصانیف سے زیادہ بتائی۔ میں نے کہا میرے ترجمے دنیا کی سب ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکے ہیں اور دنیا بھر کے بچے میرے سفرنامے پڑھنے کے مشتاق رہتے ہیں۔

میری ڈاک دیکھنے کے لیے آٹھ سیکریٹری ہیں اور میں مصروفیات سے تنگ آکر ماسکو چند روز آرام کرنے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے خود ایسا محسوس کیا جیسے یہ سب سچ ہے اور میرے دل کی دھڑکنیں اعتدال پر آگئیں۔ میں فلمی اور کتابی دنیا میں پہنچ گیا جہاں مصنفوں پر اشرفیوں کی بارش ہوتی ہے اور نرم و نازک خوشبودار کنواریاں چھپ چھپ کر راز، کہ تصویریں سینوں سے لگائے سسکاریاں بھرتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ان پڑھ آنکھوں میں سمت عقیدت و احترام کے جذبات اُمنڈ رہے ہیں۔

"کیا نام ہے تمھارا۔ ذرا دوبارہ بتانا"

میں نے اپنا نام بتایا۔

"ارے واہ" وہ چیخا "یہ نام میں نے سنا ہے۔ میں نے تمہاری چیزیں فرینچ میں کافی پڑھی ہیں اور اب تو ہماری زبان میں بھی تمہارا ترجمہ ہوا ہے۔ کیا نام ہے بھئی تمہاری سب سے مشہور کتاب کا جس کی کہانی بڑی اچھی ہے"

"دنیا مرے آگے" میں نے کہا "جسے لندن کے بازیچۂ اطفال نے چھاپا ہے۔ اوہ "یس یس"۔ وہ ناول پڑھا ہے۔ اوہ۔ کیسے کیسے عجیب کردار پیدا کرتے ہو تم۔ اچھا تو تم ہو وہ۔ مجھے تم سے مل کر واقعی خوشی ہو رہی ہے۔" اس نے سیاہ کیوی یا یعنی مچھلی کے سیاہ انڈوں کی ایک پوری پلیٹ میرے لیے منگائی جو بہت قیمتی ہوتی ہے۔ چچا غالب ایسی چیزوں کو "فتوح" کہتے تھے۔ میں چپکے بھر بھر کر کھانے لگا۔ اور ان کرداروں کی تخلیق پر بے پڑائی سے گفتگو کرنے لگا جو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

"میں دنیا بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر دوں گا" میں نے لاف زنی کی۔ "میں مغربی اور کمیونسٹ سب سوسائٹیوں کے پردے چاک کر دوں گا۔ میں بالکل آزاد آدمی ہوں اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں دوسری طرح سے دس قدم آگے ہوں۔ مگر ابھی میں ذرا نسبتاً کم عمر ہوں اس لیے نہ یہ لوگ مجھے لینن پرائز دیتے ہیں نہ یہ وہ نوبل پرائز کے قابل سمجھتے ہیں۔"

"بالکل۔ بالکل۔" وہ میری غمخواری کرنے لگا۔ "یہ یورپین لوگ ہم ایشیائیوں کی فطانت اور ذہانت سے ویسے ہی جلتے رہتے ہیں اُبھرنے نہیں دیتے۔ مگر میں اپنے ناریل کے پیسے خوب وصول کر لیتا ہوں۔ میں بہت ہوشیار آدمی ہوں۔"

بہت دیر میں نے اس کی اور اس نے میری تعریف کی۔ میں نے اسے چائے بھی پلائی۔ اور اپنے کئی ناولوں کے مرکزی خیال بتائے۔ اس نے اپنے کاروبار کی جملہ تفصیلات سے مجھے آگاہ کیا۔ ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد میں نے اس کی مونچھوں کا ناپ لے لیا۔ پہلے شاید وہ برا مان جاتا۔ مگر اب وہ ایک عالمی ادیب کی ایک معصوم خواہش پوری کر رہا تھا۔ میں نے ایک روسی اخبار کا کاغذ پھاڑ کر اس کی مونچھیں ناپیں اور الگ الگ ٹکڑوں پر لمبائی چوڑائی گہرائی اونچائی اور حجم کاؤ کے لفظ لکھے تاکہ وقت پر انھیں پیمانے سے ناپا جا سکے۔

"میں تمہارا ذکر اپنے سفرنامے میں کروں گا۔" میں نے اس سے وعدہ کیا۔

"موسیو کیا آج شام تم میرے ساتھ گزارو گے؟" وہ بے تکلف ہو گیا۔ "بات یہ ہے کہ یہاں اصل تفریح کی بہت کمی ہے۔ بہت سختی ہے عورتوں پر۔ بڑی مشکل سے میں نے کئی دن دوڑ بھاگ کر انتظام کیا ہے۔ مگر جناب رقم میں بھی ساجھا کرنا ہوگا۔ کل خرچ تین سو روبل کا ہے۔"

ہمارا سو واسطے نہ ہو سکا۔ مگر میں رات کو اس کے کمرے پر پہنچ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے دروازہ

کھولا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی نوجوان نہیں تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ پستہ قد نجیب سے تو بہت ہی لمبا ہو گا۔ اس کی آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔

"کیا ہے۔ تم کیوں آئے ہو۔ جاؤ۔ چلے جاؤ۔ گیٹ آؤٹ" وہ گھٹی ہوئی آواز میں ڈانٹنے لگا۔ میں نے ایک قدم دروازے میں رکھا اور براہ راست لڑکی سے انگریزی میں خطاب کیا۔

"کیا تم روسی ہو؟"

یہ سب اتنی جلد ہوا کہ وہ سوچ بھی نہ سکی۔

"نہیں" وہ بے ساختہ بولی "میں فرینچ ہوں"۔ اس کی انگریزی یورپین لہجے سے معمور تھی "تم کون ہو" پیشتر اس کے کہ نجیب اور کچھ بولے میں نے دونوں انگوٹھوں سے اس کی مونچھوں کو آراستہ کیا۔ پھر ان پہ ہاتھ پھیرا اور واپس ہو گیا۔ یہ سب ایک لمحے سے کم وقت میں پیش آ گیا۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

رات بھر میں اکیلے کمرے میں پڑا گنگناتا رہا۔ سہ پہر کو تین بجے ہمیں پھر بتا دیا گیا تھا کہ ہوائی اڈا بند رہے گا اور نہ کوئی جہاز آ سکے گا نہ کوئی جہاز جا سکے گا۔ مینیجر صاحب ساٹھ روبل اور دے گئے تھے۔ کینیڈین بڑھیا نظر نہیں آئی تھی۔ یونین کو ٹیلیفون کیا تو کسی نے اٹھایا نہیں۔ اب میرا شیو دو دن کا ہو گیا تھا اور کمرے سے باہر نکلتے شرم آتی تھی۔ کوئی نو بجے صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"آہا میرے پیارے آپ ابھی سو رہے ہیں" گولو بیف صاحب بول رہے تھے "ارے بھائی جلدی آؤ خدا کے واسطے مجھے اس عذاب سے نکالو" میں دہاڑنے لگا۔ پھر میں نے گولو بیف صاحب ہی کے ذریعے ہوٹل والوں سے نہایت عمدہ اور مرغن ناشتے کے لیے کہلوایا یعنی ان سے کہا کہ وہ فون کر دیں۔ خود ان کو ہدایت کی کہ شیو کا سامان لے کر آئیں اور وہ کوئی پون گھنٹے میں پہنچ گئے۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟"

"ارے صاحب عاشق لوگ اپنے محبوب کو ہر جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں" وہ کھسیا کر ہنسنے لگے۔ تف ہے مجھ پر کہ ایسا سوال کیا۔ ایک پورا جہاز وقت پر نہ اڑے اور اس کے مسافروں کی نقل و حرکت سے روسی حکومت باخبر نہ ہو۔ اگر ایسا ہو سکتا تو روز ا سپوتنک اور لیونک اور مونک۔ زن زن نہ اڑتے۔

"آؤ بھائی باہر نکلو اور دیکھو"

"آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا"

بعض اوقات کبوتروف صاحب شعر نہایت باموقع پڑھ دیتے تھے۔

"اور بھائی آپ نے اب تک ہماری زمین دوز ریل نہیں دیکھی بھئی خوب ماسکو دیکھا آپ نے"

یہ میری پہلی زمین دوز ریل تھی۔ اس وقت تک میں نے لندن پیرس اور نیویارک کی زمین دوز ریلیں نہیں دیکھی تھیں مجھے یہ نظام بہت شاندار لگا زمین کے نیچے کوئی دو سو سیڑھیاں اتر کر لمبے لمبے پلیٹ فارم آتے ہیں۔ سیڑھیاں خودکار ہیں۔ ان پر کھڑے ہو جائیں تو آپ ہی آپ نیچے اتر جاتے ہیں کیونکہ سیڑھیاں چلتی رہتی ہیں انگریزی میں انہیں ایس کے لیٹر کہتے ہیں۔ جو شیلے لوگ ڈبل تیزی دکھاتے ہیں۔ یعنی سیڑھیاں تو اترتی ہی ہیں مگر وہ ان پر بھی چھلانگیں لگاتے ہوئے جلد تر نیچے پہنچ جاتے ہیں۔ ریل دو دو منٹ بعد آتی ہے کھڑے ہوتے ہی دروازے آپ ہی آپ کھل جاتے ہیں اور ایک منٹ بعد بند ہو جاتے ہیں نہ انجن نظر آتا ہے نہ ڈرائیور۔

"دیکھیے یہ نئی نسل کا اسٹیشن ہے۔ اس کا نام ہے یوتھ اسٹیشن جسے نئی نسل کے نام معنون کیا گیا ہے۔"

اللہ اکبر۔ اسٹیشن کیا ہے تاج محل ہے اور وہ بھی شاہجہاں کے وقت کا تمام سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ چھتیں منقش جن پر قمقموں کی رنگا رنگ روشنی عجب بہار دکھاتی ہے۔ سردجنگ میں پڑھا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کا پتھر اور لکڑی اور آرائشی سامان ماسکو کے زمین دوز اسٹیشنوں میں لگا دیا گیا ہے۔ کہیں یہ مال مسالہ وہی تو نہیں۔ خیر جو کچھ ہو بہت بھلا اور شاندار اور بقول روسیوں کے "عظیم ہے"

ایک اسٹیشن پر ایک شیشے کی الماری نظر آئی۔ جس پر طرح طرح کے عرقیوں کے اشتہارات لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف تین چار بٹن۔ گولوبیف صاحب نے ایک سکہ ڈالا اور ایک بٹن دبایا۔ کھٹ سے ایک خانے سے ایک گلاس نمودار ہوا اور ایک جگہ ٹک گیا۔ پھر اس کے اوپر لگے ہوئے نل کی ٹونٹی آپ ہی آپ کھل گئی اور آن کی آن میں گلاس میرے پسندیدہ سیب کے عرق سے پُر ہو گیا۔

"بھئی واہ۔ یہ کیا تماشا ہے" میں نے گلاس خالی کر دیا گولوبیف صاحب نے دو دن کی لی۔ "جناب یہ زندگی کی آسانیاں جو ہماری سوسائٹی میں بہم پہنچا دی گئی ہیں۔ آپ تھک گئے ہوں اور دکان تک جانے کو جی نہیں چاہتا تو یہیں شربت جائے کافی حاضر ہو جاتی ہے"

ہاں یہ آسانیاں یورپ اور امریکہ کی ہر گلی میں میسر ہیں مگر بہت سے روسیوں کو اس کا علم نہیں خود اس حقیر کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا جو امریکہ تک یاد آیا۔ ہائے پس ماندہ ایشیا۔

اس شام پھر میں اور گوبیف صاحب آبدیدہ ہوتے ہوئے رخصت ہوئے اور میں نے ایر انڈیا کے سپر کانسٹی لیشن میں وہی آرام دہ نشست سنبھالی۔ میرے ذہن پر روسی نظام کا بوجھ پڑنے لگا۔

وہ ملک دیکھ کر جا رہے ہو" میرے بوجھل متاثرہ ذہن نے کہا" جو پورے کرۂ زمین کا چھٹا حصہ ہے اس کا رقبہ چھیاسی لاکھ مربع میل ہے اس کی آبادی تقریباً بیس کروڑ ہے یہ پورے امریکی براعظم یعنی شمالی اور جنوبی امریکہ سے بڑا ہے اور چین اور ہندوستان دونوں ملا کر اس کے برابر نہیں ہوتے پورے یورپ کا رقبہ اس کا آدھا بھی نہیں ہے اور یہ پوری دنیا کے کسی بھی ملک سے کم از کم دوگنا بڑا ہے۔ یہاں دنیا میں پہلی بار اسپوتنک اڑایا گیا اور دنیا میں پہلی بار اسی ملک کے ایک باشندے نے خلائی پرواز کی یہ بہت پرانا اور بہت نیا ملک ہے یہاں اڑسٹھ بولیاں اور چودہ زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سوا سات ہزار اخبارات چھپتے ہیں جن کی کل اشاعت ساڑھے پانچ کروڑ کے قریب ہے صرف رسالے اور میگزین ہی دو ہزار سے زیادہ ہیں یہ لینن، اسٹالن اور خروشیف کا ملک ہے پشکن اور طالسطائی اور چیخوف اور دوستو یافسکی اور شولوخف اور موسیقار چیکووسکی اور رقاصہ اولانوا کا وطن ہے اس پر کوئی سرسری رائے دینا ایمانداری نہیں ہوگی تمہیں ان کے موجودہ نظام سیاست سے لاکھ اختلافات ہوں وہ ایک پھیلتا ہوا طرز زندگی ہے جو ایک طرف چین اور دوسری طرف جرمنی میں برلن تک پہنچا ہوا ہے بلکہ بحرا لکاہل پار کر کے امریکی براعظم پر کیوبا کے دروازے سے دستک دے رہا ہے اس لیے اے عزیز جو کچھ کہو سوچ کر کہنا"

" ٹھیک ہے ٹھیک ہے " میں اپنے آپ پر خفا ہو کر چیخنے لگا " مگر میں میں ہوں، ایک ذات، ایک فرد اور جب تک میں ہوں اپنے لیے بہت اہم ہوں۔ میرے لیے اپنا اسٹائل بہت اہم ہے اور میں اپنی بات کہہ کر رہوں گا۔ خواہ وہ کتنی ہی سرسری ہو"

" اچھا تو کہہ ڈالو " میرا بوجھل ذہن ہلکا ہونے لگا۔ اس کے آہنی پردے اٹھنے لگے

" تو مجھے اجازت ہے کہنے کی "

" ہاں "

" بس مجھے یہی اجازت چاہیے۔ اب یہ میری مرضی ہے کہ میں جب چاہوں گا اس اجازت کا استعمال کروں گا "

سپاسی بو (شکریہ)

جب ایر انڈیا کا سپر کانسٹی لیشن ماسکو سے اُڑ کر ہوا میں قائم ہو گیا تو میں نے بات چیت کے لیئے کوئی ساتھی ڈھونڈنا چاہا میری نشست اکیلی تھی سامنے دو روسی بیٹھے تھے۔

"آپ انگریزی تو ضرور جانتے ہوں گے،" میں نے بے غیرت بن کر پوچھا حالانکہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والے فرسٹ کلاس لوگ روایتاً اپنے ہمسفروں کو بھی تھرڈ کلاس سمجھتے ہیں۔

"نیت - ٹی نیت" (نہیں) انھوں نے روسی میں جواب دیا اور مسکرائے۔

"سپاسی بو" (شکریہ) میں نے بھی روسی میں کہا اور خفت سے ہنسا مگر وہ خاموش مجھے گھورتے رہے۔

ایر ہوسٹس ایک کالی پیلی سی لڑکی تھی اور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ ساڑھی میں بھی ہوتی تو شاید میں بات چیت کی ہمت کرتا مگر وہ بالکل ہی ۔دگس لگی ۔میں ایر انڈیا کے خلاف ہو گیا ۔۔۔ کاش اس وقت کوئی بات کرنے والا ہوتا تو میں ہندوستانی تصورِ حسن کی قلعی کھول دیتا۔

میں نے نہایت بدمزگی سے اعلیٰ درجے کا کھانا کھایا مفت امریکن سگریٹ پیئے اور ہندوستانی رسالے پڑھنے لگا۔ پھر میں نے نیچے جھانکا۔ ایک طویل تاریک خلا تھا جس میں کبھی کبھی روشنی کی جھلکیاں نظر آجاتی تھیں شاید جہاز غیر آباد علاقوں پر سے گزر رہا ہے۔ میرے دل میں اس سفر کا خوف چھنے لگا۔ یہ کم بخت طیارہ جٹ بھی نہیں ہے جس کی رفتار بہت سے وسوسوں پر غالب آجاتی ہے کیونکہ اس کے حادثے میں موت سوفیصد ہوتی ہے۔ پھٹ اڑا اڑا وہ ختم اور

منفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

لیکن یہ پنکھے والے طیاروں کی قسمیں کھیں بڑی پریشان کن ہے۔ اب دیکھیے میں کیسے کیسے بنجر میدانوں پر اڑ رہا ہوں فرض کیجیے انجن خراب ہو جائے لیکن پوری طرح خراب کبھی نہ ہو بلکہ جہاز کو کہیں ج

اترنا پڑے تو نہ جانے کیا حشر ہو گا۔ حادثے میں ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے یا آنکھیں جاتی رہیں گی اور بچ گئے تو سردی بیڑا پار کر دے گی۔ جہاز کا نظام تو خراب ہو ہی چکا ہو گا اس لیے اس کے گرم رہنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں بس دو چار گھنٹوں میں ہم سب جم کر رہ جائیں گے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے سردی لگنے لگی۔ میری ناک سُن ہو گئی میں نے بے بسی سے اپنے اوور کوٹ کی تلاش کی جو ایر ہوسٹس نے کہیں دیوار پر لٹکا دیا تھا اور پھر خوف کے مارے کمبل منہ پر سرکا لیا۔ اب میں نے اپنے اگلے سفر کے بارے میں سوچنا چاہا۔ یہ دسمبر ہے اور سنہ اکسٹھ کی فروری میں مجھے یورپ جانا ہے۔ اس بار ربجٹ یہ ہے کہ مجھے یونیسکو نے چھ مہینے کو یورپ امریکہ اور برما میں کام کرنے کے لیے فیلوشپ یعنی وظیفہ دیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں پیرس کے ریستورانوں میں گلابی رنگ کی دوشیزاؤں کو فرانسیسی میں اپنے دوہے سنا رہا ہوں اور برہنہ رقاصائیں ان کی دھن پر ناچ رہی ہیں وہ سب لوگ فصیح اُردو بولتے ہیں (کیونکہ میں اُردو کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتا) اور مجھے قورمہ پلاؤ اور تکے کھلاتے ہیں۔

مگر — پھر ایک دم ایک زناٹے کے ساتھ پورے روس کا نقشہ کھل گیا اور میں بیک نظر سب کچھ دیکھنے لگا۔ — اس عجیب و غریب سرزمین کو جہاں پچھلے پچاس برس میں ایک حیرت انگیز سیاسی اقتصادی اور سماجی تجربہ ہوا ہے اور جس کے اثرات مشرق و مغرب میں اس طرح پھیلے ہیں کہ پوری دنیا ایک شدید اعصابی جنگ میں مبتلا ہو گئی ہے امریکیوں کے بقول ہر سمے ایک ساد کن عالمی جنگ کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔

اعداد و شمار دیکھیے تو آج کا روس سولہ جمہوریتوں سے مرکب ہے یعنی سولہ خود مختار صوبے جو سوویت دستور کے مطابق اپنی اپنی جگہ آزاد ریاستیں ہیں اور رضا کارانہ طور پر یونین میں شامل ہیں حالانکہ خاص طور پر ایشیائی ریاستوں کے متعلق آج کے بڑے بوڑھے جو چالیس پچاس سال پہلے عالمی معاملات سے واقف تھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ یونین میں رضا کارانہ شامل نہیں ہوئیں بہرحال آج کی ایسی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کا ماضی عجیب عجیب ناقابل یقین اور تلخ عناصر سے بھرپور رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آج کیا ہے آج روس کرۂ ارض کے چھٹے حصے کا نام ہے جس میں سولہ ریاستیں ہیں۔ اصلی روس جس کی آبادی (سنہ چھپن کی مردم شماری کے مطابق) ساڑھے گیارہ کروڑ ہے۔ یوکرین ... ے چار کروڑ۔ سفید روس یا بیلوروشیا اسی لاکھ۔ ازبکستان ستر لاکھ۔ قزاقستان پچاس لاکھ۔ جارجیا چالیس لاکھ۔ آذربائی جان چونتیس لاکھ۔ تاجکستان اٹھارہ لاکھ۔ مالی داویا ستائیس لاکھ۔ کرغیزیا انیس لاکھ۔ آرمینیا سولہ لاکھ۔ ترکمانستان پندرہ لاکھ۔ اور پھر

مشرقی یورپ کی الحاقی ریاستیں جوان میں شامل ہیں یعنی لتھوانیا ستائیس لاکھ۔ لٹویا بیس لاکھ اور استونیا گیارہ لاکھ۔ یعنی کل آبادی بیس کروڑ تھی جو اب سنہ چھپن سے زیادہ ہوگئی ہوگی۔ اس کی فوجی قوت کسی کو معلوم نہیں مگر امریکی اندازوں کے مطابق کل مسلح افواج میں چالیس لاکھ سے زیادہ تربیت یافتہ جوان موجود ہیں۔ محض سوویت بری فوج کے دو سو ڈویژن کہے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سن انیس سو ستاون تک روس کا فوجی بجٹ ایک لاکھ ملین روبل سالانہ تھا۔ مگر یہ سب اندازے ہی اندازے ہیں۔ ان کا بجٹ کسی کھلے بحث مباحثے کے لیے پیش نہیں ہوتا۔ روسی بحریہ بڑے جہازوں کے معاملے میں بڑی طاقتوں کے مقابلے میں نہیں آسکا شاید اس لیے کہ ابھی کھلے سمندروں کے علاقے روسی اقتدار سے باہر ہیں لیکن اس کی آبدوزوں کے بارے میں طرح طرح کے قیاسات ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ ساڑھے چار سو آبدوزیں بیک وقت حرکت میں آسکتی ہیں اور روسی ماہرین جنگ کی زیادہ تر توجہ آبدوزیں بنانے پر ہی رہتی ہے۔ رہی ہوائیہ یا فضائیہ تو اس کے بارے میں اسپوتنک اور دور مار میزائیل خود ہی پورے کرۂ ارض کے گرد نقارے بجاتے گھومتے ہیں — چین کا حال معلوم نہیں مگر خام مادوں کی دولت سوویت یونین میں امریکہ کے بعد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں دنیا بھر کے کوئلے کا اکیس فیصد ذخیرہ ہے۔ کچے لوہے کا بیس فیصد۔ لکڑی کا تینتیس فیصد۔ مینگانیز پلاٹینم میں دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہے — لوہے اور کوئلے میں نمبر دو اور پیٹرول کے معاملے میں نمبر تین۔ یہاں سونے کی کانیں دنیا میں درجہ دوم پر آتی ہیں۔ یہ ملک افزائش نسل سے پیدا شدہ مشکلات کا شکار بھی نہیں بلکہ اپنے زراعتی مسائل حل کرلے تو قابل آبادکاری رقبہ دیکھتے ہوئے تین چار گنی آبادی کو برداشت کرسکتا ہے۔ اب یہاں اوسط عمر چونسٹھ برس ہے جبکہ انقلاب سے پہلے صرف تیس یا بتیس برس تھی۔

صنعتی اعتبار سے روس کی مجموعی قوت پیداوار دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے یعنی امریکہ کے بعد۔ پورے ملک میں دو لاکھ سے زیادہ صنعتی ادارے ہیں یعنی مرکز پیداوار جن میں سے بانوے فیصد کی مالک ریاست ہے یعنی مرکزی حکومت اور باقی آٹھ فیصد بھی انجمن ہائے امداد باہمی کی ملکیت ہیں کسی ایک فرد یا مجموعہ افراد کی ملکیت نہیں ہیں۔ سوویت مرکزی بجٹ جو سنہ ۵۹ء میں تقریباً پچاس ارب ڈالر یا تقریباً ڈھائی ارب روپے کا تھا تمام پیداواری ذرائع سے براہ راست پیدا کیا جاتا ہے۔ ٹیکسوں کے ذریعے نہیں آتا کیونکہ انکم ٹیکس کا اوسط پانچ فیصد ہے اور زیادہ سے زیادہ حد تیرہ چودہ فیصد ہے۔ صنعتی اداروں میں تقریباً چھ کروڑ مرد عورتیں کام کرتے ہیں (کرتی ہیں) جن میں سے کوئی پانچ کروڑ ٹریڈ یونینوں کے رکن ہیں۔

روس کا تعلیمی نظام آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا مگر اس کے اعداد و شمار حیرت انگیز ہیں۔ ابتدائی

تعلیم جبریہ اور مفت ہے۔ صرف اسکولوں میں تین کروڑ بچے پڑھتے اور چالیس لاکھ نئے طالب علم ہر سال داخلہ لیتے ہیں۔ خاص تربیتی اور تجرباتی اسکول الگ ہیں۔ ہر بچے کے لیے اپنی مادری زبان کے علاوہ روسی زبان سیکھنی لازمی ہے تاکہ وہ دوسری ریاستوں میں خود کو اجنبی محسوس نہ کرے اور دوسری ریاستوں سے روسی کتابوں اور روسی میں ترجمہ شدہ مواد کے ذریعے واقف رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے خصوصی امتحان کے بعد داخلہ ملتا ہے مگر ہر سال کوئی پندرہ لاکھ طالب علم یونیورسٹی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اُستادوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے تعلیم کے حصول میں کسی کو کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی صرف ابتدائی تعلیم کے تقریباً بیس لاکھ مدارس ہیں جہاں اوسطاً دو سو پندرہ روز پڑھائی ہوتی ہے (باقی چھٹیاں) اور چھ گھنٹے روزانہ اسکول کے علاوہ گھر کے لیے الگ کام دیا جاتا ہے پیشہ ورانہ تعلیم کے مراکز لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور زیادہ تر بچے ابتدائی تعلیم یعنی دس سالہ کورس ختم کر کے اپنی اپنی پسند اور قابلیت کے لحاظ سے مختلف پیشے سیکھنے لگتے ہیں کالج میں جانے والوں کو خود ریاست تعلیمی وظیفہ دیتی ہے یہ وظیفہ اختیاری نہیں بلکہ لازمی ہے یعنی تعلیم کا بوجھ طالب علم یا اُن کے والدین پر نہیں پڑتا تعلیم میں زیادہ توجہ عملی سائنسی مضامین پر ہے۔ صرف سنہ اکیاون سے سنہ پچپن تک کے پنج سالہ منصوبے میں سوا گیارہ لاکھ ماہرین کی فوج تیار ہوئی تھی، صرف انیس سو پچپن میں تقریباً ستر ہزار نے انجینیرنگ کی ڈگری لی تھی۔

ہاں یہ درست ہے کہ یہ تعلیم آزاد نہیں ہے مثلاً پورے روس میں ایسی کوئی کتاب نصاب یا ذیلی نصاب کے طور پر نہیں پڑھی جا سکتی جسے حکومت کی منظوری حاصل نہ ہو خواہ وہ ادب ہو یا سائنس یا معاشیات۔ تمام تعلیم کو مقصدی کر دیا گیا ہے۔ مقصدیت جو حکومت متعین کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس نظام میں کسی طرح کوئی غیر کمیونسٹ عنصر داخل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر روسی حکومت چاہے کہ کوئی روسی حضرت عیسےٰ کا نام ہی نہ جانے تو یہ عین ممکن ہے کیونکہ ایسی کوئی کتاب کوئی تحریر ملک بھر میں داخل ہو سکتی ہے نہ شائع ہو سکتی ہے جس میں حضرت عیسےٰ کا نام موجود ہو۔ خیر یہ ایک الگ مسئلہ ہے یہاں مجھے ان کے حسن و قبح سے بحث نہیں اس وقت صرف اتنا دیکھنا ہے کہ یہ دنیا بیک نظر کیسی نظر آتی ہے۔

جب سائنس اور بطور خاص جوہری توانائی پر کام کرنے میں روسی دنیا بھر میں شاید کسی سے پیچھے نہیں سائنس ان کے ہاں مذہب کا درجہ رکھتی ہے بلکہ یہ کہنا درست ہو کہ سوویت روس کا مذہب ابھی کئی قرنوں تک سائنس رہے گا کیونکہ سائنس ہی نے انھیں دنیا کی دوسری سیاسی اور فوجی طاقت بنایا ہے صرف انیس سو ستاون میں انھوں نے سائنسی تحقیقات اور ترقیات پر ڈھائی ارب ڈالر یا تقریباً ساڑھے دس ارب روپے

خرچ کیے گئے تھے۔ سویت سائنس اکیڈیمی کی شاخیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اس مضمون کے اعداد و شمار اور بھی خشک ہونگے اس لیئے یہ سمجھنا کافی ہے کہ روس میں سائنسداں کو سیاست داں پر فوقیت حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ علم (جیسا بھی ہے) ایک چاٹ کی طرح ہے جس پر لوگ دیوانہ وار پلے پڑتے ہیں اور ان کے راستے میں کوئی اقتصادی رکاوٹ نہیں۔ ملک بھر میں تقریباً ۴ لاکھ کتب خانے ہیں ان میں بہت چھوٹے چھوٹے بھی رہوں گے مگر بڑے بہت بڑے ہیں، مثلاً لینن گراڈ کے عظیم کتب خانے میں سوا کروڑ کتابیں ہیں ملک میں چالیس کتب خانے ایسے ہیں جہاں قانوناً ناشرین کو ہر کتاب ہر پرچے ہر اخبار کا ایک ایک نسخہ بھیجنا پڑتا ہے اور اس طرح ایک طرف تو ان کتب خانوں کی دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور دوسری طرف تحقیق کرنے والوں کو دور دراز سفر کی زحمت بچ جاتی ہے۔ ہم یہ قانون بھی نہیں بنا سکتے!

پارٹی پروپیگنڈے کے لیے چھ ہزار سے زیادہ تربیت گاہیں ہیں۔ جہاں پارٹی کے پبلک ریلیشنز افسر یا ماہرین تعلقات عامہ تیار ہوتے ہیں ملک بھر میں ۴ لاکھ کے قریب پیشہ ور پروپیگنڈا افسران ہیں جو حکومت اور پارٹی کا ایک ایک فیصلہ وضاحتوں اور توضیحات کے ساتھ عوام تک پہنچا دیتے ہیں یہ سلسلہ بجلی کے تاروں کی طرح پھیلا ہوا ہے اور بجلی کی طرح کام کرتا ہے کسی دوسرے نقطۂ نظر کو اگر وہ پیدا ہو جائے تو پنپنے نہیں دیتا یوں بھی چونکہ ذرائع اطلاعات سرکاری ہیں اس لیے عوام تک کسی دوسرے نقطۂ نظر کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ جدید روس کا، وسیع طاقتور اور مضبوط روس جس نے اس دنیا کی نیبر ی برکم خود عملی طور پر سنبھال رکھی ہے یعنی کمیونسٹ دنیا۔ اس کی آبادی تئیس کروڑ سے اوپر ہے اس روس کے بارے میں بے احتیاطی یا لاعلمی کے ساتھ سوچنا شاید صرف امریکیوں کو زیب دیتا ہو کیونکہ وہ خود ایک عظیم اور امیر قوم ہیں لیکن ہمیں زیب نہیں دیتا۔

روس کیا کچھ ہے اس کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں کیا نہیں ہے۔ اس کا جواب بہت سے بقراطوں نے دیا ہے جن میں سیدھے لوگس جواب امریکی صحافی جان گنتھر کا ہے جن سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں، روس میں سب سے بڑی کمی ہے آزادی کی۔ آزادیٔ افکار، آزادیٔ اظہار آزادیٔ نقل و حرکت۔ وہ ایک پھیلتے ہوئے جسم کی طرح ہے۔ جس کی روح مرجھا رہی ہو۔ وہ یہ نہیں جتاتے کہ زاروں کا زمانہ ہر اعتبار سے بدترین تھا اور اب وہاں کم از کم اقتصادی خوش حالی، اندرونی استحکام اور روز کے بیرونی حملہ آوروں سے حفاظت میسّر ہے اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ایک نہایت ہی پسماندہ

ء م ہو ہے۔ ں چالیس برس کے اندر اندر اس منزل تک پہنچنے میں سخت بھاگ دوڑ کرنی پڑی جس میں لاکھوں انسانوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے لاکھوں کو جیل میں گھٹ گھٹ کر رہنا پڑا۔ زبانوں حتی کہ خیالوں تک پر پابندی لگ گئی۔ خود خروشیف صاحب کی حکومت نے جس طرح سچ یا جھوٹ اسٹالینی دور کے حالات اور مظالم کا پردہ چاک کیا ہے اس سے کم از کم ان سختیوں کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اسٹالین کے تیس سالہ دور حکومت میں روا رکھے گئے۔ روس میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک نئے فلسفے ایک نئے نظام کی ضروری قیمت تھی۔ مگر یہ بہت بڑی قیمت تھی ـــ اور شاید آج بھی دی جا رہی ہے۔ اے انسانیت تیری منزلیں بہت کٹھن ہیں!!!

"اس نظام کا مصلح اس کے اندر ہی سے پیدا ہو گا' خروشیف تحریک اصلاح کی پہلی کڑی ہیں۔" ایک روسی مدبر نے مجھے بتایا تھا۔ "یہ نظام باہر کے حملوں سے نہیں ٹوٹ سکتا"

شاید یہ درست ہو مگر مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے ابھی برطانیہ اور امریکہ نہیں دیکھے، مگر مجھے روسی فضاؤں سے خوف کی بو آتی رہی پتا نہیں میرا خوف میرے تحت شعور میں جمے ہوئے مغربی پروپیگنڈے کا اثر تھا یا خود میری لاشعوری فکر کا نتیجہ مگر میں تمام وقت ڈرا ڈرا رہا۔ میری سمجھ میں وہ انقلاب نہیں آتا جو منجمد ہو جائے یعنی ایک ہی صورت میں قائم رہے۔ انقلاب خود تبدیلی سے عبارت ہونا چاہیے۔ زندگی کی طرح جاوداں پیہم رواں ہر دم دواں۔ مگر یہاں انقلاب یخ بستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک پوری آبادی اپنے ہی جال کے اندر گرفتار ہے۔ پورے ملک پر ایک پارٹی کی حکومت ہے جو برابر چلے جاتی ہے کوئی فرد کوئی گروہ ایسا پیدا نہیں ہو سکتا جو مارکس اور لینن سے اختلاف کی جرأت کر سکے۔ ایک سو برس اور دوسرا پچاس برس پرانا ہو چکا ہے۔ انسان کے ذہنی سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ کبھی خشک نہیں ہو سکتے نہیں ابھی یہ میری مثالی ریاست نہیں ہے' روسیوں کو روس مبارک۔ بقول ان کے دنیا کو اس وقت سب سے بڑی ضرورت امن کی ہے ــــــــــ اور میں بھی امن کا علمبردار ہوں' امن اور صلح و آشتی۔ اس لیے میں ان کے نظام زندگی پر حملہ نہیں کروں گا اگر وہ اسی حال میں خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں مگر میں اس ملک کا شہری بننا پسند نہیں کر سکتا جہاں مجھے ایک آدھ نیم شبی کی اجازت نہ ہو جہاں میں یہ نہ کہہ سکوں کہ مجھے فلاں بات ناپسند ہے جہاں میں ایک اپنی دنیا ایک نئے نظام کا خواب نہ دیکھ سکوں۔ شاید دس بیس برس بس حالات اور بہتر ہوں اور روس سرزمین پں مارہ ہو ایس پہنے ہیں اور اس وقت ممکن ہوا تو میں پھر وں گا لیکن ابھی تو

گماں مبرکہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ دررگِ تاکست

واہ میاں بقراط آخر تقریر کر ہی گئے۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ کیا ہاتھی کی سونڈ پر سوئی چلائی ہے۔ بس یہی تو میرا راز حیات ہے۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہاتھی کا وجود اپنی جگہ مسلّم لیکن پدی کو بھی جینے کا حق ہے، اس کے لیے فضا کھلی رہنے دو تاکہ جب اس کے جی میں آئے اور جہاں تک اس میں سکت رہے وہ اڑ سکے۔

"اٹھیے مسٹر تاشقند آگیا" کرنتان لڑکی نے جگایا "یہاں
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مگر جہاز کی گڑگڑاہٹ نے یہ خیال جمنے نہ دیا۔ گھر گھر گھر پنکھے زور زور سے بولنے لگے "نہیں میاں" وہ چلائے "یہ خواب نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ یہ جہاز جسے ہم کھینچ رہے ہیں ایک چلتی پھرتی مشین ہے اور اس دنیا پر اڑ رہی ہے جو ایک ٹھوس کرہ ہے اور اس ٹھوس کرّے پر انسان بستے ہیں جو ٹھوس ہیں۔ گوشت اور ہڈی کے بنے ہوئے۔ یہ سب سچ ہے یہ سب ہے۔ یہ موجود ہے، اور محسوس ہے اور تمہیں یہیں جینا اور مرنا پڑے گا"

"تو پھر میں کیا کروں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اوہو۔ وہ مارا، مجھے اپنا نصب العین مل گیا۔ میں نے پالیا" میں چیخنے لگا "میں ایک عالمی ریاست کے لیے کام کروں گا"

جب جہاز تاشقند سے چلا تو میں پوری طرح جاگ رہا تھا۔ اب جہاز افغانستان سے ہوتا ہوا پنڈی اور سرگودھا کے راستے دہلی جائے گا۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہ پنڈی پر اتر جائے۔ یہ عجیب قاعدے ہیں۔ انسانوں کے جھگڑے نہ جانے کب ختم ہوں گے۔ پنڈی اترنا چاہتا ہوں تاکہ جلدی سے دوسرا جہاز لوں اور کراچی اپنے بال بچوں سے جا ملوں۔ یہ کتنی بے ضرر اور پاک اور منزہ خواہش ہے مگر پوری نہیں ہوسکتی۔ ایسی ہی خواہش روسیوں کی بھی ہے جو امریکی بموں سے ڈرتے رہتے ہیں اور ایسی ہی خواہشیں امریکیوں کی بھی ہیں جنہیں روسی نظریات کے بم ستاتے رہتے ہیں۔ سرمایہ داری اور کمیونزم اور جمہوریت اور فاشزم آپس میں ٹکراتے چلے جاتے ہیں اور قوموں کی قومیں پسی جاتی ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی دنیا میں کیا کھیلا ہو رہا ہے جب جنگ نہیں ہوتی تو جنگ کی تیاری ہوتی رہتی ہے اور اب تو سرد جنگ ایک جزو حیات بن گئی ہے۔ آخر یہ سب کیا تماشا ہے۔ میں اس تماشے میں کیا کرسکتا ہوں مجھے ایک ہی زندگی تو ملی ہے۔ اور اس میں بھی

ان عذابوں سے گزرنا پڑ رہا ہے کہ انسانیت ملکوں اور نظریوں میں بٹی ہوئی ہے اور سب ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔ اب میں نے تصوف کا رُخ کیا اور سوچا کہ میں آئندہ کوشش کروں گا کہ پوری دنیا ایک ملک ایک قوم میں بدل جائے اور اس میں ایک حکومت ہو تاکہ سب کے ذرائع پیداوار اور سب کے فوجی بجٹ سب انسانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوں۔ رہیں تفصیلات تو وہ ہم آپس میں گفتگو کے ذریعے طے کر سکتے ہیں تو میں مطمئن سا ہو گیا۔ مجھے اپنی منزل سامنے نظر آنے لگی۔ اب میں اس کے لیے راستہ بنا سکتا ہوں۔"

"مگر اس منزل کا پہلا راستہ کراچی کارپوریشن سے نکلتا ہے" کسی نے کہا "یعنی تمہیں عالمی ریاست بنانے سے پہلے کراچی کارپوریشن کے جملہ مسائل طے کرنے پڑیں گے۔ تمہیں معلوم ہے اس میں کتنا وقت لگے گا؟"

فراق

پہلی نظر میں وہ اور پیرس

میناراآنفل کے ریستوراں میں مسز اسمتھ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

وہ میری ہی طرح ایک اکیلی سیاح (یا سیاحہ) تھیں۔ اور میں نے ان کے انداز سے ان کے بور ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ انگریزی داں ہوں گی۔ یورپ میں آدمی نیا نیا ہو تو میموں کی قومیت میں امتیاز کیسے کر سکتا ہے۔

میں ہمت کر کے ان کے قریب پہنچا۔ تسلی بخش بات یہ تھی کہ وہ خاصی عمر رسیدہ تھیں۔ یہاں انھیں آسانی سے ادھیڑ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے ان کے قریب جا کر شہر کا رُخ کیا جیسے میں پورے پیرس سے خطاب کر رہا ہوں۔

"کاش یہاں کوئی تو انگریزی جانتا" میں نے کسی قدر زور سے کہا اور ایک دم دو تین چہرے میری طرف مڑ گئے مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ صرف مسز اسمتھ آگے بڑھیں اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائیں۔ ان کی آنکھوں سے ترحّم اور شفقت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں انگریزی بولتی ہوں" وہ بولیں "آپ شاید کل یا آج ہی صبح پیرس پہنچے ہیں"۔ میں گھبرا گیا "شکریہ مادام" میں نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ مگر مجھے ایک دم پوچھنے کی اجازت دیجیے کہ آپ نے یہ سوال کیوں کیا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میں کل ہی پیرس آیا ہوں"۔

وہ پھر مسکرائیں "نہیں یہ کوئی ایسی خاص ذہانت کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر آپ پیرس سے ذرا بھی واقف ہوتے تو اس وقت آپ اکیلے نہ ہوتے اور یوں بلند آواز سے ساتھی تلاش کرنے کی زحمت نہ اُٹھاتے"۔

ہم فوراً دوست ہو گئے۔ مسز اسمتھ یعنی مادام اسمتھ ایک سخت ذہین امریکی ثابت ہوئیں۔ وہ پیرس اور پیرس والوں سے واقف معلوم ہوتی تھیں اور کوئی پچیس برس سے ہر سال ادھر آتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ جنگِ عظیم کے

زمانے میں بھی ایک بار پیرس یاترا کر گئی تھیں۔ وہ ایک دلکش خاتون تھیں، ہنس مکھ، خوش بیان، مگر وہ دکھی دکھی سی لگتی تھیں۔

"اچھا تو آپ پیرس کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی گائیڈ نہیں بن سکتی کیونکہ گو میں اس شہر کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں پھر بھی اس کے اسرار نہیں سمجھ سکتی۔ میں آج تک اس شہر کی شخصیت کو نہیں پا سکی یعنی اس کی روح کو نہیں چھو سکی، خیر یہ الگ بات ہے آپ تو یہاں کے کھانوں، شرابوں، کیفوں، نائٹ کلبوں اور قحبہ خانوں میں دلچسپی رکھتے ہوں گے یا پھر آپ کوئی دلدادہ فن ہیں یعنی مصوری یا موسیقی کے رسیا ہیں۔"

"میرا حوصلہ وسیع اور جیب تنگ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ یوں کیجیے کہ اپنے ہوٹل یا کسی بھی جگہ سے ایک پورے دن کے دورے کا ٹکٹ خرید لیجیے۔ سیاحوں کے گروہ کے گروہ بسوں میں سارے اہم مقامات، نمائش گاہوں، کلبوں اور چند رقص گاہوں میں لے جائے جاتے ہیں۔ آپ دن بھر اور آدھی رات تک پیرس گھوم لیں گے، کم از کم اتنا کہ اگر آپ کا حافظہ اچھا ہے تو آپ وطن جا کر یہاں کے تمام مشہور نام دہرا سکتے ہیں اور۔۔۔ اور موقع ہو تو جھوٹی سچی کہانیاں بھی سنا سکتے ہیں۔ مگر مسٹر آپ ہیں کون یعنی آپ کیا کرتے ہیں۔"

"میں ایک معمولی سا شاعر اور معمولی سا افسر ہوں۔"

"آپ صرف شاعر کیوں نہیں ہیں۔"

"اس لئے کہ میں آرام سے جینا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر آپ اعلیٰ افسر ہی ہوتے۔"

"اس کے لیے میری کوالی فی کیشن یعنی معیار قابلیت میں گھپلا تھا شاید میں انگریزی اچھی نہیں لکھ سکتا، نہ میں مقامی خاندانی ہوں، نہ صوبائی کوٹے کا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔"

"انگریزی کی قابلیت سے کیا مطلب۔ یہ تو آپ کے لیے اضافی زبان ہوگی۔"

"نہیں ہماری اضافی زبان تو ہماری قومی زبان ہے۔"

"یعنی آپ کے ہاں سب کاروبار انگریزی میں ہوتا ہے۔"

"جی ہاں"

"یعنی آپ کا سارا ملک انگریزی جانتا ہے انگریزی لکھتا پڑھتا ہے۔"

"نہیں سارے ملک میں تو آدھی سے زیادہ آبادی ناخواندہ ہے یعنی کچھ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتی۔"

"پھر یہ کیا معما ہے ۔"

"آپ میاں افضل حسین صاحب سابق صدر پاکستان پبلک سروس کمیشن سے پوچھیے" میں نے چپکے سے کہا میں اور لوگوں کے نام بھی لے سکتا ہوں مگر ابھی نہیں ۔"

"اور یہ مقامی خاندانیت اور صوبائی کوٹے کا کیا چکر ہے ۔"

"بس ہے بھئی" (میں نے جی میں کہا) "بکواس مت کرو ____ سیدھے سیدھے اخلاق تواضع اور مسکراہٹ سے کام چلانا مشن ہے ۔ اس سالی کو میرے کیریر اور میرے مستقبل کا خیال نہیں ہے ۔ اگر اس پاس کوئی عالیہ بڑا آدمی یا عاشق برطانیہ کھڑا سن رہا ہو تو دم بھر میں زن بچہ کو ٹھولا دے گا" پھر میں مسکرایا "یو سی" میں نے صفائی کی "ہم ایک ترقی پذیر معاشرہ ہیں اس میں ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں یعنی شروع میں ایسے ہی گھپلے ہوتے ہیں ۔"

آخر وہ خاتون امریکن تھی" ترقی پذیر" کی اصطلاح سن کر اُسے ایک احساس برتری والا اطمینان ہو گیا اب سے کچھ برس پہلے :۔ سے یعنی انڈر ڈے وے لپڈ یعنی غیر ترقی یافتہ کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی پھر جب ایشیا و افریقہ کے سفارتی اور سیاسی حلقوں نے غل مچایا تو مغربیوں نے دوسری اصطلاح اختیار کر لی یعنی ڈے وے لپنگ یعنی ترقی پذیر اس سے ہماری عزت نفس بھی مجروح نہیں ہوتی اور وہ بھی اور ہم بھی اصطلاح کا مطلب خوب سمجھ لیتے ہیں ۔ وہ سمجھ گئیں کہ یہ بچھا صاف صاف اپنی تاریخ غلامی بیان کرنے سے شرماتا ہے ۔

"اچھا تو آپ مجھے پیرس دکھانے کا معاوضہ کیا دیں گے ۔"

"ایک قصیدہ ۔ آپ کو معلوم ہے ہم ایشیائی قصیدے کے ماہر ہوتے ہیں ۔ قصیدہ ہماری معاشرت کے ہر شعبے میں سخت اہمیت رکھتا ہے یہاں تک کہ سیاست میں بھی قصیدہ ہی چلتا ہے ۔"

"آئی سی ۔ اچھا اگر میں پیرس نہ دکھاؤں تو آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے ۔"

"میں ۔ میں" ایک دم مجھے پنڈت نہرو یاد آ گئے" میں کمیونسٹ ہو جاؤں گا ۔"

"نو ۔ نو ۔ یہ غلط بات ہے" وہ بن کر گھبرائیں" اچھا آپ میرے لیے کیا قصیدہ کہہ سکتے ہیں ۔ مثلاً چند سطریں یا چند خیال ابھی سنائیے ۔"

"ملاحظہ ہو" میں تیار تھا ۔ آخر قصیدے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے ۔ مصرعے بھی موزوں نہیں کرنے پڑے بس ترجمہ چلا دیا ۔

"تمھارے بال یونانی کنواریوں کی آنکھوں جیسے سنہرے ہیں ۔

(حالانکہ وہ سفیدی مائل بھورے تھے)

تمہارے ہونٹ عناب کی طرح سرخ
(حالانکہ وہ مرجھائے ہوئے پتوں کی طرح زرد تھے)
تمہارا قد سرو کی طرح ہے۔
(حالانکہ وہ چھ فٹ سے زیادہ لمبی تھیں)
تم معصومیت کی اعلیٰ ترین تشبیہ ہو۔
(حالانکہ وہ سخت قطامہ لگ رہی تھیں)
تم کہکشاں ہو۔
(حالانکہ وہ کھپریل کی چھت تھیں)
تم میرا حسین ترین تخیل ہو۔
"تم یہ ہو تم وہ ہو تم ایک ہو تم ڈھمک ہو"

مادام استھیو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ ایشیائی جادو کام کر گیا تھا۔ میں سمجھا تھا وہ ٹھٹھا مار کر ہنسیں گی۔ مگر انھوں نے جیسے بے خیالی میں بٹوا کھول کر آئینہ دیکھا اپنے زرد ہونٹوں پر سرخی کی تہہ جمائی اپنے بھورے بالوں کو تھپتھپا کر درست کیا اور گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔

مگر پیرس کہاں ہے۔ اے بھائی للہ۔ پیرس تو دکھا۔

اب میرا پیرس لوور سے شروع ہوتا ہے — لوور LOUVRE جس کا اصلی فرانسیسی تلفظ ہوگا۔ لوخ بلکہ خ اور غین کے بین بین ایک آواز لیکن فرانس میں بھی انگریزی والوں کی کثرت استعمال سے یہ حال ہو گیا ہے کہ اگر لوور کہہ دیا جائے تو سمجھ لیا جاتا ہے۔ لوور فرانس کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے اور دنیا بھر کا مشہور ترین بیت الفنون یعنی آرٹ گیلری۔ ترال کے زیر زمین دوز اسٹیشن سے چلیں تو پیلے رایل یا رائل پیلس کے زمین دوز اسٹیشن پر اتر جائیں، سامنے لوور ہے۔ لوور نام کا زمین دوز اسٹیشن بھی بالکل قریب ہے بسیں بھی جاتی ہیں۔ مستقبل کے سیاح کے لیے بس نمبر بھی۔ لو بھائی مستقبل کے سیاح اس وقت آنا یاد کر لو کہ نمبر ۲۱، ۲۴، ۲۷، ۳۹، ۴۸، ۵۰، ۶۹، ۷۲، ۷۴، ۸۱، ۸۵، ۹۵ کی بسیں لوور کو جاتی ہیں، ٹیکسی پر دام ضائع کرنے سے کیا فائدہ، پیسہ بچا کر پکچر کارڈ خریدو اور گھر والوں، دوستوں، دشمنوں کو بھیج کر رعب جماؤ۔

لوور کے اندر جانے کے کئی راستے ہیں۔ اچھا ہے کہ سیلی ڈومنیشر سے داخل ہوا جائے کیونکہ سامنے ہی مرکز اطلاعات ہے جہاں عمارت کے نقشے اور مختلف شعبوں میں جملہ اطلاعات مہیا ہو جاتی ہیں — ہاں

پیسے دینے پڑتے ہیں — موٹے موٹے پارسل ڈبے، بیگ چھتری، مووی کیمرہ اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہے معمولی یعنی سادہ کیمرہ لے جاسکتے ہیں۔ تصویر بھی لے سکتے ہیں۔ مگر روشنی کے کیمرے یعنی — فلیش بلب والا کیمرہ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ روشنی تیز ہونے سے خاکوں اور مرقعوں کے رنگ خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اللہ رے فرانس — اپنی بے جان چیزوں کی یہ احتیاط یہ غور و پرداخت اور الجزائری حریت پسندوں کی جانوں اور ان کی عورتوں کی آبرو کا وہ احترام "کہ تاریخ کے بدترین دور بھی شرم شرم پکارتے ہیں۔

لوور کی بنیاد بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں پڑی۔ اس کا نام شاہ فلپ آگسٹس نے لوور کا شاہی قلعہ رکھا تھا اور اس عمارت کے کئی حصے قید خانے، اسلحہ خانے اور خزانے کے طور پر استعمال ہوئے — آج بھی ان فن کاروں کے فن پارے یہاں مقید ہیں جو فن کو ملکیت عوام سمجھتے تھے۔ اس عمارت میں بہت سی ترمیمات اور توسیعات ہوئی ہیں اور چونکہ یہ کبھی رہائشی محلات اور کبھی فوجی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا رہا اور ابتداً عجائب خانے یا آرٹ گیلری کے لیے نہیں بنایا گیا تھا اس لیے اسے تعمیری اعتبار سے ایک مثالی عجائب گھر نہیں کہا جاسکتا۔ مختلف شعبے قائم ہوتے اور پھیلتے گئے ہیں۔ دیکھنے والا ایک سادہ منصوبے یا پروگرام کے تحت "سب کچھ" نہیں دیکھ سکتا۔ صرف مرقعوں یا خاکوں کے شعبے بیسیوں ہیں۔ ماقبل تاریخ کے مرقعے اطالوی مدرسۂ مصوری، نشاۃ ثانیہ کا دور، فرنچ اور شمالی فرانسیسی ادوار جرمن مدرسۂ مصوری فلیمش مدرسۂ مصوری، ڈچ یا ولندیزی مدرسۂ مصوری۔ پھر خاص خاص صدیوں کی خاص خاص تحریکوں کے دور ہیں۔

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

پھر مصری، رومی، یونانی، اور مشرقی آثار، نوادر کے شعبے ہیں۔ بت تراشی کے شاہکار ہیں۔ جدید مصوروں بت تراشوں اور صناعوں کے کمالات ہیں۔ قدیم فرانسیسی فرنیچر کے نمونے ہیں۔ تقریباً پچاس مرقعے ایسے ہیں جنھیں عالمی شاہکار کہا جاتا ہے۔ یوں بھی لوور میں کسی مرقعے کا آویزاں ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ فن پارے اور فنکار کو سیکڑوں مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اتنا بڑا فرنچ مصور ہنری تولولا نزے عمر کے آخر تک انتظار کرتا رہا کہ اس کی کم از کم ایک تصویر لوور میں ٹکادی جائے۔ زیادہ تر فن پاروں کی باری فن کار کی موت اور مکمل شہرت کے بعد ہی آتی ہے۔ (اپنے ہاں تو یہ بھی نہیں ہوتا)

اب اس عظیم، وسیع اور لا انتہا بیت الفنون میں کوئی کیا کیا دیکھے — ہائے —

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

پچھلے مصرع ثانی بھول جائیے اور ایک دم اس طوفان میں کود پڑیے — خود

جہاں چاہے گا ہم کو لے جائے گا

آپ نے لیونارڈو دا ونچی کا نام سُنا ہوگا۔ میں نے بھی سنا تھا۔ مگر بس نام ہی نام یاد ہے اور یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ ایک عظیم مصور کا نام ہی یاد ہے۔ نہ بھی یاد ہوتا تو کیا فرق پڑتا۔ ہم لیونارڈو دا ونچی کو جانیں یا نہ جانیں ہماری اقتصادی حالت تو ویسی کی ویسی رہے گی اور اگر ملک میں الیکشن ہوئے تو ووٹ پھر بھی پیسے نے کر ہی دیں گے اور آٹے میں بھوسا اور مسالوں میں راکھ اور گھی میں تیل پھر بھی ملائیں گے۔ مگر خیر چونکہ ایک نام یاد ہے اس لیے اس نام کی لاج بھی رکھ لی جائے۔ میاں آخر کو پیرس آئے ہو اور ایک آرٹ گھر دیکھ رہے ہو کچھ تو منہ سے بولو سر سے کھیلو۔

لیونارڈو دا ونچی ایک عظیم اطالوی مصور تھا اور بس۔ زیادہ جاننا اور بتانا بالکل بیکار بات ہے تحصیل علم ایک عیب، اظہار علم اس سے بڑھ کر عیب۔ زیادہ بات بڑھاؤ تو لڑکے ہُوٹ کرتے ہیں اور پولیس والے پڑھے لکھوں کے دفتر میں نام لکھ دیتے ہیں۔

دوسری یا تیسری منزل کے برآمدے میں ایک دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر لگی ہوئی ہے جو دنیا کی سب سے مشہور اور سب سے سادہ تصویر ہے۔ یہ ایک عورت کی تصویر ہے جو نہ کوئی ملکہ تھی، نہ شاہزادی، نہ کسی صدر یا کسی وزیر اعظم کی ماں، بہن، بیٹی، بیوی، نہ وہ کوئی دولتمند عورت تھی، جیسے اس زمانے کے یورپ میں ہوتی تھیں اور اپنے عاشق یا غیر عاشق مصوروں سے اپنے مرقعے بنواتی تھیں (سُنا ہے اب ایسی خواتین ہمارے ہاں بھی ہوتی ہیں اور بہت سے افسران مہ رخوں کے لئے مصوری بھی سیکھتے ہیں) بس وہ ایک معمولی سی دیہاتن تھی۔ بھرے بھرے غیر جاذب نظر بدن کی سیدھی سادی دیہاتن جس کے لئے عظیم مصور لیونارڈو دا ونچی نے مدتوں اپنی آنکھیں پھوڑیں اور رنگوں شیشوں، اندھیروں اجالوں کے ہفت خواں طے کر کے ایک تصویر بنائی۔

اس عورت کا نام مونا لزا تھا۔

یہ مونا لزا کی تصویر ہے۔ اصلی مونا لزا۔ کیونکہ یہ تصویر کئی بار چرائی گئی اور کئی بار اس کی نقل بھی ہوئی۔ مگر جیسے چرانے والے تھے ایسے ہی تلاش کرنے والے بھی۔ جیسے نقال تھے ایسے ہی نقاد بھی۔ نتیجہ یہ کہ آج لیونارڈو دا ونچی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر مونا لزا لوور میوزیم کے ایک برآمدے کی ایک دیوار پر آویزاں ہے۔ اس کے لیے خصوصی پہرہ رہتا ہے۔ سامنے حد بندی کے لیے ایک چارپائیوں کا کٹہرا بنا کر اس پر مخمل کی سی ڈوریاں تان دی گئی ہیں تاکہ دیکھنے والے ایک خاص فاصلے تک رہیں۔

مونا لزا میں بیک وقت کوئی خاص بات نظر نہیں آتی بلکہ بہت غور سے دیکھنے پر بھی کوئی کمال معلوم نہیں ہوتا۔ مگر پہلی ہی نظر میں کچھ نہ کچھ محسوس ہوتا رہا ہے اور وہ شعور میں صدیوں کی بیلٹی اور تشہیر سے ایک نوش

ہو گئی ہے جو اس کے گہرے اندھیارے رنگ اور اس کی سادگی کے برے تاثر کے باوجود نہیں نکلتی۔

اور اگر آنکھوں کے ساتھ ساتھ ذہن بھی روشن ہو تو بصارت اور روح کی مملکتیں چشم زدن میں فتح ہو جاتی ہیں۔ مونالزا کی مسکراہٹ یورپ بھر کو مسخر کرتی ہوئی ہمارے ایشیائی کلچر میں بھی در آئی ہے اور ہماری زبان کا ایک محاورہ بنتی جاتی ہے، اس مرقع میں سب سے اہم نکتہ مونالزا کی دبی دبی معصومانہ مادرانہ خواہرانہ اور محبوبانہ مسکراہٹ ہے۔ یہ مسکراہٹ شیکسپیئر کے کرداروں یا غالب کے بہت سے اشعار کی طرح ہے جن کے ہزاروں معنی ہیں۔ ہزاروں مفہوم ہیں جن میں ہزاروں عالم چھپے ہوئے ہیں۔ اس کی قیمت کروڑوں ڈالر لگا دی گئی مگر میوزیم والے اسے بیچتے نہیں۔ آج بیچ دیں تو برسوں اربوں ڈالر کیسے کمائیں۔

یکایک مجھے ایک بیہودہ سا خیال آیا۔ فرض کیجیے مونالزا کوئی مہاجر بیوہ ہوتی اور اپنے کلیم افسر کے سامنے اسی انداز سے مسکراتی تو کیا وہ بغیر رشوت لیے انصاف کر دیتا۔ یا وہ لائن میں کھڑے ہو کر کورنگی میں ایک کوارٹر مانگتی تو کیا کرنل ہمایوں کے۔ ڈی۔ اے والے اس کا حق دے دیتے یا دلا دیتے یا ——

"شٹ اَپ یو ڈیم فول۔ تم ایک زبان دراز مزاجی ہو۔" وطن کی طرف سے چند خشمناک آوازیں آتی ہیں۔ میں گھبرا کر مادام اکمتھو کا بازو تھام لیتا ہوں اور آنکھیں جھکا لیتا ہوں۔

"سوری سر" میں کہتا ہوں "یہ تو مذاق سا تھا۔ آئی ایم سوری" اور پھر لیونارڈو دا ونچی کی دوسری تصویروں پر نظریں گاڑ دیتا ہوں۔ یہ کتنا باعزت فرار ہے۔ آئیے اس مرقعے کے خدوخال دیکھیے افسوس کہ قلم لکھتا ہے یا زبان جو بولتی ہے اسے آنکھیں نہیں ملیں نہ آنکھوں کو زبان ملی ہے۔ (کبھی سنا تھا کہ یہ بات کالی داس نے کہی ہے) دوسرا افسوس یہ کہ ہماری چھپائی میں اصلی مرقعے کے رنگ بھی نہیں آ سکتے جو ان کے امتزاج کا صحیح تاثر آنکھوں تک ہی پہنچ جاتا۔ بہرحال گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔ ویسے بھی ہم لوگ بھس ہی کھاتے ہیں۔ شرم اور تکلف کی کیا بات ہے۔ تو بسم اللہ۔

اس مرقعے کا نام ہے۔ لے بیلے فرونیئر یا ایک خاتون کا مرقع۔ یہ کوئی بھی خاتون ہو سکتی تھیں یا کوئی بھی خاتون ہو سکتی ہیں۔ ایک سادہ اوسط درجے کی خاتون جو زیورات یا بھڑکیلے لباس سے آراستہ نہیں ہیں مرقعے میں چہرے اور سینے تک گردن کا رنگ گندمی بھورا ہے، بال ہلکے کالے، لباس عنابی رنگ کا اور گلے کے گرد لباس پر جو پٹی ہے وہ بالوں کے رنگ کی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی شاید کچھ بھی نہیں، بہرحال اگر تصور کی آنکھ ان رنگوں کا امتزاج پیدا کر سکے تو شاید کوئی بات بن جائے۔ نہ بنے تو اس حقیر فقیر کی دیگر تقصیروں کی طرح یہ خطا بھی معاف کر دی جائے۔

اور یہ دا ونچی کی تیسری تصویر ہے۔ سینٹ این کا چہرہ سینٹ این نے حضرت عیسیٰ کو گود میں لے رکھا ہے، ان

کے بائیں شانے پر ایک بچے کا سر اور بال نظر آتے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ ہیں مگر مرقع کا بنیادی خیال سینٹ این کا چہرہ ہے۔ میر صاحب نے ایک عاشقانہ شعر کہا تھا:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
کرتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

ان نقوش، اس تناسب، اس تاثر، اس توازن پر میں نے سیکڑوں کو سر دُھنتے دیکھا۔ پتا نہیں لیونارڈو دا ونچی کو بھی اس کا احساس تھا یا نہیں۔ بہرحال میر تقی میر اور لیونارڈو دا ونچی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے عشق اور گداز قلب اور علوئے فن میں دونوں بلند مقام پر ہیں۔ ایک کا شعر اور ایک کی تصویر کیا مزا آیا ہے۔ حالانکہ اس وقت وہ کلیم افسر ریسٹلمنٹ کمشنر دونوں بیٹھے بنس رہے ہیں جو دا ونچی اور میر کے کلیموں کے تصدیق ناموں اور درخواستوں کا روز پڑا کرتے ہیں۔ شکر ہے میں کوئی کلیم نہیں کر رہا۔ میں میر یا دا ونچی بھی نہیں ہوں۔

کیوں بھائی کیا آج دا ونچی ہی چلے گا۔ مانا وہ بہت بڑا مصور تھا اور اس کے بہت سے عظیم مرقعے یہاں اور دوسرے عجائب خانوں میں موجود ہیں اور وہ سب ہمیں دیکھنے چاہئیں لیکن یوں تو ہمیں بہت سی اور بھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں اور ساری دنیا کے سارے نوادر اور عجائب اور شاہکاروں سے دلچسپی رکھنی چاہیے۔

عمر کوتاہ قصہ طولانی

اچھا تو بوٹیچلی بھی یہیں گریں، ریمبراں، ون گاگ اور دوسرے عظیم مصوروں کو بوٹیچلی میں نہیں دکھاؤں گا۔ دیکھنا ہے تو قاعدے سے تمیز سے احترام سے دیکھیے ورنہ مزے کیجیے سیاسی اور غیر سیاسی سنسنی خیز اسکنڈلوں اور دیگر تفریحات کا لطف اٹھائیے بوٹیچلی میں تو یہ ہے۔ اپولوں کی گیلری اس میں یہ لوہے کے دروازے دیکھئے کبھی چمکتے ہوں گے، اور اب گو لوہے کا رنگ سیاہ ہوگیا ہے لیکن اس پر کام کی نفاست برابر اپنی طرف کھینچتی ہے، اندر اوپر کی طرف دیکھیے تو چھت پر عجیب غریب نقشین کام نظر آئے گا۔ یہ گیلری چارلس ہنم نے سولھویں صدی عیسوی میں بنوائی تھی۔ ایک بار جل گئی پھر ٹھیک کی گئی۔ پھر انقلاب فرانس میں اس کے سامان اور آرائش کا نقصان ہوا پھر ۱۸۵۰ء میں اس پر کام ہوا۔ یہ لوہے کا دروازہ سنہ سولہ سو پچاس میں شاطو میسوں یعنی میسوں منزل کے لیے تیار ہوا تھا جہاں بعد میں فرانس کے ایک صدر رہتے تھے، وہاں سے یہ دروازہ لاکر یہاں لگا دیا گیا۔ اندر اور چھت پر عمدہ فن کاروں نے مختلف انداز سے مظاہرۂ فن کیا ہے۔ رنگ، جڑائی کا کام نقش و نگار فرانسیسی ثقافت کی بیش قیمت یادگاریں۔

اچھا بھئی اور آگے چلو۔ مگر چلنے کی بات یہ ہے کہ جتنا جی چاہا چلیں گے اور جب جی گھبرایا ایک دم باہر نکل

جائیں گے اور بھی پھر آئیں گے یا نہیں آئیں گے۔ ہمیں دنیا اور دور سے زیادہ پسند ہے۔ لو ور ایک عظیم مقبرہ ہے اور ایک عظیم عجائب خانہ بھی مگر دنیا تو ایک جیتا پھرتا، ناچتا گاتا، زندہ پوری طرح زندہ عجائب خانہ ہے۔

نپولین سے اہم تر

لوور کا عجائب خانہ رنگ و روغن اور حسن و فن کی بھول بھلیاں ہے۔

پتا نہیں ہم کس طرح کس کس گیلری سے گزرتے ہوئے واپس ہوئے۔ دونوں طرف بڑے بڑے استادانِ فن کے شاہکار، بت، مرقعے، برتن، فرنیچر کے مختلف اجزا، بادشاہوں کے زر و جواہر، تاج، لباس ہماری توجہ کے محتاج منت بت تھے۔ مگر مادام آمنہ یہ سب کچھ بار بار دیکھ چکی تھیں اور میں ان بے جان نمونوں سے گھبرا کر دنیا میں جلد از جلد واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ دنیا جو زندہ ہے اور عجائب خانوں سے بہت زیادہ دلچسپ ہے، پیچھے وینس (وی نس) کا مجسمہ ہے مگر میں اسے دیکھنے نہیں جاتا۔ سبھی جاتے ہیں مگر وینس بھی تو کسی کا انتظار کرے۔ واہ بیٹا!

مگر بھاگتے بھاگتے پھر ایک مرقعے نے دامن تھام لیا۔ یہ نپولین اعظم کے معرکہ ایلاؤ کی تصویر تھی جس میں خود نپولین گھوڑے پر سوار فوجوں کو آگے بڑھنے کے لئے للکارتا ہے۔

آج بھی نپولین کے بغیر فرانس کا تصور، فرانس کا نقشہ، فرانس کا جسم نامکمل ہے۔ نپولین جسے فرانسیسی زبان میں نے پولیوں کہا جاتا ہے، آج تک دنیا کی چند عجیب شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ کتابیں نپولین پر لکھی گئی ہیں۔ لکھی گئی ہوں گی، میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ مر چکا ہے اور اب اس کا حکم کہیں نہیں چلتا۔ نہ اس کے نام پر کوئی کنواری یا بیاہی جان دیتی ہے۔ نہ یورپ کے کمزور ملکوں کی خواتین اپنے بچوں کو اس کے نام سے ڈراتی ہیں۔ مگر فرانسیسی ہیں کہ نے پولیوں نے پولیوں پکار پکار کر جیتے ہیں۔ فرانسیسی بہت کچھ ہیں مگر سخت شخصیت پرست بھی ہیں۔ انھیں ہمیشہ اپنے مجموعی قومی عناصر کا ایک مظہر مطلوب رہتا ہے جس کو وہ برا بھی کہتے ہیں اور جس کی وہ پرستش بھی کرتے ہیں اور جب تک انھیں وہ مظہر نہ ملے وہ دیگر تمام چھٹ بھیوں کا پیڑا کرتے رہتے ہیں۔ اب قرنوں بعد ڈیگال صاحب فرانسیسی خودداری، نازک مزاجی، آزادی اور عظمت کی علامت بن کر نمودار ہوئے ہیں تو جمہوریت کے باپ یا ماں فرانس میں آمد دلی مضبوطی اور خارجی وقار پھر نمایاں ہے ورنہ وہاں تو پاکستانی رفتار سے بھی زیادہ تیزی

کے ساتھ حکومتیں اور سربراہ حکومت بدل دیئے جاتے تھے اور ڈیگال صاحب نے بھی فرانس کی صدارت یوں ہی آسانی سے قبول نہیں کرلی بلکہ پارلیمنٹ کو ناکوں چنے چبوائے ۔ دستور میں ترمیم کرو' یہ اختیار دو، وہ طاقت دو، تب کام کروں گا اور فرانسیسی تنک مزاج سیماب وش (کیا ثقیل اصطلاح دھم سے کودی ہے) فرانسیسی گویا ہاتھ جوڑ کر صدر صاحب کے ایک ایک اشارے پر وہ اصول اور نکتے قربان کرتے رہے جن کی خاطر وہ سیاسی ابتری اور اقتصادی تباہی کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ ہاں تو بات نپولین کی تھی اور ذکر آگیا میاں ڈیگال کا۔ ڈیگال صاحب لمبے ہیں۔ نپولین پستہ قد تھا۔ انھیں بڑھاپے میں عروس اقتدار ملی۔ وہ پچپن جوانی میں اسے بیوہ کرگیا۔ وہ لڑتا تھا یہ صرف جھگڑتے ہیں۔ اس نے بھی انگریزوں سے ٹکر لی تھی انھوں نے بھی ٹکر لی ہے ہما سے بھی ابتدائی فتوحات ہوئی تھیں انھیں بھی ہورہی ہیں۔ دونوں فوجی اور دونوں فرانس کے عاشق ہیں نپولین کو فرانس سے عشق تھا اور وہ اسے یورپ بلکہ دنیا بھر کی ایک عظیم طاقت بنا دینا چاہتا تھا یہی ڈیگال صاحب بھی چاہتے ہیں ہما سے اپنے آپ سے محبت تھی، یہ بھی اپنی ذات پر فریفتہ ہیں" میں فرانس ہوں" ان کا قول ہے اور اسی قسم کے اقوال زریں نپولین کے ملفوظات میں بھی مل جاتے ہیں۔

مگر نپولین نپولین تھا عاشق مزاج حرماں نصیب فاتح یورپ جو انگریزوں کی قید میں مرا۔

میں نپولین کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں کہ ایک پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ شاید آپ بھی جانتے ہوں گے۔ بلکہ بھی جانتے ہوں گے۔ آزادی سے پہلے تو ہمارے نصاب میں بھی اس کا ذکر آتا تھا۔ گو اس وقت ہمارے مدرسین انگریزوں کے دباؤ سے اسے کچھ مسخ کرکے ہی پیش کرتے تھے۔ بہرحال نپولین کو سب جانتے ہیں مگر اس سے بھی زیادہ اہم ایک شخص کو نہیں جانتے جو اسی کے زمانے میں تھا بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ تھا اور اس تصویر میں بھی موجود ہے کیا آپ اسے جانتے ہیں اگر جانتے ہیں تو بتائیے وہ کون ہے بلکہ پہلے تو یہ بتائیے کہ میری مراد کس شخص سے ہے۔ اس تصویر میں چہرے اچھی طرح پہچانے جاتے ہیں اور اگر آپ اسے جانتے ہوں گے فوراً پہچان لیں گے۔

مگر دیکھیے آپ اسے نہیں پہچانے اور اس شناخت پریڈ کا بار بھی مجھ حقیر فقیر کو اٹھانا پڑا۔ لیجیے غور سے دیکھیے وہ اہم ترشخص اس کے دائیں بازو اور بائیں بازو اور آگے اور پیچھے کھڑا ہے اور دوڑ رہا ہے اور چیخ رہا ہے اور مرگیا ہے' وہ اہم ترشخص عام آدمی ہے یعنی ازعوام۔ وہ شخص وہ بے نام آدمی ہے جو ہمیشہ بے نام رہا اور آج بھی بے نام ہے اور نہ جانے کب تک بے نام اور گمنام رہے گا۔ اسے نپولین ہر جگہ لڑاتا ہے اور خود نام پیدا کرتا ہے یہ وہ سپاہ ہے جس کا سالار نپولین ہے' سپاہ یعنی فوج یعنی ایک سپاہی ہزار لاکھ سپاہی' لاکھ عام آدمی۔ نپولین جس بحران کی پیداوار تھا وہ انقلاب فرانس سے پیدا ہوا اور انقلاب فرانس کے خالق تھے عوام۔ فرانسیسی عوام

جنھوں نے یورپ میں پہلا سیاسی عوامی انقلاب برپا کیا اُنھوں نے شاہی کا خاتمہ کر دیا مگر پھر نپولین کی بادشاہت قبول کرلی۔ انقلاب کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں بیسٹیل (بیس تیل) کا قلعہ بھی دیکھ لیجیے جو ۱۷۸۹ء میں عوامی ہاتھوں نے فرشِ زمین کے برابر کر دیا تھا۔ اس قلعے میں عوامی قیدی رکھے جاتے تھے جن کو چھڑانے کے لیے فرانسیسی عوام نے قلعہ ہی ڈھا دیا تھا مگر پھر نپولین نے پندرہ بیس برس کی مدت میں پورے فرانس کو بیسٹیل بنا دیا۔ بلکہ یورپ بھر کو فرانسیسی جیل خانے میں بدل دینے کی تیاری کرلی تھی اور یہ اس کے ساتھ اس مرقعے میں جو شخص ہے یا جو اشخاص میں وہ یہ ہیں یا ان کی اولاد ہیں جنھوں نے بستیل کو توڑا تھا مگر جو خود دنیا بھر کو بیسٹیل بنانے پر تل گئے ہیں۔

آپ نے انقلاب فرانس کے سلسلے میں ایک لطیفہ تو سنا ہوگا نہیں سنا تو لگے ہاتھوں یہ بھی سہی۔ قوام غیر ملکی سہی مگر چاشنی ایشیائی بلکہ پاکستانی ہے۔

ملکہ فرانس نے سنا کہ محل کے باہر بلوائی جمع ہو کر غل مچا رہے ہیں۔ پوچھا کیا قصہ ہے۔ خدام نے کہا ملکہ معظمہ انھیں روٹی نہیں ملتی۔ "اوہو" انھوں نے فرمایا "بڑے بیوقوف ہیں یہ۔ ارے ان سے کہو جس دن روٹی نہ ملے اس دن کیک کھا لیا کریں۔"

آل رائٹ یور جسٹی نپولین صاحب بہادر رخصت عطا کیجیے۔ آپ بڑے بہادر بڑے جیالے، بڑے کن رس، اہل دل اہل نظر تھے مگر آپ تھے اور میں ہوں اور اس سے پیشتر کہ میں نہ رہوں مجھے تھوڑا بہت پیرس دیکھ لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر میں نے پیرس نہ دیکھا تب بھی میں مرجاؤں گا اور دیکھ لیا تب بھی۔ سو یہ بہتر ہے کہ دم سادھ کر چپ چاپ موت کے منہ میں جانے کی بجائے میں اسے اپنے پیچھے پیچھے دوڑا دوں میں پکڑا ضرور جاؤں گا مگر وہ بھی تو تھوڑی بہت ہانپ جائے گی۔

آج سورج بڑا مہربان ہے۔ وہ کہر دھند اور بادلوں سے لڑ جھگڑ کر اس فروری کے مہینے میں بھی دلوں اور جسموں کو گرما رہا ہے۔ اصل میں تو وہ جسموں کو گرما رہا ہے جسم گرم ہوں تو دل بھی گرم ہو ہی جاتے ہیں۔ اب مادام آمنہ کے بڑھاپے نے بھی انگڑائی سی لی ہے اور انھیں پیدل چلنے پر اصرار ہے۔

ہم پیرس کی گلیوں میں گھومتے ہیں۔ بہت سی گلیاں تنگ اور تاریک ہیں کچھ روشن بھی ہیں مگر ایک رومان انگیز قدامت سب پر چھائی ہوئی ہے۔ خوانچے والے اور خوانچے والیاں قدم قدم پر ہیں۔ سیب، اخروٹ، پستے اور ... کھانے میں بڑا مزا ہے۔ سردی کی وجہ سے کیفوں کے آگے پٹری پر بیٹھنے کا مزا نہیں مگر اس کا علاج انھوں نے یہ کیا ہے کہ شیشہ بند کیبن لگا دیے ہیں تاکہ پٹری پر بیٹھنے کا ذائقہ محسوس ہوتا رہے۔ پیرس کے ریسٹوران یا کیفے میں اندر گھس کر بیٹھنے میں کوئی لطف نہیں۔ پھر وہ پیرس ہی کیا ہوا وہ تو لندن یا نیویارک یا کوئی بھی انگریز

شہر ہوا مزا سارا بے تکلفی اور تضیع الاوقاتی میں ہے (اللہ اکبر کیا گاڑھی اُردو ہے) کیفے میں ایک بار بیٹھنے کے لئے کرسی مل جائے تو آپ ایک کافی کی پیالی لے کر سارا دن ساری رات بیٹھ سکتے ہیں کسی مائی کے لال میں ہمت نہیں کہ وہ اپنے طور پر بل دینے یا دوسری فرمائش پوچھنے آئے۔ کافی کی پیالی ایک سکوری ہوتی ہے جس میں کوئی چار ماشے نہایت گہری بے دودھ کی کافی آتی ہے بس وہ سامنے رکھ لیجئے۔ ٹوپی سر سے اتارنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر اتاری تو بے وقوفی یا اجنبیت کی نشانی سمجھی جاتی ہے کچھ کھانا یا بار بار کافی منگانا بالکل غیر ضروری ہے۔ بیرا یا مالک آپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا بلکہ اصل میں وہ آپ سے آرڈر یا فرمائش لینا ہی نہیں چاہتا اُس کے لیے آپ کو دو چار بار چیخنا پڑے گا یا میز بجانی پڑے گی۔

رہ رہ کر ایک پیاری یا منحوس قسم کی خاتون کیک پیسٹری کا تھال لیئے ہوئے آپ کے سامنے سے گزرتی ہیں اور آپ کی پسند کی چیز نقد ایک فرانک لے کر میز پر رکھ دیتی ہیں بہت میزبان اور تمیزدار ہوئیں یا کیفے ہی زوردار رہا، مثلاً شان زالیزے پر واقع ہوا تو ایک چھوٹی سی طشتری میں رکھ دیں گی ورنہ کافی کی پلیٹ کے کنارے پر ٹکا دیں گی۔

اب آپ کو کسی انٹلکچوئل ہم زبان کی تلاش ہوگی۔ آپ پیرس کی روایات سے مسحور اپنا سکہ جمانے کے لئے بیتاب ہیں۔ آج کل لومبا کا قصہ چل رہا ہے۔ لومبا صاحب کو کانگو میں غائب کر دیا گیا ہے اور پیرس کے لیفٹ بینک یعنی دریائے سین کے بائیں کنارے والے پورے فرانس کا تختہ اُلٹ دینے کے درپے ہیں آپ اس موضوع پر کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں کسی گروہ کسی گروپ کسی پارٹی میں بول سکتے ہیں تعارف رسمیات سلام دعا کی باکل ضرورت نہیں۔

"یہ سب بکواس ہے" میں چیخ کر ایک بہت ہی خوبصورت گلابی رنگت کی لڑکی کو ڈانٹتا ہوں جو ایک نیلے رنگ اور بند گلے کا سوئٹر پہنے ایک میز پر ہاتھ مار مار کر انگریزی میں بول رہی ہے اور دو امریکن جرنلسٹ نظریں اس کے سنہرے بالوں پر جمائے ہوئے گردن ہلا ہلا کر اتفاق رائے کر رہے ہیں۔

وہ لڑکی برا نہیں مانی امریکنوں نے تیوری چڑھانی چاہی مگر اس سے پیشتر کہ وہ اپنی بہادری کا اعلان کرتے وہ لڑکی مجھ پر پل پڑی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو میں۔ اس نظریئے کے خلاف باقی سب قیاس آرائیاں حماقت اور کم عقلی کا ثبوت ہیں" یہ کہتے ہی گویا اس نے مجھے اپنی پارٹی میں مباحثے کے لئے قبول کر لیا اور میں مادام استھر کا ہاتھ تھامے ہوئے اس میدان کارزار میں کود پڑا اور جب تک ہم لڑتے رہے بلکہ لڑائی کے بعد بھی تعارف کی ضرورت پیش نہ آئی۔

مگر یہ ترکیب فرانسیسیوں کے ساتھ نہیں چلتی۔ وہ انگریزی جانتے بھی ہوں گے تو فرانسیسی ہی بولیں گے

آپ اکیلے ہوں اور فرانسیسی نہ جانتے ہوں تو اِدھر اُدھر دیکھ کر ہزار مسکرائیں کوئی کتاب ہاتھ میں پکڑ کر دس بار سر ہلائیں، دلچسپی کریں کوئی اخبار زور سے پڑھ کر کسی خبر پر بلند آواز سے برہمی کا اظہار کریں کوئی فرانسیسی آپ کو گھاس نہیں ڈالے گا۔ نتیجے میں آدمی ایسے شعر یاد سے کہنے لگتا ہے:

پیرس جس کا شور تھا اتنا نکلا پیار سے خالی
گھر سے کیا کیا نار نویلی تک تک دیکھے عالی

مگر ہر فرعونے را موسیٰ - ہر مرض کا علاج موجود ہے۔ خدا بخشے چچا جان یا دادا جان ایسے مواقع کے لئے ایک آسان نسخہ بتا گئے ہیں اور وہ ہے مصوری جس پر ماہ رُخ جان دیتے ہیں۔

بڑی اور مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر گلی ہر کوچے میں مصور لوگ ڈیرے جمائے پڑے ہیں۔ محاورے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ڈیرے دار مصور ہیں۔ ڈیرے دار تو اسٹوڈیو رکھتے ہیں۔ ان کا اسٹوڈیو ایک کینوس اور ایک کرسی ہے بلکہ اکثر اوقات کرسی بھی نہیں ہے کسی دیوار کے ساتھ کینوس ٹکایا اور چل مرے خامے بسم اللہ۔ مرد عورت رستہ چلتے ٹھٹک ٹھٹک کر دیکھتے ہیں۔ کچھ نقادانِ فن اعتراض یا تعریف کر دیتے ہیں۔ اہلِ دول خرید لیتے ہیں یا پیسے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ جو مصوران کے گزر جانے سے پہلے نہیں اٹھاتا اور صرف اہلِ دل وہیں جم جاتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہی پٹڑی پر بیٹھ کر نظارۂ تخلیق کا لطف اٹھاتے ہیں۔ بعض "اہلِ کمال" کینوس اور قلموں اور رنگوں کے ڈبوں کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔ وہ رنگ برنگی یا ایک ہی رنگ کی کھریا سے دیواروں پٹڑیوں بلکہ کبھی کبھی تو خاص سڑک پر نقش و نگار بنانے شروع کر دیتے ہیں اور خاصے پیسے کما لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے ساں جرماں سڑک پر عین کیفے فلورا در کیفے دماگو کے بیچ میں سے گزرنے والی گلی پر روز نئے نئے نقش بنانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ وہ دن بھر اس قطعے پر کام کرتے ہیں۔ پیدل چلنے والے اور سائیکل سوار تو رعایت کر کے اِدھر اُدھر سے گزر جاتے ہیں مگر موٹر والے احتیاط کے باوجود کوئی نہ کوئی لکیر مٹا دیتے ہیں جسے وہ دوبارہ اور نئے طریقے سے بناتے ہیں۔ اس خرابی اور تعمیرِ نو کا ریکارڈ باری باری چند شوقین لڑکیاں رکھتی ہیں۔ شام کو کیفے فلورا اور کیفے دماگو (بروزن دعاگو) کے حریف نقادانِ عظیم اس نقش کے معنی نکالتے ہیں یعنی اس میں اپنے اپنے معنی ڈالتے ہیں اور پھر نقش کی مختلف باریکیوں اور ظاہر اور چھپے ہوئے گوشوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ دو کیفے ساں جرماں سڑک پر ایک ہی قطار میں ایک گلی بیچ کر کے واقع ہیں اور فرانس بھر میں حریف دبستانوں کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اصل میں زیادہ مشہور کیفے فلور ہے کیونکہ یہیں سے مشہور فرانسیسی ادیب نے اپنی مقبولِ زمانہ یا رسوائے عالم تحریک وجودیت چلائی تھی جو آجکل پاکستان میں جمیل جالبی اور انتظار حسین اپنے اپنے سہارے

اور میرغی انداز میں چلا رہے ہیں لیکن کیفے فلور اب تحریک وجودیت سے پاک ہو چکا ہے۔ اور ژاں پال سارتر (یا ژاں پال ساخت) صاحب اب ادھر تشریف نہیں لاتے۔ ان کا گھر سامنے والی یعنی دہلی گلی میں ہے مگر اب وہ ادھر آنے کی بجائے اُدھر یعنی بائیں طرف کیفے دماگو میں جاتے ہیں بلکہ زیادہ تر گوشہ نشین رہتے ہیں اور کیفے فلور کی مسخ شدہ فضا میں تاسف کی آہیں بھرتے ہیں کیونکہ کیفے فلور پر خالص نئی نسل نے قبضہ کرلیا ہے۔ یہ نئی نسل انھیں تو مانتی ہی نہیں، خود کو بھی نہیں مانتی یعنی بالکل ہی نئی ہے

"ہمارے جیتے جی سارتر صاحب اب اس کیفے میں نہیں آسکتے" ایک نوجوان نے مادام اسمتھ کی ترجمانی کے سہارے گفتگو کی۔ وہ مجھے کوئی بہت ہی پھٹیچر آدمی سمجھ رہا تھا کیونکہ میں نے بڑے شوق سے تقریباً آنکھیں پھاڑ کر ژاں پال سارتر کے متعلق سوال کیا تھا۔

"کیوں کیا آپ انھیں قتل کردیں گے" میں نے بگڑ کر اس طرح پوچھا جیسے مارپیٹ پر اُتر آؤں گا۔

"آہ موسیو کیا آپ کو معلوم نہیں۔"

"نہیں"

"ارے ہم نے انھیں پچاس صفحے کا سوال نامہ بھیج رکھا ہے جس کا جواب وہ آج تک نہیں دے سکے اور جواب دیئے بغیر وہ ہمیں منہ نہیں دکھا سکتے"

"کیا تھا اس سوالنامے میں؟"

"اجی آپ کو تو کچھ معلوم ہی نہیں کیسے جیتے ہوئے ہم نے اسے اپنے سائیکلو اسٹائیلڈ میگزین میں چھاپ کر تقسیم بھی کردیا ہے۔ اس سوالنامے میں ان سے حیات و کائنات، فرانسیسی خارجہ پالیسی، گوشت کی قیمتوں اور جنگلات برازیل کے تہذیبی ماخذ پر ان کا موقف معلوم کیا گیا ہے۔"

"یہاں آج کل آپ کا چیف یعنی سردار کون ہے۔"

"یہ خاکسار" وہ بے شرمی سے مسکرائے اور اُن کے زانو پر بیٹھی ہوئی ایک بہت ہی نوعمر لڑکی نے ایک لذت انگیز چیخ مار کر اپنے ہونٹ ان کے ہونٹوں سے پیوست کردیئے۔ ہم چپ بیٹھے رہے۔ ایک ایک کافی منگائی اور چسکیاں لے کر پی۔ مادام اسمتھ پہلے انھیں اور پھر ادھر ادھر دیکھتی رہیں میں گھڑی دیکھتا رہا۔ کافی ختم کرنے کے بعد ہم دونوں اٹھ کر چلنے لگے تو انھوں نے اسی کیفیت میں بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ ہلا کر کچھ بوسے بھیج رخصت کردیا۔

کچھ شہر کچھ رات

اب پیرس کی رات آپہنچی جو بہت خوبصورت، بہت گھناؤنی اور بہت دلچسپ ہے۔

یہ رات ہے جب بزرگوں کے بقول نیکیاں سو جاتی ہیں اور جرائم جاگ اٹھتے ہیں۔ بزرگوں کی بھی کیا بات ہے نیکیوں کو بچوں سے تشبیہ دی اور جرائم کو نوجوانوں سے۔

مگر یہ پیرس کی رات ہے جو نیکی بدی، اچھائی برائی، بوڑھے جوان میں تمیز نہیں کرتی۔ ایک طوفان کی طرح آتی ہے اور جو اس کی زد پر آجائے اسے خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جاتی ہے۔

اب مادام استھر ساتھ چھوڑنے والی ہیں — "اگر آپ کو پیرس کی اصل رات دیکھنی ہے تو کسی نئی ملاقاتی خاتون کے ساتھ نہ گھومیے۔ پیسے کافی ہوں تو کوئی چلتی پھرتی عورت کرائے پر لے لیجیے۔ ورنہ کسی مرد سیاح کا دامن تھام لیجیے۔ آپ جیسے بہت سے سہانی کا شکار ساتھی بے ملاقاتی آپ کو مل جائیں گے۔"

"خدا حافظ مادام میں اکیلا ہی اس طوفان کا مقابلہ کروں گا۔"

شانز ایلیزے قوس و قزح کی طرح روشن ہے۔ رات کی سردی میں دھند بار بار روشنیوں پر حملہ کرتی ہے۔ کسی دربار کسی اور گلی کی روشنیاں ہوتیں تو سردی کے تھپیڑوں اور دھند اور کہر کی یلغار سے گھبرا کر گل ہو جاتیں مگر یہ شانز ایلیزے ہے — سدا سہاگن — سدا بہار — تازگی ہی تازگی — زندگی ہی زندگی۔ لوگ ریستورانوں کے آگے لگے ہوئے کیبنوں میں چھپے ہوئے بیٹھے ہیں۔ دروازے کھلنے کے ساتھ زہریلے جھونکے دوڑ دوڑ کر سرد طمانچے مارتے ہیں۔ مگر یہ لوگ ڈٹے رہتے ہیں۔ ان روشنیوں ان رنگ برنگ قمقموں میں کوئی جادو ہے کوئی طلسمات ہے یا یہ کچھ آپ بھی سمجھ سے ہٹے طوفان رنگ و بو کا اثر ہے — ہائے طوفان رنگ و بو — بہت سے رنگا رنگ اور گوناگوں خوشبو کے بادل ایک دم اس طرح اکٹھے ہو گئے ہیں کہ نہ قوت باصرہ ان کی تاب لا سکتی ہے نہ قوت شامہ۔

ارے صاحب وہ نائٹ کلب کہاں ہیں۔

نائٹ کلب بے شمار ہیں مگر وہاں صرف جرأت رندانہ سے کام نہیں چلے گا بلکہ جرأت رندانہ کی تو ضرورت ہی نہیں صرف روپیہ چاہیے۔ روپیہ یعنی فرانس کا سکہ فرانک یعنی زر۔ او ہو۔ کیا بے موقع شعر یاد آیا ہے اور وہ بھی فارسی کا:

اے زر تو خدا نہ ای ولیکن بخدا
ستارعیوب وقاضی الحاجاتی

اس کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہے کہ اے زر تو خدا نہیں ہے لیکن عیبوں کو چھپانے اور ضروریات کو پورا کرنے والا ہے۔ ویسے شعر ذرا کمزور ہے کیونکہ چھوٹی بحر میں ہونے کی وجہ سے کئی باتیں رہ گئیں مثلاً

اے زر تو ووٹ نہیں لیکن ..... ووٹ بنانے والا ہے
اے زر تو جج نہیں لیکن ..... اچھا وکیل دلانے والا ہے
اے زر تو طاقت نہیں لیکن ..... طاقت بنانے والا ہے
اے زر تو پیرس نہیں لیکن ...... پیرس دکھانے والا ہے
اے زر تو عورت نہیں لیکن ..... عورت پٹانے والا ہے

یہ شاں زالیزے پر پیرس کا سب سے مشہور نائٹ کلب لیڈو ہے۔ جہاں میں نہیں جا سکتا حالانکہ میں اچھی آنکھ رکھتا ہوں اچھے کان رکھتا ہوں۔ میرا ذوق بے پایاں اور شوق فراواں ہے۔ میرا تخلص عالی ہے مگر میری جیب خالی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ موٹے موٹے چھوٹے چھوٹے بے ہنگم ادھیڑ اور بوڑھے سیاح اور مقامی نرم نازک چمکتی دمکتی مہکتی چہکتی میناؤں کے بازوؤں میں بازو ڈالے دھڑا دھڑ لیڈو میں داخل ہو رہے ہیں جہاں وہ گرم ہال میں بیٹھ کر سرد شمپین پئیں گے تلے ہوئے پستے بادام کھائیں گے دیگرل انڈا اڑائیں گے۔ اور باکمال فنکاروں کے کرتب اور نیم عریاں اور عریاں رقص ملاحظہ فرمائیں گے نہ کچھ سمجھیں گے نہ سمجھائیں گے اور مجھے شب بھر خون کے آنسو رلائیں گے۔

(مگر آپ کب تک یہ بکواس کیے جائیں گے)

فرض کیجیے میں ان امیر سیاحوں میں شامل ہوتا اور رکھانستا ناک پونچھتا ہانپتا کانپتا اپنی توند پر کسی مبولی لمبی چوڑی بیٹی سنبھالتا ایک خوبصورت خاتون کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لیڈو میں داخل ہو جاتا تب کوئی اور جمیل الدین عالی یا علیم الدین جعلی باہر کی دیوار سے ٹیک لگائے میری طرف دیکھ دیکھ کر بے نقط سناتا۔ جب تک دنیا میں آسائشیں اور لذتیں منصفانہ طور پر تقسیم نہیں ہوتیں یہی چکر چلتا رہے گا۔ بس اے عزیز یہ تجربہ یہ نصیحت

کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو اور ہدایت نامہ شب پیرس شروع کرتے ۔

اوپیرا کے شوقین دو جگہ جا سکتے ہیں ۔ اوپیرا بمقام پلاس ڈی لا اوپیرا ۔ (پلاس کا انگریزی تلفظ ہوگا پلیس یعنی جگہ) فون نمبر اوپی ای ۱۵۵۹ اور اس کا زیر زمین اسٹیشن ہے اوپیرا ــــ دوسری جگہ ہے ۔ اوپیرا کومیک یعنی کامک یعنی مذاقیہ اوپیرا جس کا فون نمبر ہے آر آئی سی ۲۰۰۷ اور زیر زمین اسٹیشن ہے رشی لو ورُو ــــ سبحان اللہ کیا معلومات کا دریا ہے کہ فون نمبر بتائے جا رہے ہیں ۔ زیر زمین اسٹیشنوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے گرمیندہ مجبور ہے سیاحوں کی آسانی کے لیے بورڈم پھیلانے پر بھی آمادہ ہے ۔ فون پہلے سے کر لیا جائے تو نشست محفوظ ہو جاتی ہے ۔ زیر زمین ریل سے جایا جائے تو چار پانچ روپے بچ جاتے ہیں ۔ کر بھلا ہو بھلا ۔ کلاسیکل تھیٹر کُل پانچ ہیں میرے پاس ان کے نام فون نمبر اور تفصیلی پتے موجود ہیں مگر آپ وہاں نہیں جائیں گے جب میں نہیں گیا تو آپ کیسے جا سکتے ہیں ہمیں اپنی کلاسیک سے تو دلچسپی ہے نہیں فرانسیسی کلاسیک کو خاک سمجھیں گے بلکہ ہمیں لفظ کلاسیک کے معنی بھی نہیں معلوم نہ جاننا چاہتے ہیں ۔ ہاں ہلکے پھلکے تھیٹروں کے بارے میں جان لیجیے یہ گیارہ ہیں اور ان میں کئی زبانوں میں ڈرامے اسٹیج ہوتے ہیں انگریزی کے دو ہیں ۔ اور فون نمبر اور پتے ۔ آئی ۔ ایم ۔ سوری ۔

دو بڑے اوپیرا گھروں کے علاوہ جن کے نام ابھی بتائے، چھوٹے چھوٹے اوپیرا گھر بھی گیارہ ہیں جہاں تھیٹر بھی ہوتا ہے اور اوپیرا بھی ۔ مگر ایک ٹکٹ میں ایک ہی مزا ملتا ہے یعنی یا تھیٹر یا اوپیرا ۔ اب ہیں ایڈوانسڈ تھیٹر یعنی بالکل جدید ۔ ان کے اسٹیج گھومتے ہوئے منظر بدلتے ہیں ۔ اور ڈرامے کی تکنیک بھی جدید سے جدید تر ہوتی ہے مگر میں پھر معذرت کرتا ہوں کہ جب ہمیں کلاسیک یعنی قدیم سے واسطہ نہیں تو جدید سے کیا تعلق ۔ جدید تو قدیم کا دوسرا رخ ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ :

"ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اس لیے اب میری مانیے قدیم و جدید اوپیرا ڈرامے تھیٹر موسیقی کو چھوڑیے اور پگال چلیے پگال ۔

"کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

آرچ ڈی ٹرائمف کے داہنے ہاتھ اتوال کا زیر زمین اسٹیشن ہے ۔ اس سے بارہ نمبر (یا شاید چھ نمبر) کی ریل لی اور سیدھے پگال پہنچے ۔ اتوال سے چھٹا اسٹیشن ہے کوئی دس منٹ میں آ جاتا ہے ۔ باہر نکلے تو :

مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے

سڑک کے دونوں طرف اور اگر مغرب کی طرف منہ کر کے چلیں تو الٹے ہاتھ کو یعنی جس طرف مولاں روژ کا نائٹ کلب ہے اس طرف والی پٹڑی پر سیروں لیلائیں :

ہونٹ پہ رنگت گال پہ لالی چال چلے متوالی

کا منظر پیش کر رہی ہیں۔

" ہے موسیو۔ یو وانت می "

ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں۔ ان آوازوں کے بہت سے ترجمے ہوسکتے ہیں۔ مگر دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور اسکول کا فرق پڑے گا۔ مثلاً:

دلّی: کیوں پیارے چل رہا ہے۔

لکھنؤ: ہے ہے ذری ادھر تو ملاحظہ فرمائیے۔

حیدرآباد: کیا حضرت ہمیں پسند فرمائے۔

لاہور: بچ موڑ توں ادے۔

اِسں بڑی پر راہگیروں کا رستہ چلنا دشوار ہے۔ بھئی آپ کہیں اور جا رہے تھے تو پگال سے کیوں گزر رہے ہیں، پگال تو پگال ہے۔

یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

ایک چھوٹے قد کا آدمی جلدی جلدی چل رہا تھا، ایک طرح وہ بھاگ رہا تھا کہ ایک دراز قد موٹی تازی "نازنین" سے ٹکرا گیا۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا وہ شخص وہیں جم کر رہ گیا۔ میں ایک طرف کھڑا ہوکر دیکھنے لگا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بدکنے بھدکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر نازنین مسکرائی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پر گاڑ دیں۔ پھر ایک آنکھ اس طرح میچی جیسے شعرائے اُردو آنکھ مارنا کہتے تھے (اب بھی کہتے ہوں گے) مگر وہ شخص گھبرایا ہوا ہی رہا۔ وہ دونوں فرانسیسی بول رہے تھے۔ ان میں تیز تیز گفتگو ہوئی۔ آس پاس سے آٹھ دس نازنینیں جمع ہوگئیں۔ مرد نزدیک نہ آئے۔ مرد تھے ہی کہاں۔ راہگیر تھے سو اپنے اپنے چکروں میں لگے ہوئے تھے، دکان دار تھے سو چپ چاپ آرام سے کافی شراب بیچ رہے تھے کسی نے آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ پھر دراز قد لیلا نے پستہ قد مجنوں کو بائیں ہاتھ سے پکڑ لیا اور دائیں ہاتھ سے اس کی ناک پر ایک بھرپور گھونسا مارا۔ مجنوں کا بانسا پھٹ گیا وہ لڑکھڑا گیا اور اس نے لیلا کے پیٹ میں لات مارنی چاہی مگر لات لیلا کے گھٹنے پر اس طرح لگی جیسے ایک چیونٹی گر کر گھگیر پر لگتا ہے۔ جواباً لیلا نے وہی گھٹنا اس کے سینے پر مارا اور وہ گر پڑا۔ اور میں وہیں کھڑا رہا میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لیلا کا قد ناپا۔ وہ مجھ سے بھی لمبی تھی اور کافی تگڑی بھی تھی چنانچہ میں فوراً دکان کے دروازے میں گھس گیا اور ایک کافی کا آرڈر دے دیا۔ اب لیلا کی سہیلیوں نے مجنوں کو ٹھوکریں ماریں۔ دو چار نے اس پر تھوکا بھی، ایک نے جھک

گر اس کی جیب میں بھی ہاتھ ڈال دیا مگر اسی وقت ایک گشتی پولیس والا آگیا ـــــ اور ریلائیں پھر سے ہوا ہو گئیں۔ میں باہر نکل کر آگے چلنے لگا۔

"یو دانت می موسیو"

"بادِ مچ ماداموزیل" (کتنی رقم ہوگی)

"نورتی نیو فرانکس" (چالیس نئے فرانک)

"ٹو مچ" (بہت زیادہ ہیں)

"اوکے تھرتی" (اچھا تیس)

"ٹو مچ"

"ٹو تھرتی آل رائٹ۔ آئی ایم بیوٹی فل موسیو۔ آئی ول بی ویری گڈ" (نہیں تیس ٹھیک ہیں۔ میں کتنی خوبصورت ہوں۔ میں بہت اچھی ثابت ہوں گی۔")

پیرس میں رنڈی کا پیشہ قانوناً ممنوع ہے یعنی قانون کے لحاظ سے کوئی عورت لائسنس دار رنڈی نہیں ہے (شاید ایسا ہی قانون کراچی پر بھی عائد ہوتا ہے) لیکن کسی مرد عورت کا بغیر شادی ساتھ رہنا خلاف قانون نہیں ہے۔ اب ساتھ رہنے میں کم اور زیادہ وقت کی پابندی تو ہے نہیں۔ آدھے گھنٹے اور آدھی عمر یا ایک گھنٹے یا ایک پوری عمر کی ایک ہی بات ہے۔ ہمارے ہاں اس موقعے کے لیئے ایک مثل ہے:

"جب دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی"

فرق یہ ہے کہ پگال میں دل کا سودا نہیں ہوتا اس لیے قاضی بھی آنکھیں بند کر کے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے ـــــ ہائے رے قاضی۔

یہ سامنے مولاں روژ ہے۔ مولاں روژ نائٹ کلب جہاں اس صدی کے اوائل میں مشہور مصور کاؤنٹ ہنری تو لو لاترے رات بھر بیٹھا رقاصوں اور تماشبینوں کی تصویریں بنا تا رہتا تھا اس کی وجہ سے یہ نائٹ کلب بقول اپنے کافی ہاؤس والوں کے لازوال ہو گیا ہے۔ لاترے کے دونوں گھٹنے بچپن کے ایک حادثے میں ٹوٹ گئے تھے اس لئے وہ لڑکھڑا کر چلتا تھا۔ اس کی بچپن کی محبوبہ اس کی چال دیکھ کر ڈر گئی تھی اور کوئی اور عورت اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ تمام رات شراب پیتا اور آنے جانے والوں کی تصویریں بناتا تھا۔ اس نے کلب کی رقاصاؤں کی آنکھوں کا دکھ کینوس پر اُتار دیا تماشبین امراکی سطحیت، نوجوانوں کی جذباتیت، ملازموں کے نقاہت آنے والے شماتیں سب اس کے قلم میں سمٹ آتے تھے۔ وہ دکھوں اور راندہ روٹی غذاؤں کا مصور

تھا۔ اور مولاں روژ میں عمر گزار گیا۔ میں نے مولاں روژ کے سامنے کھڑے ہو کر سخت سردی کے باوجود ہیٹ اتارا اور دروازے کے آگے جھک گیا۔ دربان مجھے کوئی نووار دعرب یا الجزائری سمجھ کر بڑا حیران ہوا۔ اور خود جواباً جھک گیا۔ میں نے دوبارہ جھک کر تعظیم دی اور آگے بڑھ گیا۔

اب چاروں طرف مہنگے اور سستے نائٹ کلب ہیں۔ مولاں روژ تو بہت مہنگا ہو گیا ہے کیونکہ یہاں فقر جاپانی پرسے ہوتا ہے اور جاپانی امپورٹڈ مال ہیں اس لئے نرخ مہنگے ہی ہوں گے۔ دائیں بائیں سستا کام ہے مگر سستے کا۔ مطلب یہ ہے کہ کرسی پر بیٹھتے ہی فرمائش پوچھی جائے گی جو اسی روپے سے کم کی نہیں ہو سکتی چاہے آپ کوکا کولا کی بوتل منگائیے۔ چاہے وسکی یا برانڈی یا کچھ اور۔ یہ کور چارج کہلاتا ہے کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو یار لوگ پانچ روپے میں پچاس ننگے ناچ دیکھیں۔ گویا پھوکٹ کے مزے اڑائیں۔ سامنے مسلسل ناچ ہوتا رہتا ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ ناچنے والیاں ایک ایک کر کے یا گروپوں میں آتی ہیں ہال کی روشنی ہمیشہ مدہم سرخ ہوتی ہے۔ اور اسٹیج پر نیم تاریکی یا کبھی کبھی تیز رنگین روشنی پھینکی جاتی ہے۔ رقاصہ دو چار چکر لینے اور بھاؤ بتانے کے بعد آہستہ آہستہ کپڑے اتارنے لگتی ہے۔ پہلے دوپٹہ پھینکا پھر گلے چکر میں گھاگھرا اتار دیا۔ پھر آہستہ آہستہ موسیقی کی کربناک چیخوں کے ساتھ ریشمیں جرابیں اتاریں جن میں سے بدن پہلے ہی جھلکتا ہے۔ پھر انگیا اتاری۔ اور پھر ایک دم ایک تیز تال پر زیر جامہ کھینچ لیا۔ مگر ابھی قانون کی نظر میں وہ برہنہ نہیں ہے کیونکہ چند انچ کا کپڑا لگا رہ جاتا ہے ——
عورتیں عام طور پر بین الاقوامی یعنی ہر قوم کی ہوتی ہیں۔ چینی جاپانی، اسپینی، عرب، شکر ہے کہ ابھی ہندوستان پاکستان اس میدان میں داخل نہیں ہوئے۔

یہ مغربی آرٹ ہے۔ آرٹ یعنی فن۔ حالانکہ فن کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

مگر جب فن معجزہ ہی نہ رہے تو اسے خون جگر کون دے اور کیوں دے۔

اس ننگے ناچ کے دوران وہ خواتین قابل دید ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں یا عاشقوں یا صرف دوستوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی اتنی قربت کے عوض سیکڑوں اعضائے نسوانی کی برہنہ نمائش دیکھتی ہیں اور بے اختیار سسکاریاں بھرتی ہیں۔ سیکڑوں کا لفظ میں نے یوں استعمال کیا کہ بعض اوقات دس دس بیس بیس لڑکیاں بیک وقت ننگی ناچتی ہیں۔ سنا ہے ایسا ہی تماشا بابل و نینوا اور پومپی آئی میں ہوتا تھا۔

اے آنکھ والو دیکھو اور عبرت پکڑو۔

مگر آنکھ والے ہمیشہ صرف دیکھتے ہیں اور عبرت نہیں پکڑتے یہاں تک کہ تاریخی عوامل جن کا نام عذاب

خداوندی بھی ہے، بیماریوں، وباؤں، جنگوں اور انقلابوں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں اور لذت انگیز سسکیاں کربناک چیخوں اور دعاؤں میں بدل جاتی ہیں۔

"پیچر کارد موسیو نفتی کا روز فار ہنڈرڈ فرانکس" (پچاس تصویری کارڈ سو فرانک میں لوگے) پگال میں کچھ اٹھائی گیرے قسم کے لوگ گھوم گھوم کر سیاحوں سے کھسر پھسر کرتے ہیں۔ پھر وہ گویا چپکے سے ایک نمونے کا کارڈ دکھلاتے ہیں جس پر عورت یا مرد یا دونوں کو ننگی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ نقشہائے رنگ رنگ فرنچ کوک شاستر ہے۔ آپ ہوشیاری برتیں تو یہ کر سکتے ہیں کہ ایک ایک کر کے سب تصویریں نمونے کے طور پر دیکھ لیں اور پھر ناپسندیدگی کے انداز سے گردن ہلا دیں۔ وہ آپ کو فرنچ میں گالیاں دے گا جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ بات بہت بڑھ جائے تو پانچ فرانک انعام دے کر پیچھا چھڑائیے اور بہت بڑھ جائے ـــ یا جی چاہے تو خرید لیجئے۔

پگال میں آگے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں پچاس گز کے اندر اندر ہر طرح کا تجربہ آپ ہی آپ ہو جاتا ہے۔ بس انداز سے آپ سیاح لگ رہے ہوں کوئی گھاگ تماشبین نہ لگیں۔ یہ دیکھئے ایک مرد معقول ہیٹ کا چھجا نیچے کی طرف جھکائے آگے بڑھے مسکرائے آپ بھی مسکرا دیجیے۔

" ایکزی بی شوں " (اگزی بی شن یعنی نمائش) وہ کہیں گے۔

" ہاؤ مچ " (کیا لوگے)

" ففتی " (پچاس)

" ٹو مچ " (بہت زیادہ ہے)

" آل رائٹ ـ فورٹی ـ وندرفل ایگزی بی شوں موسیو ـ وندرفل " (اچھا چالیس سہی۔ نمائش حیرت انگیز ہوگی جناب حیرت انگیز) اور یہ نمائش فلم کی نہیں ہے۔

یہ نمائش بھی اصولاً غیر قانونی ہے مگر ہوتی رہتی ہے تمام پگال تمام پیرس میں ہوتی رہتی ہے۔ ایک تہ خانہ نما زمین دوز ہال ہے جہاں شراب اور فواکہات کا دور چل رہا ہے (اس کا چارج الگ ہوگا) ہال تقریباً تاریک ہوتا ہے آمنے سامنے کے چہرے نظر نہیں آتے۔ بیٹھنے کے خاصی دیر بعد بصارت کام کرنا شروع کرتی ہے۔ اور قوت شامہ یعنی سونگھنے کی قوت اور دیکھنے کی قوت مل ملا کر اتنا احساس کرا دیتی ہے کہ سامنے کے یا آس پاس کے بیولے مرد ہیں یا عورت۔ داہنی قوت شامہ تو آنکھوں سے بھی بڑھ گئی عورت کو سونگھ کر محسوس کر لیتی ہے۔

شروع میں اسٹیج پر بھی اندھیرا رہتا ہے پھر ایک ہلکی سی دودھیا روشنی پھیلتی ہے جو فوراً سرخ ہو جاتی ہے

اب ایک مرد اور ایک عورت آتے ہیں اور پہلے ننگے عاشقوں کا اور پھر رفتہ رفتہ میاں بیوی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کے جذبات کوک شاستر کے اصولوں کے مطابق بھڑکتے رہیں یہ سب کچھ سیکڑوں مردوں اور عورتوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور اس میں بڑے چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔

یہ ڈرامہ ایک جوڑے تک محدود نہیں رہتا بلکہ طرح طرح کے امتزاج پیدا کیے جاتے ہیں۔ گوری عورت اور کالا مرد یعنی افریقی۔ گورا مرد اور کالی عورت اورگو مرد گوری عورت۔

جی ہاں جناب یہ پیرس کی رات ہے پیرس یعنی فرانس کا دارالسلطنت جو تہذیب کا گہوارہ کہلاتا ہے اور جہاں نوتر دیم کا گرجا اسی رات میں مقدس ولیوں کے چہروں جیسا روشن کھڑا ہے۔ یوں فرانسیسی جنس اور جنسیات کے بارے میں بڑی سرد مہری سے بات کرتے ہیں ان کے لیے یہ سب معمولی کاروبار حیات ہے۔ ہاں اس میں جدتیں اس کی الجھنیں اس سے پیدا شدہ بیماریاں اور ان کے علاج یہ سب اسے "غیر معمولیت" کے درجے تک پہنچاتے ہیں۔

وقفے کے دوران میں روشنیاں تیز ہوئیں تو میں نے خواتین کو غور سے دیکھا ان کی آنکھیں صاف تھیں، ماتھے پر پسینے کے آثار تک نہ تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے دنیا بھر کے مسائل پر بات چیت کر رہی تھیں لیکن ایک ہم،

اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

دو پاکستانی جوڑے بھی براجمان تھے۔ ایک کو میں جانتا تھا۔ ایک شاید مجھے جانتا تھا ان خواتین کی آنکھیں بند تھیں اور پورے چہرے پر پسینے یا عرق انفعال کے سوتے پھوٹ رہے تھے، ایک دو لمحے بعد انھوں نے اپنے پورے چہرے رومالوں سے چھپا لیے یہاں تک کہ وقفہ ختم ہو گیا۔ ......

یہ مشتے از خروارے ہے یعنی پورے ڈھیر میں سے ایک مٹھی برابر اناج ہے، ڈھیر کو کریدو تو اور بھی تماشے نمودار ہوں گے ایسے کہ اس بیان کے الفاظ میں ان کا تصور تک نہیں ہو سکتا ان مقامات پر پستی اور زوال جیسے الفاظ بغلیں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ شرمناک، خوفناک، گندگی، تعفن یہ لفظ بھی مطلب ادا نہیں کر سکتے بہر حال۔

سب بیانات کیا ضروری ہیں

"یہاں آئیڈیل شام یوں گزرتی ہے" ایک صاحب بولے "آدمی پانچ فرانک میں نشے کا سستا سا ٹیکا لگوائے دس فرانک کی تیز شراب پیٹ میں ڈالے۔ دو چار چرس کے سگریٹ جیب میں رکھے اور پگال سے ایک سرخی پاؤڈر لگائے ہوئے لونڈیا لے کر ایک سستے قحبہ خانے میں پہنچ جائے جو سستا اس لیے ہوتا ہے کہ وہاں بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں لیکن اچھا یوں ثابت ہوتا ہے کہ یا انتخاب کی بڑی گنجائش ہوتی ہے قحبہ خانے کے باہر ہی بلکہ کبھی کبھار تو وہیں ڈاکٹر لوگ موجود ہوتے ہیں جو چار پانچ فرانک میں پنسلین کا انجکشن لگا دیتے ہیں۔ بھائی جان اپنی جان کی حفاظت

بڑی ضروری ہے۔"

اس وقت دنیا کی آدھی آبادی فاقے میں جاگ رہی ہے یا نیم خوابیدہ ہے، لاکھوں بچے دودھ کو ترس رہے ہیں، لاکھوں بیمار دوائیں نہ ہونے کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔ بے روزگاری کے شکار چوریاں کر رہے ہیں ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ اندھے لولے لنگڑے جذامی کوڑھی آہستہ آہستہ اور تیزی کے ساتھ قبل از وقت موت کی طرف کھنچے جا رہے ہیں اور پیرس جاگ رہا ہے اور بنگال ناچ رہا ہے اور لندن نیویارک، ٹوکیو، ہمبرگ اور نہ جانے کہاں کہاں سیکڑوں بنگال ناچ رہے ہیں ننگے ناچ۔ ننگے۔ تیز۔ مسلسل ناچ جو ختم ہونے میں نہیں آتے۔

لیکن ایک دن یہ ختم ہو کر رہیں گے۔ بہت جلد۔ بہت جلد۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یونیسکو کی سسکیاں

شاید آج کی نشست خشک اور بور ذم سے بھرپور ثابت ہو کیونکہ اب صبح ہوگئی ہے اور میں پیرس کی روشن سڑکوں اور تاریک گلیوں اور سستے اور مہنگے نائٹ کلبوں میں گھومتے گھومتے تھک گیا ہوں اور اب بقول کسے کام پر جانا ہے۔

رات پانچ بجے ہم نے (کوئی اور بھی ساتھ ہو گیا تھا) ایک قدیم بازار میں جا کر پیاز کا گرم گرم شوربا پیا۔ یہ شوربا خاصے کی چیز ہے۔ پیرس والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ "شوربائے سحری" دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا بلکہ ایسی کوئی چیز دنیا میں نہیں ملتی۔ مگر دلی کے سحر خیز جانتے ہیں کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے — بلکہ جاڑوں میں دنیا کا سب سے بہتر تحفۂ سحر نہاری ہے۔ نہاری جس کی بنا پر تہذیب دہلی کو نہاری کلچر بھی کہا جاتا ہے — نہاری کلچر یعنی گاڑھی، لذیذ، طاقتور اور مرچیلی تہذیب۔

بہرحال صبح ہوگئی اور جب صبح ہوئی تو بڑی حیرت ہوئی کہ پیرس کی رات کیسے ختم ہوگئی۔ پیرس کی رات کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ وہ مسلسل چکر کھاتے ہوئے قدم، وہ مٹکتی ہوئی تھرکتی ہوئی آنکھیں، وہ روشن ہوتے ہوئے چہرے، وہ مدہم ہو ہو کر جاگتی ہوئی روشنیاں، وہ سخت کوش "محنتی" رنڈیاں، وہ انتھک دلال، وہ تماشے، وہ تماشائی کیا ہوئے۔

وہ سب تھک گئے اور سو گئے اور رات کا پیرس سو گیا اور دن کا پیرس جاگ اٹھا۔

آج میرے لیے دن کا پیرس یونیسکو ہے۔ یونیسکو یعنی یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن جس کا مستند ترجمہ بڑا لمبا ہوگا اور کچھ یوں ہوگا۔ اقوام متحدہ کا تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارہ جس کا اردو مخفف یعنی جیسے یونیسکو مخفف ہے، ایسے ہی ایک اردو نام کی تالیف میں ماہرین اصطلاحات پر چھوڑتا ہوں۔

میرے ہوٹل والی یوں سے سیدھا راستہ پلاس نوتی نرائے کو جاتا ہے۔ جہاں ایک وسیع و عریض چوک

میں یونیسکو کا صدر دفتر واقع ہے۔ داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پر ایک سخت لپ اسٹک شدہ خاتون تقریباً راستہ روک لیتی ہیں اور مسکراتی ہیں اور افسران متعلقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں: یہ لفٹ جدید ترین ہے۔ دروازے کے ایک کواڑ کے بیچ میں سے ایک روشنی مسلسل دوسری طرف پڑتی رہتی ہے۔ جیسے سرچ لائٹ ہو۔ دروازہ مقررہ وقفے سے کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ اگر آپ اس طرح بھاگے کہ دروازہ آدھا بند اور آدھا کھلا ہوا ہو یعنی آدھا بند ہو چکا ہو تو لال روشنی آپ کی ٹانگ یا کوٹ پر رک جائے گی ـــ اور یکایک دروازہ پوری طرح کھل جائے گا۔ یہ لفٹ دوسرے لفٹوں کی طرح غیر مہذب نہیں کہ اگر کوئی دیر میں پہنچا تو دونوں طرف کے کواڑ اسے بدتمیزی سے جکڑ لیں، دبائیں، دم گھونٹ دیں، ہاتھ پاؤں توڑ دیں یعنی بالکل بڑا کر دیں۔ یہ لفٹ یونیسکو کا لفٹ ہے۔ مہذب شائستہ، تمیزدار، اگر کوئی مجھ جیسا نوآموز بند ہوتے ہوئے دروازوں کے درمیان بے خطر کود پڑنے کی ہمت کر جائے تو ایک طرف سے ضلع کرن شوخ مثال نگہ جور دوسرے پٹ کو آنکھ مار دیتی ہے۔ آخر یہ ایک ثقافتی ادارہ ہے۔

اب یونیسکو کا کچھ بیان ہو جائے۔

ہوا یوں کہ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ مگر آجکل اس مادی دنیا میں ایک بادشاہت کی بجائے سیکڑوں بادشاہتیں اور آمریتیں اور جمہوریتیں قائم ہو گئی ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ اس صورتحال کے نتائج صرف اس صدی میں یہ ہوئے کہ پہلی جنگ عظیم میں پچاسی لاکھ آدمی مارے گئے اور دوسری جنگ عظیم میں دو کروڑ چھبیس لاکھ آدمی مارے گئے اور تیسری جنگ عظیم ہوئی تو شاید پوری دنیا کی آبادی ہی تلپٹ ہو جائے گی اس لیے دوسری جنگ عظیم کے بعد چند بڑے بقراطوں نے اقوام متحدہ کا ادارہ بنانے کا فیصلہ کیا ـــ اور سان فرانسسکو میں ایک جلسہ بلایا جس میں غیر منقسم ہندوستان سے بھی دو چھوٹے بقراط منگائے گئے تھے اور جن کے بارے میں جوش ملیح آبادی نے ایک لمبی نظم کہی تھی جس کے دو شعر یاد آ گئے ہیں:

یہ بات اگر سچ ہے کہ اس دور فلک میں
گھوڑوں کا نمائندہ ہوا کرتا ہے خچر
تو تھوک کے سینے کو میں یہ بات کہوں گا
بھارت کے نمائندے ہیں سرنون و مدلیر

خیر یہ تو قطعہ معترضہ تھا، بات یہ تھی کہ ادارہ اقوام متحدہ بن گیا تو اس کے مختلف ذیلی ادارے بھی بنائے گئے جن میں اس حیدرآبادی کے حصے میں یونیسکو آیا (اقوام متحدہ تو ہر سال وزیروں اور دیگر وی آئی پی حضرات مع

خواتین' کے حلقے میں آتی ہے ۔بندے خاں یونیسکو ہی سے خوش ہیں) اس ادارے کی دفعہ نمبر اول ملاحظہ ہو۔

"اس ادارے کا مقصد یہ ہے کہ عالمی امن و تحفظ کے لیے مختلف اقوام میں تعلیمی سائنسی اور ثقافتی تعاون باہمی کے ذریعے انصاف' قانون کی حکومت انسانی حقوق کی حفاظت اور بنیادی آزادیوں کو فروغ دے جو اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق کسی نسلی جنسی' لسانی اور مذہبی تفوق کے بغیر تمام انسانی آبادی کا حق ہیں۔"

ان مقاصد کے تحت یہ ادارہ انیس سو چھیالیس میں قائم ہوا اور اب اس کی رکنیت بیس سے بڑھ کر ایک سو پانچ ملکوں تک پہنچ گئی ہے ۔اس کے علاوہ دنیا بھر کے کوئی چار سو غیر سرکاری ادارے اس کے معاون ہیں اور ان اداروں میں ادارۂ مصنفین پاکستان یعنی اپنا گلڈ بھی شامل ہے ۔یہ ادارہ یہ حکومتیں یہ غیر سرکاری جماعتیں مل جل کر دنیا سے جہالت دور کرنے اور تعلیم پھیلانے کی بساط بھر کوشش کر رہے ہیں — ان حکومتوں میں سرمایہ دار امریکہ اور کمیونسٹ روس بھی خلوص دل سے شامل ہیں اس لیے جو جھگڑے اقوام متحدہ یعنی بڑے دربار میں ہوتے ہیں وہ یہاں دیکھنے میں نہیں آتے ۔اس کا بجٹ کوئی دو سو کروڑ روپے سالانہ ہے اور ہر دو برس بعد ضروریات کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

یونیسکو کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور سنسنی خیزی رومان پسندی کا عادی پڑھنے والا اس کا تفصیلی ذکر برداشت نہیں کر سکتا لیکن یہ دن کا پیرس ہے رات کا نہیں۔ یہ یونیسکو ہے نائٹ کلب یا عریانیت کی تماشا گاہ نہیں ہے۔ آئی-ایم-سوری مائی ڈیر قاری' میرے شوقین پڑھنے والے آج مجھے معاف رکھنا میں یونیسکو سے نمک حلالی کے جوش میں یا اس کے مقاصد سے متاثر ہو کر علم' سائنس' فنون وغیرہ قسم کی بکواس پر مجبور ہوں۔ آئی ایم ویری ویری سوری۔ اگر تمھیں میرے ساتھ گھومنے کا شوق ہے تو یونیسکو میں بھی گھومنا پڑے گا حالانکہ میں جلد ہی تمھیں فرانس کی سب سے زیادہ اہم شخصیت یعنی جنرل ڈیگال کا نقشہ بھی دکھاؤں گا مگر ابھی چند لمحے یونیسکو کی سیر کر و کیونکہ یہ دنیا میں واحد ادارہ ہے جو تمھاری اور تمھاری آئندہ نسلوں کی بہتری کے لیے ان تھک سنجیدگی سے کام کر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں بھی سفید اقوام' بھوری' زرد اور سیاہ اقوام کے بارے میں بہت سے فیصلے اپنے غلط سلط اندازوں اور پالیسیوں کی بنا پر کرتی ہیں۔ بہر حال گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است' پہلے تو یہ بھس بھی نہیں ملتا تھا۔ یہ بھی الگ بات ہے کہ ادارے کا صدر دفتر پیرس میں کیوں قائم ہوا کسی افریشیائی صدر مقام پر کیوں قائم نہیں ہوا ایسی نہیں ہوا آپ کا چندہ ہی کیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انیس سو چھیالیس میں افریشیا والوں کی عالمی حیثیت ہی کیا تھی — اور اب بھی کیا ہے۔ اب بھی اقوام متحدہ کی کسی ایجنسی کسی ادارے کا صدر دفتر بے چارے ایشیا افریقہ یا لاطینی امریکہ یعنی جملہ غیر ترقی یافتہ دنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے۔ کیوں ہو نہ آپ کے پاس اتنی آسانیاں نہ آپ میں اتنا دم

ہاں بھائیو پھر وہی مصرع دہراؤ اور خوش ہو جاؤ۔ ابھی دس بیس برس اور آنکھیں بند کیئے دم سادھے رہو۔ ہاں کیا تھا وہ مصرع:

گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت است

کیا یہ میرا ایشیائی تعصب یا یوروپی الفاظ میں ایشیائی احساس کمتری ہے کہ یونیسکو کا صدر دفتر یورپ میں دیکھ کر جلی کٹی باتیں کرتا ہوں۔ شاید یہی صحیح ہو مگر بات یہ ہے کہ،

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے

بلکہ اس زمانے کی زبان میں مصرع یوں بیٹھے گا:

سواد مغرب الکبریٰ میں مشرق یاد آتا ہے

کیونکہ کبھی یہی مشرق تعلیم، سائنس اور ثقافت کا گہوارہ تھا جہاں سے آج مجھ جیسے ہزاروں "غیر مہذب" آستانۂ یورپ پر سر جھکانے جا رہے ہیں ـــ اور یہی یورپ کبھی ایشیائی یونیسکو کے صدر مقامات یعنی دمشق بغداد دلی کی طرف اپنے ثقافتی اور سائنسی نو آموز طالب علم بھیجتا تھا جن کی آنکھیں یہاں کے کتب خانے تجربہ گاہیں اور ثقافتی مراکز دیکھ کر حیران ہو جاتی تھیں۔

اے آنکھو والو دیکھو اور عبرت پکڑو

یونیسکو ہر جہتی کام کر رہی ہے۔ عام تعلیم تعلیم بالغان۔ تربیت معلّمین۔ تربیت محققین۔ سائنسی تربیت و تحقیق۔ کتابوں کی لکھائی چھپائی اور ترتیب و تہذیب۔ مختلف قسم کے ٹکنیکل شعبوں میں تربیت برائے تعلیم اور تعلیم برائے تربیت۔ غرضیکہ تعلیم اور سائنس کے معاملے میں جو کچھ جدید مغرب جانتا ہے اس کی تربیت کے پروگرام بیان طے ہوتے ہیں۔ ان میں مختلف ملکوں کو نقد امداد و فنی امداد و ٹکنیکل امداد سے لے کر براہ راست مختلف النوع منصوبے شامل ہیں جنوبی ایشیا میں پڑھنے والے مواد کے منصوبے پر عملدرآمد کرانے والا دفتر خاص کراچی میں قائم کیا گیا ہے۔ جہاں سے وہ ایران، پاکستان، ہندوستان، سیلون، برما اور سیام میں اپنی بساط بچھائے ہوئے ہے۔ ہزار با وظیفے ہزار ہا کورس ہزار ہا مختصر منصوبے صدر دفتر میں مرتب ہو کر پوری دنیا میں پھیلا دیئے جاتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ آج دنیا میں تقریباً ستر کروڑ آدمی بالکل ان پڑھ ہیں یعنی نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں۔ یہ بھی اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا بھر کے بچوں کی آدھی تعداد مدرسے نہیں جاتی۔ یونیسکو کوشش کرتی ہے کہ "جاہل" ملکوں کو ان کے مسائل حل کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دی جائے اور وہ دامے درمے قدمے سخنے بہت کچھ کرتی ہے مگر:

زر می طلبد سخن دریں است

سارا معاملہ زرکا ہے۔ زرِ خطیر کا یعنی بڑی بڑی رقموں کا اور بڑی بڑی رقمیں دنیا کے بڑے بلکہ چھوٹے ملک بھی اپنے دفاعی بجٹوں پر خرچ کرتے ہیں یہ نہیں کر سکتے یا یہ نہیں کرنا چاہتے کہ وہ بجٹ آدھے ہی کر دیں اور ان کی رقم عالمی تعلیم پر لگا دیں اس طرح جنگ کا خطرہ پہلے سے بھی کم ہو جائے گا۔ اور یونیسکو اپنا کام جلد تر ختم کر لے گی بس صرف یونیسکو میں بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا سو اس کا حل بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

لیکن پنچوں کی بات سر آنکھوں پر۔ پرنالہ وہیں گرے گا یعنی یونیسکو اپنی جگہ پر بلکہ اقوام متحدہ کا بول بالا لیکن دفاعی بجٹ یعنی جنگی بجٹ بڑھتا ہی رہے گا۔ بلکہ اب تو بڑی طاقتوں میں چاند تک پہنچنے کا بجٹ بھی الگ بنتا ہے اور اکیلا وہ بجٹ ہی اتنا ہوتا ہے کہ یونیسکو جیسے دس اداروں کے بجٹ اونٹ کے منہ میں زیرہ نظر آئیں۔

خیر یہ تو بڑے بول ہیں چھوٹے منہ کو اچھے نہیں لگتے۔ یہ زمانہ وہ نہیں جب لوگ دیکھتے تھے کہ کیا کہا گیا ہے اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس نے کہا اس لیے مناسب ہے کہ اپنی اصلیت پر آ جاؤ اور یونیسکو ہی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ کیونکہ یونیسکو یونیسکو ہے لیکن!

اب طبیعت ادھر نہیں آتی

یونیسکو تو برابر چلے گی۔ یونیسکو ہی کا تو سارا چکر ہے جس کا کھائیں گے اس کا ضرور گائیں گے۔ لیکن اس وقت پھر پیرس زور مار رہا ہے۔ الاؤنس وصول کر کے باہر نکلو پروگرام کل بنے گا۔ پرسوں لندن جانا ہے پھر گرمیوں میں پیرس آنا ہے مگر پتا نہیں کہ واپس آنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔

پیرس یوں تو فرانس کا دارالسلطنت ہے مگر آج کل اصل میں یہ دارلڈیگال ہے۔ ڈیگال یعنی فرانس۔ فرانس یعنی ڈیگال جو ایک شخصیت ہے ایک تحریک ہے۔ ایک ادارہ ہے ایک حیرت ناک واقعہ ہے۔

چارلس آندرے جوزف ماری ڈیگال انھوں نے اپنے ملک کو دو بار تباہی سے بچایا پہلی بار دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب فرانس پر جرمنوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور وہ جلاوطنی کی حالت میں تھے اور دوسری بار انیس سو اٹھاون میں جب فرانس داخلی انتشار سے پارہ پارہ ہونے والا تھا۔ قومی سطح پر یہ عزت یہ عظمت تاریخ نے بہت کم لوگوں کو عطا کی ہے "میں فرانس ہوں" ڈیگال کا قول ہے اور یہ سچ ہے کہ کم از کم آج فرانس کا دوسرا نام ڈیگال ہے۔ اُن کے برسرِاقتدار آنے سے پہلے فرانسیسی حکومت تقریباً ہفتے کے ہفتے بدلتی تھی یعنی اس معاملے میں فرانس اس وقت کے پاکستان سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ ملکی پیداوار کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ فرانک یعنی فرانسیسی سکہ اپنی ساکھ کھو بیٹھا تھا۔ الجزائر کی جنگ کسی نتیجے کے بغیر طول پکڑتی جاتی تھی — وغیرہ — اور اب حالات اسی تیزی کی رفتار کے ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔

میں جنرل ڈیگال سے نہیں ملا نہ انھوں نے مجھے بلوایا۔ شاید انھیں خبر نہیں ہوئی کہ پاکستان کا ایک دوہا نویس پیرس کی خاک چھانتا پھر رہا ہے لیکن مجھے خاک کے ہر ذرّے میں جنرل ڈیگال کی تصویر نظر آئی۔ کیفوں، ریستورانوں ورسگا ہوں، ٹیکسیوں، ٹراموں بسوں میں ہر آدمی جنرل ڈیگال کی بات کرتا ہے جو صرف تعریف نہیں ہوتی۔ اس خاکسار کے اپنے جذبات ان کے بارے میں کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ مجھ غریب کے لیے وہ بہرحال مغربی استعمار کی نشانی ہیں اور سال گزشتہ میں نے الجزائر کے سلسلے میں جو دوہا نویسی فرمائی تھی اس ذیل میں ان کے لیے یہ عرض کیا تھا:

سبے بس بے ہتھیار کلانے بھیجا ہے پیغام
جو نہ سیکھے الجیریا بانی اس پر شعر حرام
اس پیغام کو خون کی دھاریں بہہ بہہ کر چمکائیں
خون کی دھاریں جن کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں
خشک نہ ہونے پائیں یہ سوتے بنتے جائیں تال
گھر گھر خون کے تال کھڑا دیکھے ڈیگال!

مگر وہ ایک ایشیائی مسلمان کا نقطہ نظر تھا اور رہے گا۔ یہاں میں یہ دیکھتا ہوں کہ جنرل ڈیگال اپنے وطن کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نپولین کے بعد فرانس کی سب سے اہم شخصیت مانے جاتے ہیں، اس لیے کہ مدتوں بعد انھوں نے اس پیچیدہ نظام اس بکھرتے ہوئے شیرازے کو استحکام عطا کیا ہے۔ الجزائر کے معاملے میں بھی ڈیگال ہی کی سوجھ بوجھ نے فرانس کو مکمل اقتصادی تباہی سے بچالیا ہے اور الجزائری حریت پسندوں کا حق خود اختیاری تسلیم کیا جاچکا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈیگال انگریزوں سے بالکل نہیں ڈرتے حالانکہ اب بھی سارا یورپ انگریزوں کی سیاست سے گھبراتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑے میاں ستر کے پیٹے میں آچکے ہیں اور انگریز کبھی بوڑھا ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ شخصیات نہیں بلکہ اپنے نظام اپنی روایات کے بل پر جیتا ہے۔ یہاں آج جنرل ڈیگال ہیں اور سب ٹھیک ٹھاک ہے لیکن کل کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔

ان صاحب کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے یعنی اٹھارہ سو نوّے میں پیدا ہوئے سنہ انیس سو چالیس تک کوئی خاص بات ہی نہیں ہوئی کسی نے ان کا نام ہی نہیں جانا نہ انھوں نے کوئی معرکہ آرا کام کیا۔ پچاس برس تک کچھ نہ ہونا کتنی دلچسپ بات ہے۔ فلیٹ سپاٹ خالی خولی زندگی۔ اکبر الہ آبادی کے بقول ایسی زندگی کے چار درجے ہیں:

بی۔اے کیا۔ نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

اور صاحب موصوف پہلے دو درجوں سے گزر کر تیسرے درجے میں داخل ہونے والے تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور تاریخ نے انھیں ایک عظیم کردار کے لئے منتخب کرلیا پنشن لینے کے بجائے جلاوطن ہونے اور مرنے کے بجائے فرانس کی جنگ آزادی لڑی اور سنہ چالیس ؁ میں دوبارہ آزاد فرانسیسی حکومت بنائی پھر موصوف پنشن پر گئے یعنی ۱۹۴۶ء میں جب فرانس کی سیاسی پارٹیوں نے فرانس کو پاکستان بنادیا۔ تو ان کو حکومت سے چھٹی مل گئی۔ پھر جب ۱۹۵۸ء میں انتشار عظیم ہوا اور فرانس اپنی بوٹیاں خود چبانے لگا تو جنرل ڈیگال دوبارہ بلائے گئے اور اس بار وہ بڑے کروفر سے آئے۔ دستور تقریباً دوبارہ بنا اور صدر مملکت کو وسیع اختیارات دے دیئے گئے۔

اب فرانس یعنی ڈیگال یعنی پھر فرانس اقوام عالم سے آنکھ اٹھا کر بات کرتا ہے۔ امریکی مبصر جو ان کی بہت سی پالیسیوں سے تلخی کی حد تک اختلاف رکھتے ہیں انھیں ابراہام لنکن اور چرچل کے برابر بلکہ اُن سے زیادہ اہم شخصیت مانتے ہیں۔ خود فرانسیسی تو اپنی نخوت بدمزاجی اور اعتراض پسندی کے باوجود ڈیگال کو آبا ڈیگال کہکر پکارتے ہیں۔ کیوں بھئی پاکستانیو! کیا یہ سب لوگ بے وقوف ہیں کہ ایک آدمی کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ اماں یار اس کے اختیارات تو دیکھو جو چاہے کرسکتا ہے۔ ہائے وہ پارلیمانی فرانس۔ جہاں ہر ہفتے حکومت بدل جاتی تھی۔ اب ایک شخص کے بوجھ سے دبا ہوا کراہ رہا ہے اور سیاستدان سوائے بیان بازی کے اور کچھ نہیں کرپاتے کیونکہ وہ جیتا رہا تو اپنے پانچ برس پورے کرکے رہے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ یار لوگ پارٹی بازی، دھاندلی، فراڈ اور تلابازیوں کے ذریعے وزیر نہیں بن سکیں گے، پرمٹ نہیں لے سکیں گے۔ لائسنس نہیں اڑا سکیں گے۔ آخر یہ کیا زندگی ہے۔ یہ کیا جمہوریت ہے۔ حکومت ہر ہفتے نہ بدلے ہر مہینے ہر سال تو بدلے۔

لطیفہ ۱:۔ جنرل صاحب الکشن لڑ کر کامیاب ہو چکے ہیں۔ انھیں ایک عظیم اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ اور ان کے اپنے گاؤں میں یہ ہوا کہ آبادی پانچسو آدمیوں کی تھی اور سب نے ان کے حق میں ووٹ دیئے لیکن ایک ووٹ ان کے خلاف بھی پڑا۔ وہ ووٹ ان کی کھانا پکانے والی خادمہ کا تھا جس کا خیال یہ تھا کہ پیرس جاکر حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے بڑے میاں کی صحت خراب ہوجائے گی۔

لطیفہ ۲:۔ ایک وزیر سے پوچھا گیا اس معاملے میں فرانس کی کیا پالیسی ہے۔ اس نے کہا آدھے گھنٹے قبل جب میں جنرل صاحب کے پاس تھا تو پالیسی یہ تھی مگر اب کیا ہے یہ مجھے معلوم نہیں۔

لطیفہ ۳: چونکہ جنرل صاحب کیتھولک ہیں اور کیتھولک عقیدے میں طلاق جائز نہیں اس لیے انھوں نے صدر ہوتے ہی اپنے عملے میں سے طلاقیوں اور طلاقنوں کو چلتا کردیا۔

لطیفہ ۴: یہ سب لطیفے سنے سنائے پڑھے پڑھائے اور چھپے چھپائے ہیں۔

اسے لیجیے ایک دم پیرس ختم ہوگیا فرانس ختم ہوگیا، یا شاید ابھی جاری ہوا ہے لیکن فی الوقت قلم نے پیرس فرانس ڈیگال سب کے بارے میں لکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ قلم پیشہ ور ضرور ہے پھر بھی قلم ہے، ادیب کا قلم جو کبھی کبھی اپنی مرضی سے بھی زندہ رہنا چاہتا ہے اور اس وقت اس کی مرضی یہ ہے کہ خاموش ہو جائے اور آرام کرے۔

برطانیہ

دو سو برس کی تاخیر

لندن ۲۰ فروری

محترمہ و مخدومہ والدہ صاحبہ ۔ آداب عرض

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اللہ آپ کا سایہ میرے سر پر سلامت رکھے میں بہت آرام سے ہوں۔ لندن شاندار شہر ہے یہاں کوئی خاص سردی نہیں۔ لوگ خوش اخلاق ہیں۔ مجھے بالکل کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کھانا اچھا ملتا ہے۔ اوورکوٹ مفلر اور گرم جرابیں بہت آرام دیتی ہیں۔ باہر جاتا ہوں تو آپ کے حکم کے مطابق گرم ٹوپی بھی پہنتا ہوں۔ مجھے الاؤنس بھی کافی مل رہا ہے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے ایک بڑا آرام دہ کمرہ کرائے پر لے لیا ہے جو ہر وقت گرم رہتا ہے۔ خوب پڑھ رہا ہوں اور کبھی کبھی سیر و تفریح بھی کرتا ہوں۔ آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں بس میرے لیے دعا کیے جائیے۔

لندن ۲۰ فروری

پیارے ابن انشا۔

یار یہ لندن بالکل بوگس ہے۔ دور کے ڈھول سہانے۔ یہ شہر ایک ملک ہے' ایک دنیا ہے' ایک کائنات ہے جہاں سب ہر وقت جنگ وجود یا جنگ بقا میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ سردی سخت ہے۔ برف تو ایسی نہیں جیسی ماسکو میں تھی لیکن ایک گہری کہر ہر وقت چھائی رہتی ہے جس میں دھواں مل کر آنکھوں کو جلاتا رہتا ہے۔ کس تمی پرسدکہ بھیا کون ہو میں سخت تکلیف میں ہوں بڑے ہوٹل بہت مہنگے اور چھوٹے بھی مہنگے ہیں۔ تین چار دن تو ڈھائی پونڈ روزانہ میں قیام کیا یعنی ڈھائی پونڈ روز میں صرف بستر نصیب ہوتی ہے ورنہ کھانا پینا الگ پھر تین دن کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک کمرہ کرائے پر ملا۔ سات گنی یعنی ساڑھے سات پونڈ ہفتہ کرایہ ہے۔ ناشتہ ساتھ ملتا ہے۔ باتھ روم وغیرہ مشترک ہے اجتماعی زندگی گزارنے کی تربیت ہو رہی ہے (اور اچھی ہو رہی ہے) اور

سنو لندن کا تین چوتھائی حصہ سینٹرل ہیٹنگ یعنی مرکزی انتظام حرارت سے محروم ہے سالے اب تک گیس سے کام چلاتے ہیں ۔ میرا کمرہ ہر وقت ٹھنڈا رہتا ہے ۔ گیس کا میٹر لگا ہوا ہے ۔ ایک شلنگ ڈالو تو گھنٹہ بھر گیس جلتی رہے گی ۔ کچھ گرم ہو جائے تو بستر میں دبک کر سو جاؤ یا اوورکوٹ پہنے بیٹھے رہو ۔ شہر کے تجارتی حصے تو خیر شاندار ہیں لیکن بیشتر رہائشی حصے کانے کھدرے بدنما ہیں ۔ قطار اندر قطار ایک ہی قسم کی عمارتیں چلی گئی ہیں ۔ لاحول ولا قوۃ اتنا لوٹ کھسوٹ کر انگریز بادشاہ نے اگر یہ کچھ بنایا تو خاک بنایا ۔ ارے میاں اس سے ہزار گنا بہتر تو پیرس تھا ۔ آخر ہے نا یہ بنیوں کی قوم ۔

اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

کھانا نہایت خراب ۔ اچھا بھی ہے سو وہ بہت مہنگا ہے ۔ عام طور پر ہم جیسے غربا و فقرا فکر کا کھانا کھاتے ہیں ، ہر سڑک ہر گلی پر کونوں میں لائنز کارنر وغیرہ کے ناموں سے طعام خانے ہیں ۔ ایک طرف دو رویہ کھانے چنے ہوئے ہیں پلیٹ ہاتھ میں لو اور اپنی مرضی کا کھانا چن لو ۔ مرضی کا قصہ بھی یہ ہے کہ کوئی خاص نعمت نہیں چن سکتے بلکہ آلو ، مچھلی ، مرغی ، سور اور بڑے گوشت میں سے اپنا انتخاب لاجواب فرمایئے اور سامنے کی میز پر تشریف لے جایئے سستا کام چار شلنگ میں ہوتا ہے ۔ چھ پینس میں چائے کی پیالی ۔ ماہرین لندن اس سے بھی سستے نسخے جانتے ہیں اور انھیں استعمال کرتے ہیں لیکن قصہ مہارت اور تجربے کا ہے ۔ الاؤنس فقیر کا چونکہ شدید طور پر کم ہے ۔ اس لیے ان ماہرین کرام سے ربط و ضبط بڑھا بھی نہیں سکتا ۔ کیونکہ اپنا علم تقسیم کرنے سے پہلے یہ آپ کی دولت میں حصے داری کے متمنی ہوتے ہیں ۔ مثلاً خود ار دجان کران مقامات پر کھانا پینا تھیٹر پہلے سیر و تفریح پر ترغیب دیتے ہیں جہاں یہ عام حالات میں خود نہ جاتے ہوں ۔ غریب پریشان پردیسی وطن کی یاد میں انھیں ساتھ لیے پھرتا ہے ۔ اور شام کو جب فارن ایکسچینج شمار کرتا ہے تو عبرت کے سبق دہراتا ہے ۔ خاتون رخ نہیں دیتی ۔ انگریز کی ذات یوں بھی بد دماغ بد مزاج ہے ۔

اب تھوڑے لکھے کو بہت جانو ۔ کمرے میں غضب کی سردی ہے ۔ ہاتھ نہیں چلتے ۔ یہ خط چھ پینس کا نہ سمجھنا جیسا کہ اس کے ٹکٹ سے ظاہر ہے بلکہ دو شلنگ چھ پینس کا سمجھنا ۔ دو گھنٹے بستر میں دبک کر دو شلنگ سے دو گھنٹے گیس جلائی تب کمرہ گرم ہوا ۔ ہاتھ کھلے دماغ کے سوتے کھلے اور میز تک پہنچا اب گیس ختم ہو چکی ہے ۔ انگلیاں ٹیڑھی ہوئی جاتی ہیں یونیسکو کو دعا دیتا ہوں کہ الاؤنس کل نوے پونڈ مہینہ مقرر کیا خرچ کی عادت پاکستانی ہے سکہ انگلستانی ہے ۔ ایک آنہ خرچ ہوتا ہے تو اسٹیٹ بینک یاد آجاتا ہے ۔ اب سوچا ہے کہ سفارت خانے کے بقراطوں سے بجٹ بنواؤں گا تب فیصلہ کروں گا کہ لندن میں رہوں یا امریکہ بھاگ جاؤں کیوں کہ

سنا ہے کہ امریکہ میں ڈالر اور خواتین کی فراوانی ہے۔ بہرحال تم میرا اصلی حال کسی پر آشکار نہ کرنا۔ ہر طرف میری آسودگی، خوشحالی، خوش اوقاتی اور علمی کارناموں کے تذکرے کرنا تاکہ یاروں میں لندن کی اور لندن کی وجہ سے میری توقیر کم نہ ہو جائے۔" فقط تمہارا.....

لندن پہنچنے میں مجھے دو سو برس کی تاخیر ہو گئی۔

یہ سنہ انیس سو اکسٹھ کی فروری ہے اور جنگ پلاسی کو دو سو برس سے اوپر ہوئے۔ بچو تمھیں معلوم ہے نا کہ دو سو برس پہلے بنگال میں پلاسی کے مقام پر ایک لڑائی ہوئی تھی جس میں ایک طرف تھا نواب سراج الدولہ یعنی ایک مقامی اور دوسری طرف تھا لارڈ کلائیو یعنی انگریز یعنی غیر مقامی اور ہزاروں مقامی پیادے اور سوار مگر بہرحال یہ لڑائی بنگال میں ہو رہی تھی اور اگر سارے مقامی مل کر غیر مقامیوں پر ایک ایک مٹھی مٹی بھی مار دیتے تو وہ دب کر رہ جاتے اور اس برصغیر میں برطانوی استعمار کا پہلے ہی دن دم گھٹ جاتا۔

لیکن ہوا یہ کہ الٹا مقامی حکمران یعنی سراج الدولہ مارا گیا۔ اور لارڈ کلائیو نے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اس لیے نہیں کہ وہاں میر جعفر نام ایک شخص موجود تھا بلکہ....

اور بچو — اور بزرگو — پھر سو برس بعد ملکیوں اور غیر ملکیوں کی ایک لڑائی دلی میں ہوئی جس میں ایک طرف مقامی بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر تھا اور دوسری طرف غیر مقامی جنرل نکلسن اور اس وقت بھی انگریز بہت کم تھے اور ہندوستانی بہت زیادہ تھے۔ مگر بہادر شاہ ہار گیا اور جنرل نکلسن جیت گیا اور انگلستان کی ملکہ ہندوستان کی ملکہ بن گئی۔

اور پھر سنہ انیس سو سینتالیس میں ایک واقعہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک آزاد ملک پاکستان تو بن گیا مگر وہ دولت مشترکہ ہی میں شامل رہا۔ دولت مشترکہ جس کا صدر مقام لندن ہے جہاں ایک سفید رنگ کی ملکہ راج کرتی ہے۔

ان دو سو برس میں انگریز کی حکمت عملی نے میرے گرد ہزار احصار باندھ دیے ہیں جن سے فرار آج بھی ممکن نہیں۔ میری صاف روشن ایشیائی آنکھوں میں اتنی سوئیاں چبھو دی گئی ہیں کہ ان کا کوئی گوشہ انگریز اور انگلستان کا کھلا نظارہ نہیں کر سکتا۔

یہ کیوں ہوا کیسے ہوا کیسے ہو رہا ہے اس کا جواب بچے اپنے بزرگوں سے اور بزرگ اپنے بچوں سے خفیہ طور پر معلوم کریں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ کیونکہ ابھی لارڈ کلائیو اور جنرل نکلسن کے بھوت ہماری آزاد

مملکتوں کے بہت سے اہم مقامات پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ اور مجھے بھیا بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے مگر بچو تم ان بھوتوں سے مت ڈرنا جب تم ہماری عمروں کو پہنچو گے تو یہ بھوت بھاگ چکے ہوں گے مر چکے ہوں گے ختم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بھوت زیادہ سے زیادہ ہماری نسل کا مقدر ہیں۔ انھیں بہت دن ہو گئے یہ بھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اور گوان کے سائے مجھ جیسے دو چار کو دہشت زدہ کرتے رہیں مگر آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے جاتے ہیں۔

تو یہ انگلستان ہے' برطانیہ' جس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب یہاں سفید فام خالص انگریز لڑکیاں سیاہ فام حبشیوں یعنی ویسٹ انڈیز کے غلام باشندوں کی دلالی میں کھلا پیشہ کراتی ہیں بات یہ ہے کہ سن انیس سو ساٹھ تک تو ہائیڈ پارک اور پکاڈلی میں رنڈیاں خود ہی گھوم پھر کر اپنے دانے تلاش کراتی تھیں مگر پھر قانون ان کے پیچھے لگ گیا۔ سو کھلے بندوں گھومنا پھرنا بند ہو گیا اور دلالوں کا کاروبار چمک اٹھا۔ جو آزاد رنڈیاں ہیں انھوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ معلمی کا قصہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر جو دکانیں ہوتی ہیں ان کے کواڑ شعبۂ اشتہارات کا کام دیتے ہیں دکاندار ایک مقررہ فیس لے کر ہر قسم کا جائز اشتہار لگانے کی اجازت دے دیتا ہے ایک مدرسے کا اشتہار ملاحظہ ہو:

خوش مزاج معلمہ انگریزی پڑھاتی ہیں

انگریزی کے طالب علم درکار ہیں جو بچے نہ ہوں معلمہ ایک خوب صورت گداز جسم خاتون ہیں کمر کا سائز الف، کولھوں کا سائز ب، سینے کا سائز ج، فون نمبر چار سو بیس، وقت تعلیم بارہ بجے رات تک۔

اس پر برطانوی قانون کوئی گرفت نہیں کر سکتا کیونکہ اگر ایک استاد اور شاگرد پڑھتے پڑھاتے مکمل یکسوئی اور حضور قلب کے لیے کمرہ بند کر لیں تو کسی کا کیا بگڑتا ہے۔

اور یہ برطانوی تاج ہے۔ تاج برطانیہ جس کی وفاداری کی قسم کھاتے کھاتے خود میری پانچ پشتیں گزر گئیں۔ گز سوا گز مخمل پر چار پانچ لاکھ روپے کے ہیروں اور موتیوں کا کام مگر اس تاج کے آگے کتنے کج کلاہ گردن جھکاتے جھکاتے گزر گئے اور نواب اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ و ملکہ بھی جن کی اپنی ریاست میں ہزارہا کج کلاہ زمین کا سینہ چیرتے ہوئے چلتے تھے۔ تاج برطانیہ جس کی حفاظت کے لیے پورا برصغیر ہندوستان پاکستان ڈیڑھ سو برس تک صف بستہ رہا جس کی حفاظت کے لیے آئی سی ایس جیسی عظیم الشان زنجیر بنائی گئی جس کی کڑیاں آج بھی مضبوط اور طاقت ور ہیں۔!!

بچو تم ہنستے ہو گے اور تمھارے بزرگ خفا ہوتے ہوں گے۔ خود میرے ہم عمر خفا ہو رہے ہوں گے۔ ایں

یہ منہ اور یہ نور آوری۔ نان سنس۔ مگر تم ضرور ہنسو تمھیں ابھی یہ سب کچھ معلوم نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ تم تو بس یہ دیکھو کہ یہ برطانوی ملکہ کا تاج ہے پیاری مسکراتی ہوئی باغ و بہار ملکہ برطانیہ خواہ وہ ملکہ وکٹوریہ ہوں خواہ ملکہ الزبتھ۔ ملکہ ملکہ ہے۔ بادشاہ بادشاہ ہے تاج تاج ہے آئی سی ایس آئی سی ایس ہے۔ بس میں ہوں بزرگ بزرگ ہیں اور بچے بچے ہیں۔

یہ کیا تک ہوئی۔ یہ کیا بات بنی، شاید کچھ بھی نہیں۔ بات نہ بنتی ہو تو آپ پڑھنا بند کر دیجیے۔ کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔ میں آپ کی خوشی کی خاطر، آپ کی وقت گزاری کی خاطر ایک دم ان صدیوں کے جھمیلے سے کیسے نکل جاؤں جس نے میری روح کو غلام میرے ذہن کو زنگ آلود اور میری فکر کو محبوس کر رکھا ہے۔ میں ملیار ایک مقید پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا ہوں۔ کہ لندن کی فضاؤں میں آزادانہ تیر سکوں مگر میرے گرد میرے ایک کربناک ماضی کا پنجرا ہے۔ لندن کی کہر اور دھوئیں کی طرح میرا پورا ماضی غلامی کی کہر اور دھوئیں سے آلودہ ہے جس میں ادبی خوش بیانی کا رستہ آسانی سے نہیں ملتا جب ملے گا تو میں آپ کو ساتھ لے کر گھوموں گا۔ ابھی تو میں اس گھٹن اس حبس میں پاؤں مار رہا ہوں۔

مثلاً یہ سامنے دریائے ٹیمز پر ایک عظیم الشان برج ہے۔ تا عدسے کے مطابق مجھے اس منظر کی خوب صورتی اور اس تاریخی پل کا ذکر کرنا چاہیئے۔ میرے پاس معلومات کے بے شمار ذخیرے ہیں۔ میں اس پل کی اونچائی چوڑائی اور تاریخ تعمیر بتا سکتا ہوں اور یہ بھی کہ اس میں کتنے ٹن لوہا استعمال ہوا ہے۔ یہ کھلتا بند ہوتا پل یقیناً قدیم فن تعمیر کی ایک نادر مثال ہے لیکن اس پل کو دیکھتے ہی مجھے ایک دم دریائے سندھ یاد آجاتا ہے۔ جو دو سو برس صرف اس لیے پلوں کے بغیر رہا کہ انگریز کو پہلے دریائے ٹیمز پر پل باندھنے تھے جن کے لیے روپیہ ہندوستان سے جاتا تھا۔ اور دیگر مقبوضات سے بھی آتا ہوگا۔ بس یہ میری بیماری ہے یہ میرا کامپلیکس ہے جسے آئی سی ایس والے کبھی بھی پسند نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے حسابوں تو یہ پل دیکھ کر دریائے سندھ یاد آجانا ہی بغاوت کی علامت ہے اور اب کسی خطرناک رجحان کی یہی کیفیت مجھ پر لندن کی صاف چوڑی کی مضبوط سڑکیں اور اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر گزرتی ہے اور یہی حال ان کے کارخانوں میں جا کر ہوتا ہے۔ میں ایک بلند روشن عمارت کو دیکھ کر فوراً حساب کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ عمارت دس منزل کی ہے ان میں سے کم از کم چھ منزلوں پر میرے برصغیر کی لوٹ کھسوٹ خرچ ہوئی اور چار منزلوں میں بھی جو سرمایہ لگا وہ انکے باپ کا نہیں تھا بلکہ دوسرے ایشیائی اور افریقی مقبوضات کی لوٹ، ٹیکس، کاروباری منافع کا تھا۔

اصل میں سفرنامے کی ساری روایت خود سیاحوں نے خراب کر رکھی ہے، بندرگاہ پر اترتے تو

والوں کی تعریف یا برائی شروع کر دی۔ شہر میں پہنچے تو یا مظہر العجائب کا ورد فرمایا۔ برطانوی سوسائٹی کی مدح سرائی فرمائی۔ ملک معظم یا ملکہ معظمہ کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ انگریز کے اخلاق کا ذکر کیا۔ لندن ٹاور، ہاؤس آف پارلیمنٹ، بگ بین کی تفصیلات سنائیں۔ تمام بیان میں قلم کی گردن جھکی رہی جو آنکھ اٹھا کر برطانوی تاج کے غلاف تک کو نہیں دیکھ سکتا اس کے پردے کیا چاک کرے گا۔

نو سر نہیں جناب۔ میں بازاری آدمی ہوں، عام آدمی۔ میں بات بھی بازاری ہی کروں گا۔ میں تو برطانوی تاج کی عزت وزت کروں گا نہیں۔

"جوہر شناس چاہیں تو جان لیں کہ اس تاج کا نام ہے تاج دربار۔ یہ تمام درباری مواقع پر پہنا جاتا ہے اور یہ ۱۸۳۸ء میں بنا تھا۔ جب آدھے سے زیادہ ہندوستان کے محاصل یعنی ٹیکس خرچ کرنے کا اختیار انگریز بہادر کو تھا۔ اس میں سامنے کا ہیرا افریقی ہے جس کا وزن ۳۰۹ قیراط ہے اس تاج میں دو ہزار سات سو اڑتیس پکھراج کے دانے ہیں، ۲۷۷ موتی، سترہ نیلم گیارہ زمرد اور پانچ یاقوت۔ اللہ اکبر غیر منقسم ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ تھی جس میں سے ساڑھے تیس کروڑ سے زیادہ آدمی بھوکے اور بیس کروڑ سے زیادہ بے کار رکھنے اور رہبرے والد کا خطاب کے۔ سی۔ ایس۔ آئی تھا۔ اور ہز ہائی نس نظام کا خطاب تھا جی۔ سی۔ ایس۔ آئی اور یار وفادار سلطنت برطانیہ اور سیکڑوں مسلمان آئی۔ سی۔ ایس میں تھے۔ اور سب کی آنکھیں ان ہیروں، یاقوتوں، نیلموں، پکھراجوں اور زمردوں کی آب وتاب سے خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو

اگر یہ صرف انگریزوں کا تاج تھا تو انھیں مبارک۔ وہ اپنی جگہ خوش ہم اپنی جگہ خوش مگر ذرا اس کے ہیروں اور موتیوں کی لاگت تو لگاؤ، پانچ لاکھ یا دس لاکھ، اب وہ جو بھی ہو۔ چاہے وہ دس روپے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ وہ تئے کہاں سے۔ ان میں ہمارا کتنا حصہ ہے۔ کوئی سوا دو روپے کا۔ بس تو اس حصے کی بات کرو کیوں صاحب کیوں ہمارا مال لگا اس تاج میں اس تخت میں اس عمارت میں۔ اس پل کی بنیادوں میں کتنے کروڑ ہندوستانیوں پاکستانیوں کا خون ہے۔ اس روشن عمارت کی روشنیاں ہماری کتنی آنکھوں سے بینائی لے کر روشن ہوئی تھیں۔ اس جمہوریت کے نشان اس مادر پارلیمان نے کتنے کروڑ جیتے جاگتے چلتے پھرتے انسانوں کو سیکڑوں برس غلام بنائے رکھا ہے۔ یہ مادر پارلیمان جس کا حوالہ آج بھی ہمارے دانشور اور سیاست دان ایک مکمل جمہوری ادارے کے طور پر دیتے ہیں۔ جس کی روایتوں اور قرینوں سے سند لی جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے (پیارے) جس کے اندر داخل ہو کر بڑے سے بڑا حریت پسند جمہوری مزاج انگریز مفکر و دانشور و سیاست دان آن واحد میں استعمار پسند

حاکم ہوجاتا تھا۔ اس کی ساری دستوری موشگافیاں انگلستان کے عوام کے لیے ہوتی تھیں اور وہ باقی تمام ممالک دنیا کو جانوروں کی بستی سمجھتا تھا حالانکہ یہ پوری دنیا خدا کی دنیا ہے۔

تو میں اس مادر پارلیمان کو دیکھتے ہی عالم فاضل پاکستانیوں کی طرح ایک دم سجدۂ عقیدت نہیں ادا کروں گا میں تو پہلے اس کی اصلیت یاد کروں گا۔ اس کا مسلسل ظلم و تشدد و جبر اس کی مسلسل بے ایمانی، ناانصافی، اس کے غیر انسانی عقائد اس کے غیر انسانی افعال، اس کی غیر انسانی شرمناک بہیمانہ تاریخ اس کی اچھی تاریخ سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ عبرت انگیز ہے۔ ہائے وہ میرے ہم وطن قصیدہ خوانانِ جمہوریت بطانیہ

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اماں یار چھوڑو بھی معاملے پر پھر بھی آؤ گے یا دل کے پھپھولے ہی پھوڑے جاؤ گے۔ چلو غصہ تھوکو مزے میں آؤ مزے کراؤ لندن کے وہ نائٹ کلب کہاں ہیں جو سنا ہے پیرس والوں سے بھی مقابلہ کرتے ہیں، کچھ نہیں تو برٹش میوزیم لائبریری ہی میں لے چلو۔ سنا ہے وہاں خود ہمارے ثقافتی ورثے کے نایاب خزانے جمع ہیں۔ بنیا گڑ نہ دے تو گڑ کی سی بات ہی کرے۔ تم تاریخ غلامیٔ پاکستان لکھنے بیٹھ گئے حالانکہ یہ کام اصل میں ان مورخین کا ہے جو کامن ویلتھ یعنی دولت مشترکہ کے عطا کردہ اور دیگر بین الاقوامی وظائف پر باہر جاکر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اور واپس آکر اعلیٰ سرکاری اور علمی عہدے۔

مسٹر ڈیوڈ روایتوں والے

یہ ڈیوڈ صاحب ہیں۔ ۷۰ برس کے ہیں مگر جوانوں سے زیادہ چاق و چوبند۔ کالر سخت ہے کف بھی سخت ہیں مگر دونوں قمیص سے الگ ہو جاتے ہیں۔ پرانے انگریز ہیں اس لیے کف کالر سخت رکھیں گے مگر نیا انگلستان اور نئے انگلستان کی پیچیدہ اقتصادی حالت اس عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے قمیص بدلنے کی بجائے دو تین دن بعد کف اور کالر بدل لیتے ہیں، قمیص وہی رہتی ہے۔

ڈیوڈ صاحب برٹش کاؤنسل کے منظور شدہ گائیڈ ہیں۔ یونیسکو نے میرا نگراں برٹش کاؤنسل کو مقرر کیا ہے اور برٹش کاؤنسل نے ڈیوڈ صاحب کو۔ وہ ایک بہت کرارے بوڑھے ہیں، قاعدے کے مطابق انھیں میرے ساتھ صرف چار دن رہنا چاہیے۔ یعنی اس مدت تک جس میں میں لندن کے متعلق بنیادی باتیں سمجھ لوں۔ مثلاً زیر زمین ریل کے ذریعے سفر کرنا سیکھ لوں، کھانے کے سستے مقامات جان لوں اور کسی مناسب سے ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں، ان کی مصاحبت کا معاوضہ میں نہیں دیتا، برٹش کاؤنسل کے ذریعے یونیسکو دیتی ہے۔ تین دن بعد ڈیوڈ صاحب کھل گئے۔

"بھئی میرے حالات آج کل ٹھیک نہیں۔ جاڑے کا زمانہ ہے جس کی وجہ سے طالب علم بھی کم آ رہے ہیں۔ ہم بہت سے گائیڈ ہیں۔ سب کے لیے کافی کام نہیں۔ ہم مستقل ملازمین تو ہیں نہیں، بس یہاں رجسٹرڈ ہیں جب کام ہوتا ہے بلا لیے جاتے ہیں۔ آپ برٹش کاؤنسل کے وظیفے پر تو نہیں ہیں نا۔ شکر ہے کہ نہیں ہیں۔ وہ بہت کھینچیر ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس پاؤنڈ ماہوار، خیر وہ تو الگ بات ہے۔ قصہ یہ ہے کہ آپ یونیسکو کے آدمی ہیں ہمارے نہیں اس لیے آپ ذرا نخرے بھی کر سکتے ہیں۔ کاؤنسل کچھ نہیں کہے گی۔ آپ یہ کہیے کہ صاحب میں تو بھولا بھالا ایشیائی ہوں (اصل مطلب تھا جاہل گھامڑ ایشیائی) اور لندن کو بالکل نہیں سمجھ سکا اس لیے مجھ کو مسٹر ڈیوڈ کی خدمات کم از کم دو ہفتے کے لیے درکار ہیں۔ باقی میں بھگت

لوں گا۔"

چنانچہ مسٹر ڈیوڈ (پورا نام بتانا غیر اخلاقی بات ہوگی) دو ہفتے روز ملتے رہے۔ میں نے انھیں چوتھے دن ہی چھٹی دے دی تھی۔ کبھی کبھار صبح کو ناشتے کے فوراً بعد یا رات گئے آنکلتے تھے۔ دن میں اور چھوٹے موٹے کام بھی کرتے تھے لیکن دفتر میں وہ مجھ سے وابستہ تھے اور یونیسکو سے کوئی معمولی سی رقم پاتے تھے۔ وہ ذہین اور روشن خیال آدمی تھے یعنی اپنی عمر کے حساب سے سخت روشن خیال تھے مثلاً وہ لڑکے لڑکیوں کا ساتھ پڑھنا معیوب نہیں سمجھتے تھے مگر میک اپ کرنا چہرے پر سخت خفا تھے۔ لڑکیوں کا اکیلے باہر نکلنا انھیں منظور تھا مگر بال کٹوانا یا بوب ہیر بنوانا یا ہونٹ پلکیں بھنویں رنگنا انھیں ناپسند تھا۔

"۱۹۱۴ء میں میری چھوٹی بہن پہلی بار لندن سوسائٹی میں متعارف ہوئی تو لارڈ ایک اور لارڈ ڈمبک کے ہاتھوں سے شیمپین کے گلاس چھوٹ گئے تھے اور تمام پارٹی اس کی لانبی لانبی زلفوں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ افسوس اب زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے۔ مسٹر عالی کاش آپ پہلی جنگ سے پہلے اس ملک میں آتے۔ یقیناً آپ کو یہ بے حیائی کے مناظر نظر نہ آتے اور اگر آپ کسی اچھے خاندان کے ساتھ رہتے تو آپ کا دل یہاں رہ کر خوش ہوتا۔"

وہ آہ بھر کر تقریر کرتے۔

پتا نہیں اس زمانے میں میرا دل یہاں رہ کر خوش ہوتا یا نہیں اس وقت تو میں سخت بور ہو رہا ہوں۔ ایک کالا پیلا کا ناکھدرا شہر ہے جہاں سفید لوگ بستے ہیں اور بس۔ اور سونے پر سہاگا یہ کہ سب شدید مصروف رہتے ہیں یہاں تک کہ کافی ہاؤس بھی اوقات کار میں خالی خالی نظر آتے ہیں۔ اے انٹلکچوئل بھائیو تم کہاں ہو حیف تمھاری دانشوری پر کہ دانشور ہوتے ہوئے بھی کام کرتے ہو۔ ارے تم لوگ بھی کام کرو گے تو جبات و ثمات، کرۂ ارض اور کائنات کے رازہائے درون خانہ کا پردہ کون اٹھائے گا۔ دن میں کام کرنے والے تو شام تک تھک جاتے ہیں اور تھکے ہوئے دماغ کس کام کے۔ آؤ۔ ہمارے چائے خانے اور کافی ہاؤس دیکھو انشاء اللہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

اب آہستہ آہستہ لندن اور انگلستان کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ لیکن پہلے مسٹر ڈیوڈ کے ارشادات پر غور کیا جائے۔ انھوں نے چند باتیں بڑی پتے کی بتائی ہیں جب سے میری معلومات میں ایک شانِ استغنا آ گئی ہے اب مجھے انگلستان کے بارے میں جلد جلد کتابیں پڑھنے یا یہاں زیادہ دیر قیام کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں ایک تجربہ کار قدیم لندنی کی طرح بات چیت کر سکتا ہوں۔

"ایک تو جناب آبادی کا مسئلہ ٹیڑھا ہوتا جاتا ہے۔ پہلے ہم انگریز چار کروڑ تھے اور بہت سے لوگ بیرونی مقبوضات کی فوجوں میں اور انتظامیہ اور تجارتی چکروں میں کھپ جاتے تھے لیکن اب آبادی تو سوا پانچ کروڑ ہوگئی ہے اور مقبوضات ہیں کہ (سارے) ایک ایک کر کے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ سب کی کھپت یہیں ہونی ہے۔"

"اب بتائیے کبھی دیکھا نہ سنا کہ لڑکیاں زمانۂ طالب علمی میں حمل کا بیمہ کراتی ہیں۔ یعنی اگر ناجائز حمل رہ جائے تو انشورنس کی رقم ملے۔ گویا انشورنس اب کھلا جوا ہوگیا ہے اب تو جوئے کی قسموں میں حمل قرار پانا اور نہ پانا بھی شامل ہوگیا ہے۔"

"اور جناب بھلا اب ہماری انگریز قوم کی عزت کیا رہ گئی ہے۔ غضب خدا کا تمام پرانے امرا نے اپنے اپنے محلات عام تماشے کے لیے کھول دیے ہیں۔ کم بخت حکومت نے ایک وقف بنا دیا ہے کہ اپنی پرانی جائدادیں اس کے حوالے کر دو۔ اور ایک چھوٹی سی رقم برابر ملتی رہے گی۔ سیاحوں کی دل چسپی بڑھ جائے تو ٹکٹ لگا دو اور پیسے کماؤ۔ مر گئے تو جائداد وقف میں مدغم ہو جائے گی۔ بھلا دیکھیے اپنے باپ دادا کے محفوظات سب کے سامنے کھول کر رکھ دیے ہیں۔ آج کو وہ زندہ ہوتے تو انگلستان کے چپے چپے پر خون کی ندیاں بہہ جاتیں مگر کیا مجال تھی کہ کوئی لارڈ ہملٹن کی خواب گاہ دیکھ سکتا۔ آج آپ ساڑھے سات شلنگ دے کر پورے محل میں گھومیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نشل موری ٹل ہال میں کسی بھی نواب بلکہ شاہزادے تک کے لیے ایک دن کا مہمان ہو جانا بھی بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی، یہ ملکہ الزبتھ اوّل کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ پوری عمارت کا عکس پانی میں پڑتا ہے۔ ہائے کیا خاندانی لوگ تھے۔ آخر میں زمینیں بیچ بیچ کر مکان کی دیکھ ریکھ برداخت کرتے تھے۔ اب ان کی اولاد اس پر بھی ساڑھے سات شلنگ فی کس کما رہی ہے۔ میں تو اب بھی ان خاندانوں کا قائل ہوں جنھوں نے عام سیاحوں پر کچھ نہ کچھ پابندی لگا رکھی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سیاح کے لیے تو ان محلات پر دو سو گز سے نظر ڈال لینا ہی ایک اعزاز ہونا چاہیے۔ نہیں جی، میں نے تو پندرہ بیس برس ہوئے اخبارات میں بھی کئی خط لکھے تھے۔ ارے کم بخت نوابو! اپنے باغ تو محفوظ رکھو۔ اپنے آبائی خواب گاہیں اور نشست گاہیں تو بچا کر رکھو، کیا ضرور ہے کہ سیاح تمام لطافتیں روندتے پھریں۔ شکر ہے کہ کہیں کہیں یہ پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ آہ مسٹر عاقی میں لارڈ خاندان سے نہیں مگر میرے دادا کو ملکہ وکٹوریا آنجہانی نے دو بار سلام کا جواب دیا تھا۔"

"جناب مجھے آسکر وائلڈ کا مقدمہ یاد ہے۔ اس پر اغلام کا الزام لگا تھا۔ جیل سے نکل کر لندن میں نہ

رہ سکا۔ ہوگا بڑا ادیب۔ اس سے کیا تعلق۔ تھا تو بداخلاق۔ لندن کی مہذب سوسائٹی اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جیل سے سیدھا فرانس چلا گیا۔ اور وہیں مرگیا۔ ذرا آج ہماری حالت ملاحظہ فرمائیے کہ گو قانون تو اب بھی اس کے خلاف ہے مگر لوگ کھلے بندوں اپنی جنسی کج روی کا ذکر کرتے ہیں بلکہ ایک اچھے خاصے طبقے نے پارلیمنٹ پر بھی زور ڈالا ہے کہ قانون بدل دے اور اس کج روی کی اجازت دے دے۔ سن لیجیے جناب! جس دن یہ ہوا میں انگلستان چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"اجی ہمارے وقت میں یہ ننگے ناچ گانے کہاں ہو سکتے تھے۔ یہ جو علاقہ ہے نا سوہو کا علاقہ۔ یہ پیشہ سے دوسرے اور تیسرے درجے کی تفریح گاہ تھی۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ لڑکیاں ناچتے ناچتے پورے کپڑے اتار دیں۔ توبہ، یہ ممکن ہی نہ تھا۔ میں نے اپنی جوانی میں بہت کچھ دیکھا ہے مگر صاحب اب تو جو سنتا ہوں اور پڑھتا ہوں، اس کا تصور بھی نہ تھا۔ خدا اپنی آنکھوں سے نہ دکھائے۔ ہاں آپ مجبور کریں گے تو کبھی ساتھ دیدوں گا۔ گو بے حیائی کو پھر بھی بے حیائی کہوں گا۔ غضب ہے کہ یہ نائٹ کلب اور عیاشی کے اڈے کوئی پچاس لاکھ پونڈ سالانہ کا بزنس کرتے ہیں۔"

"اور جناب ہمارے وقت میں بھلا کالے آدمی کی کیا مجال تھی کہ شانے سے شانہ ملا کر چل سکے۔ معاف کیجیے گا آپ تو براؤن قوم یعنی بھورے رنگ کے ہیں میری مراد حبشیوں سے ہے۔ یعنی لاکھوں حبشی چلے آ رہے ہیں۔ یہ دولت مشترکہ تو ہمارے لیے عذاب جان بن گئی ہے۔ کوئی ایک لاکھ حبشی لوگ تو مستقل شہریت اختیار کر چکے ہیں اور بھئی آپ کے پاکستانی اور ہندوستانی بھی کوئی ستر ہزار پکے انگلستانی شہری ہیں یعنی ووٹ بھی دے سکتے ہیں اور علاج بھی مفت کرا سکتے ہیں اور لاکھوں ہر مہینے عارضی قیام کے لیے پہنچ جاتے ہیں، جو رفتہ رفتہ مستقل ہو جاتے ہیں۔ اب بتائیے آپ لوگ نہیں یہ حبشی لوگ جہاں رہتے سہتے کھاتے پیتے ہیں وہ تو ہمارے بس کا ہے نہیں لہٰذا ہمارے اور ان کے محنتانوں اور تنخواہوں میں بہت فرق ہے۔ ہمارا گزارا زیادہ میں ہوتا ہے اور ان کا کم میں۔ مالک کو کم پیسہ خرچ کرنا اچھا لگتا ہے۔ سرمایہ دار کا نہ کوئی وطن ہوتا ہے نہ رنگ و نسل وہ تو پیسے کی بچت دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹی موٹی نوکریاں ہمارے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہیں ہاں ابھی نوکریوں اچھے کاروبار میں آپ لوگ یعنی معاف کرنا حبشی لوگ نہیں گھس سکتے۔ ورنہ انگلستان کا تختہ پلٹ جائے گا۔"

"اور مذہب تو اب ختم سمجھو۔ ایک تو ویسے ہی دنیا بھر کو لامذہبی کا دورہ پڑا ہوا ہے! اس پر طرہ یہ کہ قدیم علوم کی طرف بھی رغبت نہ رہی۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ ہمارے زمانے میں کیمبرج اور آکسفورڈ میں لاطینی زبان جانے بغیر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اب کیمبرج نے تو لاطینی زبان جاننے کی شرط ہی اڑا دی جس کا جی چاہے تنے،

الم غلم سب کو بھر لیتے ہیں۔ بس سابقہ تعلیمی نتائج دیکھتے ہیں۔ نہ خاندان دیکھتے ہیں نہ آمدنی۔ نہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے باپ دادا کہاں پڑھے۔ ہمارے زمانے میں تو کیمبرج والے کا پوتا پڑپوتا تک کیمبرج میں جاتا تھا آکسفورڈ نہیں جا سکتا تھا اور یہی روایت آکسفورڈ کی تھی۔ مگر اب۔ اب۔۔۔۔"

"یوں بھی برطانیہ کا زوال شروع ہو چکا ہے ذرا خیال فرمایئے، ہم نے شاہ ایڈورڈ کو مسز سمپسن کے قضے میں نکال باہر کیا۔ کبھی نہیں ہے ہماری روایت کہ شاہی خاندان "عامیوں" سے رشتہ داریاں کرے۔ اس کے جواب میں ہم شاہی خاندان کو اپنی مخلصانہ وفاداری پیش کرتے ہیں۔ ہم ملکہ یا بادشاہ کے ایک اشارے پر جان قربان کر سکتے ہیں۔ شاہی خاندان ہمارے سیاسی استحکام ہمارے انتظام کی ضمانت ہے اور ہم اس پر ساٹھ لاکھ پونڈ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن آپ ملاحظہ کیجیے۔ شاہزادی مارگریٹ نے پہلے ایک طلاقی پسند کیا تھا اور جب رو بہ اصلاح ہوئیں تو ایک عامی فوٹو گرافر پر ریجھ گئیں اور بے چاری ملکہ معظمہ کو بارکر یہ رشتہ منظور کرنا پڑا۔ آہ انگلستان تیرے عروج کا زمانہ ختم ہوا اب ایک پستہ قد فوٹو گرافر ایک شاہزادی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتا ہے اور انگریز ٹک ٹک دیکھتا ہے۔ سلطنت ختم ہوئی ممالک محروسہ گئے خاندان شاہی کا وقار رہ گیا تھا، سو وہ بھی روز مجروح ہوتا ہے ذرا خیال کیجیے کہ شاہزادی مارگریٹ کی شادی ہوئی۔ غلط ہوئی۔ برا کیا جھک مارا مگر جب ملکہ معظمہ نے منظور فرما لیا تو بس ہم کو چپ چاپ صورت حال قبول کر لینی چاہیئے۔ مگر صاحب اخبار والے کہتے ہیں کہ پچیس ہزار پونڈ آرائش پر کیوں خرچ کیے گئے، چالیس ہزار پونڈ کا خرچ شاہی جوڑے کے ہنی مون کے لیے کیوں منظور ہوا۔ اور تو اور خود ملکہ معظمہ کی ذات پر بھی تنقید ہوتی ہے یہ لیسے چلتی ہیں، ایسے پھرتی ہیں۔ آواز بچگانہ ہے اطوار بہت ہی سادے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اسے بدلو تو کیا آزادی اظہار کے یہی معنی ہیں۔ کیوں مسٹر عالی کیا میں آپ کو ایک سٹھیایا ہوا بوڑھا لگتا ہوں؟!"

"اچھا ہوا کہ تمھاری روایات کا بھی پڑا ہوا" مسٹر عالی جو انگریزوں کی اصطلاح میں کالے آدمی ہیں سوچتے ہیں "تم نے بھی تو ہماری روایات کو تباہ کر دیا تھا اور سکھایا یہ تھا کہ یہ سب نئے زمانے کا اثر ہے یہ رفتار دقت ہے یہ تعلیم کی نعمتیں ہیں اور تعلیم کی ایک نعمت یہ بھی عطا کی کہ ہم اپنی زبان کو ذلیل سمجھنے لگے اور بہت سے صاحب لوگ آج بھی اسے ذلیل سمجھتے ہیں"

مگر یہ بے رحمی ہے بڑے میاں کے ساتھ زیادتی ہے بڑے میاں ایک فرد ہیں ایک اکیلے آدمی۔ ایک اکیلے پرانی وضع کے انگریز "ہاں جناب مجھے کہنا چاہیے" "میں خود حیرت میں ہوں کہ یہ کیا زمانہ آگیا ہے۔"

اور دوسری طرف نیا انگلستان ہے بیسویں صدی کا انگلستان جس میں پرانی قدروں کے دھوئیں

میں سے ایک جوان تازہ افق جھانکتا ہے۔

بابی اور بڈھی میم کا نیا برطانیہ

نیا انگلستان انگریز کی سخت جانی کا تازہ ترین ثبوت ہے۔

آج کل میں شام کو بے مقصد گھومتا ہوں یعنی کبھی پیدل کبھی بس کبھی زیر زمین ریل کے ذریعے گھومتا ہی رہتا ہوں۔ لندن کی کراچی والی بندر روڈ، اور لاہور والی مال روڈ، اور ڈھاکے والی جناح ایونیو کی بات تو الگ ہے، وہ بہت روشن، مضبوط، اور آراستہ سڑکیں ہیں لیکن ابھی تک یہاں مجھے کوئی لالو کھیت نظر نہیں آیا۔ کوئی پیر الہٰی بخش کالونی نہیں ملی۔ میں زیر زمین ریل کے ذریعے پندرہ پندرہ میل دور پہنچ کر اوپر نکلا ہوں اور لندن کی ملحقہ "بستیوں" تک میں پیدل گھنٹوں سڑک در سڑک گلی در گلی گھوما ہوں۔ مگر کیچڑ گندگی، کچی سڑک، دھول، کاٹھ کباڑ کا نشان نہیں ملتا۔ یا اللہ یہ قصہ کیا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس شہر پر سنہ انتالیس سے سنہ چوالیس تک مسلسل بمباری ہوئی تھی اور سنا ہے کہ بموں نے بڑی بڑی عمارتوں کی بنیادیں تک ہلا دی تھیں۔ مگر آج اس تباہی کے آثار تک نظر نہیں آتے۔ اپنا ملک ہوتا تو یار لوگ ابھی تک شہر آشوب لکھ رہے ہوتے۔ ہائے مولانا حالی کیا خوب فرما گئے ہیں:

"تذکرہ دہلیِ مرحوم کا مت چھیڑ اے دوست"

یارو کیا انگلستان میں شاعر، ادیب، سیاست دان اور طالب علم نہیں ہوتے، کیا یہاں حکومت نہیں ہوتی جس پر سب الزام رکھ کر لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں۔ اجی سب کچھ ہوتا ہے یہاں حکومت بھی ہوتی ہے، حزب مخالف بھی ہوتی ہے، سیاست دان بھی ہوتے ہیں جو جلسے برپا کرتے ہیں اور طالب علم بھی ہوتے ہیں جو ہڑتالیں کرتے ہیں، پھر کیا بات ہے، کیا ملکہ معظمہ کے پاس الہ دین کا چراغ ہے جو سب تعمیری کام آپ ہی آپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور ہوگا۔ جی ضرور ان کے پاس کوئی جادو ہے کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے۔ دیکھیے نا ان کے خاندان نے ہندوستان کے چالیس کروڑ اور باقی دنیا کے تیس کروڑ آدمیوں

ہم دوڈھائی سو برس تک اسی لندن میں بیٹھ کر حکومت کی۔ اور یورپ میں کیسی کیسی جنگیں لڑیں یہاں تک کہ دو عالمی جنگیں بھی لڑیں، صاحب ان لوگوں میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ کاش مجھے حکومت ایک وظیفہ دے اور کم از کم برس دن یہیں بیٹھ کر انگریزوں کے چراغ الدین پر تحقیق کروں۔ اس تحقیق کی قدر بھی بہت ہوگی کیوں کہ لوگ باہر کی تحقیق کو "گھریلو تحقیق" کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چاہے وہ کسی موضوع پر ہو۔ مثلاً اردو پر لندن میں منظور ہونے والا مقالہ پاکستانی مقالے سے زیادہ قیمت رکھتا ہے، چاہے اس میں کچھ بھی نہ ہو اور چاہے اسے ان استادوں نے لکھا ہو جو اردو ناول کے بارے میں ڈپٹی نذیر احمد سے آگے کچھ نہیں جانتے ۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں ....

ہاں تو آج کل میں انگریزوں کا چراغ الدین ڈھونڈ رہا ہوں۔ پہلے خیال تھا کہ وہ صرف ملکۂ معظمہ کے صرفِ خاص میں ہوگا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ کسی عام انگریز کے گھر میں بھی مل سکتا ہے۔

میں ایک چھوٹی سی تنگ گلی میں کھڑا ہوں، سامنے قطار اندر قطار تقریباً ایک ہی قسم کے مکانات ہیں، چھوٹے چھوٹے، کالے کالے رنگ کے مکانات دیواروں کا رنگ بارش سے کالا ہوگیا ہے۔ ورنہ اینٹ سرخ رنگ کی معلوم ہوتی ہے۔ سامنے والے مکان سے ایک بڑی بی ایپرن باندھے نکلتی ہیں۔ وہ ایک وزنی ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہیں جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہیں، ہڈیاں گڈیاں ہیں اور نہ جانے کیا کیا۔ پھر گلی اکیلی ہے، خالی ہے۔ میں سامنے ایک دروازے کی آڑ میں کھڑا ہوں۔ وہ بڑی بی مکان کے آگے لگے ہوئے کٹہرے تک آتی ہیں ان کا سانس پھول گیا ہے، وہ ٹوکری دھپ سے زمین پر رکھ دیتی ہیں 'آہا' میں سوچتا ہوں "ایک صورت تو اپنی جیسی نظر آئی" میری رگِ مزاح پھڑکتی ہے۔

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اب بڑی بی نے ٹوکری اٹھانی چاہی مگر نہ اٹھی۔ میری ایشیائی غیرت جوش میں آتی ہے مگر میں آگے نہیں بڑھتا۔ ایک تو وہ صرف بڑی بی ہیں، اگر انھوں نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کر بھی دیا تو مجھے کیا مزا آئے گا۔ میں ان کا پتا بھی نہیں پوچھوں گا۔ کاش یہ کوئی نوعمر خاتون ہوتیں۔ یا کم از کم کوئی ادھیڑ عمر کی جاذب نظر خانم ہی نکلتیں۔ ابھی میں شیر کی طرح ایک ہی جست میں گلی پار کر جاتا اپنا اوور کوٹ اتار کر زمین پر پھینک دیتا آستینیں چڑھا کر ٹوکری اٹھاتا اور اسے کاندھے پر رکھ لیتا۔ بلکہ سر پر بھی رکھ لیتا اور اگر وہ لندن سے اڈنبرا بھی جانے کو کہتیں تو ہمت کر جاتا۔

اب بڑی بی نے آدھا ٹوکرا الٹ دیا۔ بہت کریہہ منظر تھا وہ طرح طرح کا ملغوبہ ایک طرف جمع ہوگیا۔ میں بہت خوش ہوا۔ مجھے بڑی بی کی اس حرکت سے بوئے رفاقت آئی۔ وطن یاد آیا۔ وطن کی سڑی گندی غلیظ گلیاں

اور صبح شام کوڑا کرکٹ پھینکنے والی مائیں بہنیں بیٹیاں جن کیلیے ہمارے ایک بزرگ ادیب کس شفقت سے فرما گئے ہیں:

اے ماؤ بہنو بیٹیو ! دنیا کی عزت تم سے ہے

میرا جی چاہا آگے بڑھ کر بڑی بی کے سینے سے لگ جاؤں۔ اے بڑی بی خدا تمھیں خوش رکھے تم نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔ تم نے میرا جھکا ہوا ایشیائی سر اس دیار غیر میں ایک بار پھر بلند کر دیا مگر نہیں بڑی بی مجھے ذلیل کرنے پر تلی ہوئی تھیں، انھوں نے آدھا ٹوکرا اٹھا لیا اور دونوں ہاتھوں سے بغل میں دبا لیا پھر وہ گلی کے نکڑ کی طرف چلیں جہاں ایک بڑا سا پیپا غلاظت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا وہ صاف چلتی ہوئی نظر آئیں وہ موٹی اور بھدی تھیں اور ان کی رفتار سست تھی مگر وہ گرتی پڑتی پیپے تک پہنچ گئیں اور اس میں ٹوکرا الٹ دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ٹوکرا انھوں نے میرے سر پر الٹ دیا ہے۔

واپس آکر انھوں نے باقی کوڑا ٹوکرے میں بھرا اور پھر پیپے میں ڈال آئیں اور پھر اپنے دروازے کی سیڑھیوں پر ٹھمک ٹھمک کر چڑھنے لگیں۔ میں بور ہو گیا۔ میں نے اپنا مفلر دوبارہ گلے اور کانوں پر باندھا۔ ہیٹ ذرا ترچھا کیا اور گلی کے وسط میں آگیا، مگر اتنی دیر میں بڑی بی ایک لمبی اور موٹی جھاڑو لیے پھر نیچے اتر آئیں اور ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹوکری بھی تھی۔ انھوں نے پٹری کے اس حصے کو جھاڑو سے خوب صاف کیا، بچا کھچا کوڑا چھوٹی ٹوکری میں ڈالا اور ایک بار پھر کوڑے والے پیپے کی طرف گئیں، میں نے ہیٹ اٹھا کر ان کی پشت پر ہی سے انھیں سلام کیا "گڈ بائی آنٹی" میں نے کہا "اب میں جان گیا کہ یہاں کون سا الہ دین کا چراغ رکھا ہوا ہے۔"

کیا یہ ممکن نہ تھا کہ بڑی بی کوڑا کرکٹ سڑک پر ہی پھینک دیتیں۔ شاید قانون اس کے خلاف ہے۔ اچھا تو وہ ہمسائے کے گھر کے آگے ڈال دیتیں۔ یا ذرا آگے بڑھ کر تیسرے یا چوتھے گھر کے سامنے یا سامنے والے کسی گھر کے سامنے۔ اس وقت گلی میں کوئی بھی نہ تھا اور سردی خاصی سخت تھی اور ان کا سانس پھولا ہوا تھا، اور محکمہ تعمیرات کا کوئی آدمی آس پاس نہ تھا۔ کوئی پولیس والا، نہ مجسٹریٹ، نہ خان بہادر حبیب اللہ آف کراچی کارپوریشن نہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر۔

گلی در گلی گھومتے گھومتے میں رستہ بھول گیا ہوں۔ لندن کا نقشہ میری جیب میں ہے مگر ابھی وہ بیک نظر سمجھ میں نہیں آتا۔ ٹیکسی لی تو وہیں پہ اتر جائیں گے۔ لیجیے:

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید

یہ ایک چھ فیٹ لمبا بابی آرہا ہے۔ کالا اوورکوٹ سر پر اونچی سی ٹوپی ہاتھ میں سیاہ ڈنڈا یہ لندن کا پولیس والا ہے۔ ہر مرض کا علاج۔ محتسب، دوست، اور رہنما۔ بابی جلدی میں ہے شاید ڈیوٹی ختم کر کے گھر جارہا ہے، ورنہ عام طور پر بابی لوگ جلدی جلدی نہیں چلتے۔ بلکہ آہستہ آہستہ گھومتے ہیں۔

"معاف کرنا آفیسر" میں اسے روکتا ہوں "میں راستہ بھول گیا ہوں۔ مجھے ماربل آرچ جانا ہے۔ اور میں ٹیکسی نہیں لوں گا" قاعدہ یہ ہے کہ بابی یعنی پولیس کانسٹبل کو آفیسر کے نام سے پکارا جائے۔

"آہ مسٹر آپ ماربل آرچ سے بہت دور ہیں اور آس پاس کوئی زیرزمین اسٹیشن بھی نہیں ہے" وہ مدد پر تیار ہو جاتا ہے۔ "آپ ایسا کیجیے کہ" وہ سوچتا ہے "آپ کو میں ایک نقشہ بنا کر دیتا ہوں" وہ جیب سے پنسل نکالتا ہے۔ میں سگریٹ کا بکس نکال کر سگریٹ جیب میں رکھ لیتا ہوں اور اس کے سفید حصے پر ایک پیچیدہ نقشہ بننا شروع ہوتا ہے، مگر کاغذ چھوٹا پڑا۔ بابی سامنے والے ریستوران سے ایک بڑا سا کاغذ مانگ کر چار گلیوں، موڑوں اور چوکوں کا نقشہ بناتا ہے پھر اس میں تیر بنا بنا کر میرا راستہ متعین کرتا ہے۔ "اس مقام پر پہنچ کر آپ اٹھائیس نمبر کی بس لے سکتے ہیں" وہ مطمئن ہو کر کہتا ہے۔ "شکریہ، بہت بہت شکریہ آفیسر" میں کہتا ہوں "کیا آپ سگریٹ پئیں گے یا ہم ایک ایک چائے کی پیالی ساتھ پی سکتے ہیں سردی بڑھ رہی ہے۔"

"نو سر" وہ جتاتا ہے "مجھے گھر جا کر کھانا کھانا ہے" میں اس پیش کش کا ممنون ہوں مگر مجھے جلد جانا چاہیے امید ہے آپ آرام سے ماربل آرچ پہنچ جائیں گے، از راہ کرم ایک کتاب خرید لیجیے۔ اس کا نام ہے اے ٹو زیڈ۔ اس میں آپ کو لندن کی ستائیس ہزار سڑکوں اور گلیوں کے نام اور ہر ایک تک جانے والی بس زیرزمین ریل وغیرہ کے نشانات مل جائیں گے۔"

کیا یہ بابی بھی ملکہ معظمہ انگلستان کا چراغ الہ دین ہے۔ اس کی تنخواہ بھی لاکھوں پونڈ نہیں ہے، اور لندن میں مجھ جیسے کئی لاکھ کالے رہتے ہیں جن میں سے ہزاروں اجنبی ہوتے ہیں، وہ سب اور خود انگریز اور اجنبی یورپین یعنی سب تازہ واردان بساط ہوائے دل اسے دن میں سیکڑوں بار ستاتے ہیں، کوئی رستہ پوچھتا ہے، کوئی سڑک اس کے سہارے سے پار کرتا ہے، کوئی بڑھیا ٹھٹھریا تھوڑا بہت بوجھ بھی اٹھوا لیتی ہے، اور اب بابی گھر جارہا تھا۔ دن بھر گھومتے گھومتے تھک گیا ہوگا۔ آخر انسان ہے۔ بھوکا بھی تھا، کسی سوشل سروس سوسائٹی کا رکن بھی نہیں تھا نہ یہ اس کے الکشن کا زمانہ ہے کہ مجھ سے ووٹ لینے کی امید ہوتی۔ میرا سنڈ بھی خاصا ٹیڑھا تھا "کبھی آپ اس شہر کو خود کیوں اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ نقشہ

پڑھیے۔ لے ٹو زیڈ ساتھ رکھیے نہیں تو ٹیکسی کیجیے۔ کوئی یہ آپ کے باپ کا نوکر ہے "کیا مطلب ہے آپ کا؟" میرے کانوں میں مانوس آوازیں گونجتی ہیں جو سات سمندر پار وطن پیارے وطن سے آرہی ہیں "کیا مطلب ہے جی، کیا ہم آپ کو رستہ بتلانے پر نوکر ہیں؟ چلے آتے ہیں بڑے صاحب بن کر جاؤ جاؤ اپنا کام کرو ہم ذرا چائے پینے اور سستانے بیٹھے ہیں۔"

اے بوڑھی خاتون! او مائی ڈیر بابی! سچ سچ بتاؤ تم لوگ یہ حرکتیں کیوں کرتے ہو۔ کیا تم سب انگریز لوگ اپنے ملک کے پبلک ریلیشنز افسران ہو یا تم سب پاگل ہو یا تم سب کو روز خدائی احکام ملتے ہیں یا تم کسی خوف میں مبتلا ہو۔

ہونہ ہو یہ چراغ الہ دین والی بات ہے۔ الہ دین کا چراغ جو کبھی مشرق کے دریچوں میں جلتا تھا اور جو اب مغرب کی گلیوں میں روشنیاں برساتا ہے۔

کیوں مسٹر عالی آخر ہو نا چھوٹے آدمی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتر آئے۔ ایک بڑی بی کا لطیفہ سنا دیا ایک بابی کا چٹکلا چھوڑ دیا اور چھٹی ہوئی۔ آئی ایم ویری سوری سر۔ میں معافی چاہتا ہوں میں نکلا تھا چراغ الہ دین کی تلاش میں اور بڑھیا میم صاحب کے چکر میں پھنس گیا ان سے چھوٹا تو بابی سے ٹکرا گیا یا حضور یعنی سر شاید بات یہ ہے کہ انگلستان کے سب سے بڑے نمائندے یہی بابی اور یہی بڑھیا میم صاحب ہیں جنھوں نے اس سرد اور بادلوں سے ڈھکے ہوئے جزیرے کو آج بھی دنیا بھر کے لیے روشنی کا مینار بنا رکھا ہے۔ اس ملک کی طاقت اس کے عوام ہیں۔ عام آدمی، مزدور اور کاشت کار۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو ذرا عوام کے حالات دیکھتے چلیں۔ ایک شاعر کے لیے مزدوروں کی بات کرنا اچھا نہیں لگتا کبھی تم ادیبوں اور ادب کی بات کرو ایلیٹ صاحب اور سی ڈے لوئس سے ملاقات کا حال سناؤ رائل سوسائٹی آف لٹریچر کے قصے بیان کرو تاکہ پاکستان کے ترسے ہوئے اساتذہ اور متحیر طالب علم اور سب سے بڑھ کر طبقۂ افسران تمھیں کسی قدر عزت کی نظر سے دیکھے۔ گو اس کا بھی یقین نہیں۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ انگریزی کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور میں ان سے مل چکا ہوں اور کئی بار اور ملا ہوں۔ میں نے ان سے عام مداحوں کی طرح انٹرویو نہیں لیا بلکہ ایک گھپلے میں نیاز حاصل کر لیا اور ایسے کہ وہ اب خود توجہ فرمانے لگے ہیں مگر ٹی ایس ایلیٹ انگلستانی نہیں ہیں وہ ایک بڑے شاعر ہیں اور کہیں کے بھی شہری ہو سکتے تھے۔ یوں بھی امریکی نژاد ہیں اور انگریز اور امریکی نقاد آج تک اس بات پر جھگڑتے ہیں کہ ایلیٹ انگلستانی ادیب ہیں یا امریکی۔ تو فی الحال ان نقادوں کو جھگڑنے دیجیے اور میرے

ساتھ انگلستان کے عوام سے میل جول بڑھائیے۔

انگلستان پر آسودگی طوفان کی طرح آئی ہے۔ مکھن اور انڈے بغیر ہفتوں پہ ہفتے گزار دینے کا زمانہ ختم ہوگیا۔ راشن واشن جیسی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

امریکی قرض بھی ادا ہوگیا؟ جی ہاں بالکل ادا ہوگیا اور ہندوستان پاکستان جنگ والا قرض بھی۔ کیا سمجھے آپ۔ ان بڑھیا میم صاحبہ نے جن کا ذکر میں نے کیا اور جن کے ذکر پر عظیم ادیبوں نے ان کا اور میرا مذاق اڑایا ہوگا۔ اور اس پولیس کانسٹبل بابی مخلص نے جسے آپ صرف پولیس والا کہہ کر ٹال رہے ہوں گے، ان دونوں نے مل کر امریکہ کے کروڑوں ڈالر مع سود ادا کر دیئے ہیں جب کہ آپ اور آپ کے عظیم ادیب اور غزل گو اور نظم گو اور ناول نویس اور حکام اور سیاست دان قرض لیے جاتے ہیں۔

قرض پر قرض بڑھاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے

آج انگلستان میں سب لوگوں کے لیے کام موجود ہے۔ یہاں تک کہ باہر والوں کے لیے بھی جبھی باہر والے اور بطور خاص "دولت مشترکہ" کے محنت کش لاکھوں کی تعداد میں ادھر چلے آتے ہیں۔ میرے بزرگ گائیڈ ڈیوڈ صاحب برا مانتے ہیں تو مانتے رہیں۔

خریداری کا ایک نیا رواج امریکہ سے آیا ہے۔ یعنی قسط وار خرید۔ جسے پاکستان کے "پڑھے لکھے" لوگ ہائر پرچیز کہیں گے۔ قسطیں آسان ہیں۔ کیوں کہ سود لگتا ہے۔ بہرحال سود یا منافع تو غیر اشتراکی اقتصادی نظام کی بنیاد ہے۔ اس بحث کو چھوڑیئے دیکھنا یہ ہے کہ کوئی چیز عام آدمی سے دور نہیں۔ قسطیں طویل المیعاد ہوتی ہیں، اس لیے ایک دم جیب پر بوجھ بھی نہیں پڑتا۔ مکان، موٹر، موٹر سائیکل، ریڈیو سیٹ، ٹیلی ویژن سٹ، کپڑے، سلے سلائے سوٹ اور ۔۔ اور ۔۔ خاتون بھی۔ شاید آپ مکان موٹر اور سوٹوں میں دل چسپی نہ رکھتے ہوں۔ اور آخری چیز کے بارے میں زیادہ جاننا چاہیں۔ ایک عام برطانوی خاتون بڑا جڑھاوا انہیں مانگتی نہ مہر مانگتی ہے نہ زیور۔ بس آپ کو اس سے قسط وار ملنا پڑتا ہے اور یوں خرچ قسط وار ہوتا ہے۔ وہ بھی دن بھر مصروف رہتی ہے۔ پڑھتی ہے یا کہیں ملازمت کرتی ہے۔ آپ بھی پڑھتے ہیں یا ملازمت کرتے ہیں (خیر پڑھتے وڑتے تو کیا ہیں آپ لوگ بس ملازمت کرتے ہیں) چنانچہ ملاقات عام شاموں کو ذرا کی ہو سکتی ہے۔ دونوں تھکے ہوئے ہیں گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہاں ہفتے اور اتوار کے روز، روز عید ہوتے ہیں کیوں کہ برطانیہ میں کام کا ہفتہ پانچ دن کا ہوتا ہے ہماری طرح ساڑھے پانچ دن کا نہیں ہوتا بلکہ پورے ہفتے اور پورے اتوار کی چھٹی ملتی ہے اور تنخواہ پورے ہفتے کی اور وہ بھی جمعے کی صبح کو مل جاتی ہے۔ لے پیارے پگار سنبھال ۔۔۔

کر کلرک کی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا

بس پاکستان کا کلرک سوکھ جاتا ہے اور وہاں کا کلرک پھول جاتا ہے۔ پھولا پھولا وہ اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شالامار باغ آف کشمیر جیسے ہزارہا عیش کوشی والے مقامات پر جا سکتا ہے۔ ناچ گھر، سوئمنگ پول، تھیٹر، عجائب خانے، نوابوں کے محلات، ساحلی سیر گاہیں۔ کیوں کہ رسل و رسائل کے ذرائع عام ہیں اور کرائے سستے ہیں۔ اس پروگرام اور اس انتظام کو ڈیٹ کرنا کہتے ہیں۔ یعنی تاریخ محبت مقرر کرنا۔ یہ ڈیٹ عام طور پر سستا نسخہ ہوتی ہے۔ اور عاشق و معشوق خرچ میں تقریباً برابر کے حصے دار ہوتے ہیں۔ اگر محبوب کی مارکیٹ بہت ہے یعنی اس کے چاہنے والے کئی ہیں تو عاشق کو بھی داری دکھانی پڑتی ہے اور کرایہ ٹکٹ کھانا سب اس کے ذمے ہو جاتا ہے۔ سو وہ بھی کیا۔ چار چھ شلنگ فی کس کھانا کھایا۔ پانچ سات شلنگ فی کس ٹکٹ لیا۔ دو ڈھائی شلنگ سواری میں نکل گئے۔ ڈیڑھ دو پونڈ کا نسخہ ہوا۔ اب دو پونڈ اور بہت بڑھے تو چار پونڈ فی ہفتے کی قسطیں چلیں تو عام طور پر چوتھے ہفتے تک:

عاشقی قید شریعت میں چلی آتی ہے

برطانیہ کی سب سے بڑی نعمت، دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے، قومی انشورنس اسکیم۔ یہ پروگرام انگریز کی سب سے بڑی عظمت ہے۔ سب سے بڑا نشان امتیاز۔ اس کے تحت انگلستان کا ہر شہری بیماری سے پیدا شدہ مالی مصیبتوں سے محفوظ ہو گیا ہے۔ یہ اسکیم لازمی ہے۔ اختیاری نہیں یعنی سب کے لیے ہے اور پیدائش سے موت تک ہر قسم کا علاج ہر سطح کا علاج مفت ہوتا ہے۔ عام گھٹیا سول اسپتال والا علاج نہیں جہاں جنرل وارڈ کے لوگ ڈاکٹر اور نرسوں کے جوتے کھاتے ہوں۔ بلکہ اعلیٰ ترین علاج، بہترین علاج، مساوی علاج۔ واضح رہے کہ یہ اسکیم امریکہ تک میں رائج نہیں ہے مگر خیر وہ اور کہانی ہے۔ ٹیکس یہ لوگ بھی دیتے ہیں اور ہم لوگ بھی دنیا کے سارے کمانے والے ٹیکس دیتے ہیں۔ سوال ٹیکس کے استعمال کا ہے۔ یہ قومی انشورنس اسکیم کیوں ہے، کیا ہے، بس یہ بتانا ظلم ہو گا۔ دانشور لوگ پہلے ہی خفا ہیں اور خفا ہو جائیں گے۔ کیونکہ موت تو آنی ہی ہے۔ یہ اسکیم بھی موت کو نہیں روک سکتی۔ اس لیے اس کے ذکر سے کیا فائدہ۔ ارے میاں یہی کہو گے کہ یہ اسکیم برطانیہ کی اقتصادی منصوبہ بندی کا ایک جزو ہے۔ اچھا پھر۔ اقتصادیات کا دانشوری سے کیا تعلق۔ نان سنس۔ ارے میاں لسان الغیب حافظ شیراز کا مطلع سنو:

درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحیٔ مئے ناب و سفینۂ غزل است

ہائے کیا مطلع فرما گئے ہیں۔ اقتصادیات کا انسانی مسرتوں اور لذتوں سے کیا واسطہ بس آدمی کو محاورہ صحیح بولنا چاہیے اور وہ بھی لکھنؤ کا ہو یا دلی کا۔ اور پان کھانا چاہیے قوام والا پان جس پر چاندی کے ورق لپٹے ہوئے ہوں۔ اور روز تیس چالیس پیالیاں چائے کی اور عمدہ سگریٹ، عمدہ نہ ملے تو بگلے کا سہی یا بیڑی ہی سہی۔ بیڑی میں کیا برائی ہے۔ اور پھر چاہے طاعون سے مرو چاہے ملیریا سے چاہے سرطان سے۔ موت برحق ہے۔ موت آکر رہے گی۔ جینے والا جی کر رہے گا مرنے والا مر کر۔ اور یہ نیشنل انشورنس اسکیم وغیرہ سب بکواس ہے۔ یہ سب ایک مشینی سوسائٹی کے کھیل ہیں۔ خود علامہ اقبال فرما گئے ہیں:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ہاں کوئی بوڑھا بالا، کوئی بیوہ، کوئی کوڑھی، جذامی نظر آجائے تو کھٹ سے ایک نظم لکھ دو۔ اگر محتسب اجازت دے تو انقلابی نعرے اس میں شامل کر دو ورنہ ایمائیت اور اشاریت سے کام چلاؤ۔ جناب اردو زبان میں ہزاروں استعارے موجود ہیں۔ صیاد، گلچیں، صلیب۔ ایسی چیز مشاعروں میں بھی چلے گی اور ادب کی تاریخ میں بھی نام آئے گا کہ بھئی بڑا ترقی پسند لکھنے والا تھا۔ ۔۔۔ زمانے نے اس کے دل پر کیا کیا چرکے لگائے تھے۔ اب بتائیے اس ایک ٹکٹ میں سو نمبروں کے آگے آپ کی نیشنل انشورنس اسکیم پہ ہم اپنی آنکھیں کیوں پھوڑیں۔

بات تو یہ ہے ۱۹۵۹ء میں جب میں نے لندن نہیں دیکھا تھا تو گلڈ نے ایک اسکیم چلائی تھی ادیبوں کا انشورنس۔ ایک انشورنس کمپنی کو بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ کسی ادیب کا طبی معائنہ نہیں ہوگا۔ کسی کی عمر سامنے نہیں رکھی جائے گی۔ سب ادیب ہر عمر کے ہر قسم کے بیمار ایک دم انشور ہو گئے۔ موت پر پانچ ہزار روپے خواہ موت حادثے ہی میں واقع ہو۔ یہ آسانیاں خلاف روایات آسانیاں تھیں۔ یعنی ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک کاروباری کمپنی نے یہ رعایت دی ہو۔ پہلی قسط سب کی طرف سے گلڈ نے ادا کی۔ ڈھائی سو ادیبوں پر کوئی چودہ ہزار روپے۔ شرط صرف یہ تھی کہ ہر رکن پانچ روپے ماہوار دے گا یا ساٹھ روپے سال۔ اس اسکیم کا اطلاق سبھی پر ہوا۔ خوش حال کھاتے کماتے ادیبوں پر بھی اور مفلوک الحال ادیبوں پر بھی، مگر پانچ روپے ماہوار دینے والے تین فی صد نکلے "ابھی کون انشورنس کے چکر میں پڑے لاحول ولاقوۃ۔ اب پیغمبروں نے بھی بیمہ کرانا شروع کر دیا" ہر طرف سے آوازیں آئیں۔ اسکیم ایک سال چلی پھر فیل ہو گئی۔ اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ گلڈ کا کوئی رکن مر جاتا ہے تو گلڈ والے چپکے سے اس کے گھر والوں

کو ایک ہزار روپے گلڈ کی طرف سے پہنچا دیتے ہیں جو کب تک پہنچائیں گے اور باہمی جھگڑے الگ بڑھ جائیں گے۔

چلئے یہ جملہ معترضہ سہی۔ آئی ایم سوری اگین یعنی میں پھر معافی مانگ رہا ہوں۔ میرا کام ہے خطا آپ کا کام ہے عطا۔ برطانیہ کے ذکر میں وطن کی یاد پڑھے لکھے شرفا کا کام نہیں اور چوں کہ میں اپنا شمار پڑھے لکھے شرفا میں کرتا ہوں اس لیے مجھے اپنی اس گمراہی پر شرم ضرور آتی ہے مگر میں کیا کروں میری یادیں میرے روابط سات سمندر پار ایک ملک پاکستان ہی سے وابستہ ہیں۔ جہاں میرے بچے، اور دوستوں، اور عزیزوں اور سب ہم وطنوں کے بچے ایک مستقبل کے انتظار میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ وہ مستقبل جس کا وعدہ سب حاکم سب سیاسی لیڈر، سب افسر، سب استاد کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے نہ جانے کب تک۔

جھلکیاں اور غربت

چلئے جلدی جلدی لندن کے بارے میں کچھ دل چسپ اور کچھ غیر دل چسپ اعداد و شمار سے گزر جائیے کیونکہ لمحہ بھر میں دوچار بہت سخت مقام آنے والے ہیں۔

کہنے کو لندن صرف ایک شہر کا نام ہے جس کا کل رقبہ سات سو بائیس ایکڑ ہے اور آبادی اسی لاکھ سے زیادہ۔ لیکن اصل میں یہ علاقہ شہر لندن اور اس سے ملحقہ چھوٹے چھوٹے ضلعوں (کاونٹی) کا مجموعہ ہے۔ کل ملا کر اس میں اٹھائیس ہو گئے ہیں۔ لندن کے ساتھ لفظ پرگنہ استعمال کرنے پر میں ان پاکستانی انگریزوں سے بہت شرمندہ ہوں جو پاکستان کی ٹے کو بھی ٹے بولتے ہیں اور سڑک کے لیے روڈ بولنا حکومت کی نشانی جانتے ہیں۔ ایک انگریزی لفظ ہے برو BOROUGH اور لندن میں اٹھائیس برو شامل ہیں۔ میں نے ابن انشا سے پوچھ کر اس کا ترجمہ پرگنہ کر دیا ہے اور اب یہ لفظ استعمال ہو گیا تو مجھے انگریزی پرستوں کی کوفت کا خیال کر کے ایک شیطانی خوشی ہو رہی ہے۔

بچپن میں پڑھا تھا کہ دلی جمنا کے کنارے واقع ہے یا لاہور راوی کے کنارے واقع ہے کیوں کہ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ضابطے قاعدے کا میر تقی میر نما شہر چپ چاپ ایک دریا کے کنارے کنارے بستا چلا گیا ہے۔ اس تصور میں کتنا سکون تھا اور اس بیان میں کتنی آسانی ہوتی تھی۔ مگر افسوس کہ اب بڑا گھپلا ہو گیا ہے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ دریائے ٹیمز لندن کے بیچ میں بہتا تھا، جیسے دریائے دجلہ بغداد کے بیچ میں سے بہتا ہے یا دریائے نیل قاہرہ کے بیچ میں سے بہتا ہے۔ یہاں تو دریا اور شہر میں سخت جھگڑا ہے۔ کبھی دریا ضرور اس کے کنارے یا بعد میں صرف بیچ میں بہتا ہو گا مگر اب کہیں لندن دریا کے ادھر ہے، کہیں بیچ میں ہے، کہیں نیچے ہے۔ کنارے و نارے کبھی کے ختم ہو گئے۔ ہائے اردو گیتوں کی رس بھری شاعری:

ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

اب تو کنارے دس دس قدم بعد پلوں کے شانوں پر سوار ہو کر ایک دوسرے کو چومتے ہیں۔ اور لندن میں تو بہت سے مقامات پر دریا پار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ خود دریا بے چارہ زمین کے اوپر سمٹ سمٹ کر رہ جاتا ہے اور آپ زیر زمین ریل کے ذریعے دھرتی کا سینہ چیرتے ہوئے ادھر سے ادھر پہنچ جاتے ہیں۔ چیرنگ کراس سے واٹرلو اسٹیشن۔ نیوچیپل سے سرے ڈاکس۔ پکاڈلی سے کینسنگٹن۔ بیسیوں مقامات کو زیر زمین ریل دریائے ٹیمز کے نیچے سے گزرتی ہوئی ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ یہ ریل پچاس ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے اور کہیں کہیں سطح زمین سے دو دو سو تین تین سو فٹ نیچے چلتی ہے اسٹیشن وسیع مضبوط اور آرام دہ۔ ایک پوری دنیا ہے جو زیر زمین آباد ہے اور متحرک بھی ہے اس زیر زمین ریلوں کے نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص جو معمولی سی انگریزی جانتا ہو وہ کھو نہیں سکتا۔ ہر اسٹیشن کے ہر پلیٹ فارم پر ہر ریل کے ہر ڈبے میں جلی اور رنگ دار خطوط اور الفاظ میں ہر منزل کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اگر آپ انگریزی حروف جانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ آپ کو کہاں جانا ہے تو آپ منزل مقصود پر زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ آدھا گھنٹہ بہت بڑی بات ہے اور طویل ترین فاصلے کو مدنظر رکھ کر کہا گیا ہے ورنہ اصلیت یہ ہے کہ اسٹیشن پر ریل ایک ایک منٹ بعد آتی ہے۔ اس کے دروازے آپ ہی آپ کھل جاتے ہیں۔ اور پندرہ یا بیس سیکنڈ بعد بند ہو جاتے ہیں اور وہ ایک دم انتہائی تیز رفتار سے روانہ ہو جاتی ہے۔ زمین کے نیچے لائنوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ سڑکوں کے پیچ، عمارات کی رکاوٹیں، ٹریفک کی پابندیاں سب غائب اور کرایہ بس جیسا، بلکہ اس سے بھی سستا (گو لندن والے ہمیشہ اس کرائے کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں) مثلاً آکسفورڈ سرکس سے پکاڈلی سرکس ایک میل ہو گا۔ کرایہ تین پنس۔ میرے کوئنس وے اسٹیشن سے ہوبورن کے چھ پنس۔ ہوبورن بی بی سی کا قریب ترین اسٹیشن ہے جہاں کئی پاکستانی ادیب اور ادیب نما حضرات مجھ جیسے ضرورت مندوں کی مشکل کشائی کے لیے موجود رہتے ہیں۔

میں ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑا ہوں۔ وہ دس یا بارہ منزلہ عمارت ہے۔ کوئی دکان ہے یا دفتروں کا علاقہ۔ اس کی عین بغل میں ایک دروازہ ہے جس پر ایک نام جلی حرفوں میں لکھا ہے مثلاً آکسفورڈ سرکس، بینک، پیڈنگٹن وغیرہ۔ اس نام کے گرد یا اس کے ادھر ایک بڑا سا دائرہ بنا ہوا ہے سرخ رنگ کا اور اس پر نیلی پٹی پڑی ہے۔ کچھ ایسے:

UNDERGROUND

یہ زیرزمین اسٹیشن کی نشانی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک نئی دنیا نظر آتی ہے سامنے خودکار مشینیں نصب ہیں ان پر نمایاں طور سے فہرست کرایہ درج ہے، اور اس طرح کہ جس اسٹیشن پر آپ کھڑے ہیں وہاں سے لندن کے ہر اسٹیشن کا کرایہ لمحہ بھر میں معلوم ہو جاتا ہے۔ خودکار مشین میں مطلوبہ رقم ڈالیے ٹکٹ کھٹ سے باہر نکل آئے گا۔ جاتے وقت پڑتال نہیں ہوتی۔ ریل پہ ریل بدلیے، تمام پلیٹ فارم دیکھ ڈالیے اور تمام ریلوں میں

برگ درختان سبز

اور

ہر ورقے دفتریست

مگر یہ پیرس نہیں ہے جہاں ایک ٹکٹ میں کہیں سے کہیں چلے جاؤ کوئی پابندی نہیں ہے۔ پیرس فرانس میں ہے۔ دریا دل خوش باش لوگوں کا ملک۔ یہ بنیوں کا ملک ہے، ہر فاصلے کی قیمت مقرر ہے۔ آپ کے ٹکٹ پر لکھا ہوا ہے کہ کس اسٹیشن سے چلے، اب اگر مقررہ فاصلے سے آگے کسی اسٹیشن پر اتر گئے تو ادھر ایک خرانٹ انگریز یا بدمزاج حبشن ٹکٹ چیکر سے واسطہ پڑے گا اور پورا کرایہ وصول کر لیا جائے گا۔

ریل میں بلکہ بس میں بھی مزے کی بات یہ ہے کہ مرد لوگ خواتین کے لیے کھڑے نہیں ہوتے۔ ڈبے میں دو رویہ نشستیں ہوتی ہیں اور چھت میں سے سیکڑوں موٹی موٹی زنجیریں لٹکتی ہیں، مصروف اوقات میں جب بھیڑ ہوتی ہے تو مسافر اور مسافرات زنجیریں پکڑے کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی مائی کا لال اٹھ کر اپنی نشست کسی خاتون کو پیش نہیں کرتا۔ تف ہے۔ میاں جمیل الدین صاحب کہ شاعر غزل کے ہو اور عالی تخلص کرتے ہو، تم بھی ولایت کے رنگ میں رنگ گئے، کیسے کیسے نازک اندام، سروقامت آہو چشم زنجیریں پکڑے کھڑے ہیں۔ بعض کے دوسرے ہاتھ میں بوجھل سامان ہے۔ بیگ، اخبار اور روزمرہ کا سامان خور و نوش۔ سروقد بوجھ سے ایک طرف جھکا جا رہا ہے دوسری طرف ہاتھ سے زنجیر پھسلی جاتی ہے اور تم اپنے ذوق جمالیات اور اپنے دعوائے فن کو چھپر پر رکھے اپنی آنکھیں بند کیے آرام سے اپنی نشست پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہو گویا تمہارے سامنے یہ طوفان رنگ و بو نہیں بلکہ لکڑی کی بے جان مورتیں ہیں۔

"آپئے تشریف رکھیے" ایک بار میں ضبط نہ کر سکا اور اپنی نشست چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ بڑی خاص چیز تھی۔

"نو تھینک یو" خاص چیز نے تقریباً ڈانٹ دیا اور میری طرف دوسری نظر ڈالے بغیر ایک جھٹکے

سے گردن دوسری طرف موڑلی۔

پھر ایک ناصح نے سمجھایا کہ بڑی بوڑھیوں کی بات تو اور ہے اگر کسی "نوعمر" خاتون کو اپنی نشست پیش کی جائے تو وہ اسے آپ کے اخلاق پر نہیں بلکہ ہذیتی پر محمول کرتی ہے، کیوں کہ یہاں کاروباری یعنی روزمرہ کے معاملات میں عورت مرد میں کوئی امتیاز نہیں۔ وہ بھی کام کرتی ہے آپ بھی کام کرتے ہیں۔ دونوں مزدور ہیں، دونوں کام پر جا رہے ہیں یا کام سے آرہے ہیں، اس میں رورعایت کا کیا سوال ہے۔ کبھی تم بھی تو جھکے ہوئے ہو کھڑے کھڑے گئے تو گویا پندرہ بیس منٹ کی ایک اور مشقت پڑ گئی جب کہ تنخواہ اسے برابر کی بلکہ بعض اوقات تم سے زیادہ ملتی ہے، سمجھے بھائی صاحب۔

سمجھ گیا یہ مشینی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے مگر بھائی میں مشرقی ہوں! اور جانتا نہیں کہ
میخانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں

ایک دن میں حسب معمول صبح "کام پر" روانہ ہوا۔ اوقات کار میں عام طور پر سب لوگ زیر زمین ریل سے جاتے ہیں کیونکہ موٹر میں رستہ دیر سے طے ہوتا ہے۔ انگریز امرا و زرا سب اسی ریل سے چلتے ہیں اور اس وقت سخت بھیڑ ہوتی ہے کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اس ہنگامے میں سرو قدی، نازک اندامی، آہو چشمی، گل بدنی کسی کام نہیں آتی بڑے بڑے "تازہ گلاب روند دیے جاتے ہیں۔ دوڑ بھاگ کر میں نے ایک نشست پر قبضہ جما لیا۔ بیٹھ کر ٹوپی سیدھی کی۔ مفلر درست کیا ادھر نظر اٹھائی تو ایک صاحب ایک ہاتھ میں اخبار سنبھالتے اور دوسرے ہاتھ سے زنجیر پکڑے تیز چلتی گاڑی میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف نظر آئے۔

وہ صاحب ہمارے سابق صدر اسکندر مرزا تھے۔

میں حکومت پاکستان کا ایک معمولی سا افسر، ایک معمولی شہری، ایک معمولی آدمی، میں ایک نشست پر آرام سے بیٹھا ہوں اور ایک وقت میں پاکستان کا سب سے بڑا آدمی، مرد آہن، اہل اختیار حاکم اعلیٰ جنرل اسکندر مرزا میرے برابر نشست کے بغیر کھڑا ہوا ہے۔ نہ اس ریل کے سامنے چار موٹر سائیکلیں پھٹ پھٹ کرتی ہوئی جا رہی ہیں نہ حفاظتی جیپوں اور موٹروں کے دستے ہیں نہ فوجی اور پولیس اور انتظامیہ کے افسران کا حلقہ ہے۔ نہ آس پاس کوئی اے ڈی سی ہے نہ کوئی وزیر ہے نہ امیر ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار
(اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو)

جب سابق صدر اسکندر مرزا صدر مملکت تھے اور صبح شام ان کے ماتحت اور متوسلین اور خوشامدی

اور اہلِ غرض ان کی دانش مندی، ان کی عظمت، ان کے تدبر، ان کی طاقت اور ان کی بڑائی کا ذکر کرتے ہوں گے تو کیا کبھی ان کو خیال بھی آیا ہو گا کہ وہ چار موٹر سائیکلوں والے پائلٹ، وہ زن زن کرتی جیپیں وہ طبل و علم، وہ برق و ترنا، وہ "مخلصین" وہ مداحین سب کے سب آن واحد میں غائب ہو جائیں گے اور انھیں لندن کی زیرِ زمین ریل میں مجھ جیسے دو آنے والے لوگوں کے ساتھ سفر کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں یہ خیال تک نہ آیا ہو گا۔ ایسے احساسات کے اہل صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی آنکھیں حال کے باغوں کے علاوہ ماضی کے ویرانوں اور مستقبل کے دھندلکوں پر بھی پڑتی رہیں، جو لوگ ایسے ہوتے ہیں وہ کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔

صدر اسکندر مرزا کھڑے ہیں اور میں بیٹھا ہوں، میں جم کر رہ گیا ہوں۔ نہ مڑ سکتا ہوں نہ اٹھ سکتا ہوں، میری پلک تک نہیں جھپک سکتی۔ میری آنکھوں میں سنہ انیس سو ستاون کی ایک تصویر گھوم جاتی ہے۔ جب وہ انکم ٹیکس سروس کے ایک عشائیے میں مہمانِ خصوصی ہو کر آئے تھے۔ ہم نے بیچ لگژری ہوٹل میں دروازے سے آخری حد تک سرخ بانات بچھائی تھی، قومی ترانہ بجایا تھا۔ ان کی قطار استقبال میں تقدیم و تاخیر پر ہم لوگوں میں کیسی کیسی تلواریں چل چکی تھیں اور جب مجھے خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کے لیے چنا گیا تھا تو کیسے کیسے اچھے ساتھی مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس تصویر میں میرے چہرے، میری آنکھوں، میرے پورے وجود پر کیسی خاکساری، کیسی لجاجت، کیسی فروتنی چھائی ہوئی ہے اور ان کے ایک ایک انداز سے کتنی خود اعتمادی، کتنا اطمینان ہویدا ہے۔ میں انھیں کچھ پیش کر رہا ہوں، دست بستہ، خمیدہ، تصویرِ عجز و نیاز۔

اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو

مگر زندگی شاید عبرت سے زیادہ طاقت ور ہے، لمحہ بھر میں اسے چبا کر ہضم کر جاتی ہے، اس فلسفہ نویسی سے کوئی فائدہ نہیں پیارے، اپنے کام کا دھیان رکھ، اپنے مفادات دیکھ، ورنہ اب بے وقوف کہلاتا ہے۔ بعد میں ناکارہ و ناقابل، بوگس کہلائے گا۔ اب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ میرے دل میں ان کے لیے ذرا سی بھی محبت نہیں محسوس ہوئی۔ ایک خلا تھا جس میں ان کے کسی کام، کسی قول، کسی تحریک کی ایک جھلک بھی نظر نہ آئی۔ میں نے جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا چاہا۔ مگر شروع ہونے سے پہلے ایک دم سارا اخبار سپاٹ ہو گیا۔ سب لفظ غائب ہو گئے اور سارے صفحے پر صرف ایک لفظ نظر آیا "پاکستان"

بہر حال یہ صاحب میرے ملک کے سربراہ رہ چکے ہیں، ان کے لیے قومی ترانہ بجتا تھا، یہ میرے ملک کے شخصِ اوّل تھے۔ یہ پاکستان کی علامت تھے۔ صدر۔ سربراہ۔

میں ایک دم بجلی کی طرح حرکت میں آگیا۔" آپ یہاں تشریف رکھیے جناب والا" میں نے اردو میں کہا۔

" شکریہ" وہ بولے " میں ٹھیک ہوں"

" نہیں جناب آپ یہاں تشریف رکھیے"۔ میری صورت شاید ویسی ہی ہوگئی تھی جو انھیں سنہ انیس سو ستاون میں خطبہ استقبالیہ پیش کرتے وقت تھی وہ بیٹھ گئے۔

" آپ کا نام کیا ہے۔ کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟" انھوں نے انگریزی میں پوچھا۔

" آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

مادرِ پارلیمان ۔ پیٹی کوٹ لین اور سوہو

"کسی ملک کی رعایا کو اس قدر آزادی اور اس قدر حقوق حاصل نہیں ہیں جیسے انگلستان کی رعایا کو حاصل ہیں اور وہاں اگرچہ ایک بادشاہ مانا جاتا ہے لیکن اس کے اختیارات کی وہ کیفیت نہیں ہے جیسے آپ صاحبوں کے خیال میں سمائی ہوئی ہو گی اور جیسے ایشیا کے بادشاہوں کی کیفیت تھی جن کو یہ اختیار تھا کہ جس شخص کی نسبت جو حکم چاہیں دے دیں جس کام میں جس قدر چاہیں خزانہ صرف کر دیں۔ انگلستان کے بادشاہ کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ یہاں بادشاہ کے اختیارات محدود ہیں اور تمام قوانین جن پر سلطنت کی کل کارروائی منحصر ہوتی ہے رعایا کی منظوری کے بعد جاری ہوتے ہیں۔ بادشاہ کو ہرگز یہ اختیار نہیں ہے کہ سلطنت کے خزانے کو اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے صرف کرے۔"

مگر اے محتسب صاحبان یہ تحریر اس بندۂ عاجز یعنی مصنف سفرنامہ ہذا کی نہیں ہے بلکہ جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سید احمد خان بہادر کے سفرنامے سے نقل کی ہے۔ اصل میں یہ ان کے ان خطوط کا ایک حصہ ہے جو وہ اپنے دوران قیام لندن میں علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے رسالے میں چھپوایا کرتے تھے۔ سر سید بڑے آدمی تھے۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں، ان کے دل میں اپنے وطن اور قوم کی محبت اتنی تھی کہ وہ یورپ کی ہر اچھی بات دیکھ کر کڑھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اچھی بات وہ خوبی ان کے ملک میں بھی پیدا ہو جائے۔ ان کی حب الوطنی اور دل سوزی ان کے خطوط میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔

مگر ــ میں چھوٹا آدمی ہوں۔ چھوٹا منہ چھوٹی بات ہیں برٹش پارلیمنٹ میں گھنٹوں بیٹھا ایک ہی بات سوچتا رہتا ہوں۔ سامنے اعلیٰ سے اعلیٰ مقرر بڑے بڑے اہم مسائل پر نہایت پُر مغز تقریریں کرتے ہیں اور میرے ہندوستانی پاکستانی ساتھی ابھی پارلیمانی تربیت کے لیے موقع بہ موقع یادداشتیں بھی تحریر کرتے جاتے ہیں۔ لیکن میرے دماغ سے وہ بات نہیں نکلتی۔ مجھے ان کے شاندار اور خوب صورت الفاظ بے معنی

اوران کا جوش وخروش بندروں کی چیخ پکار سے زیادہ نہیں لگتا۔ وہ بات یہ ہے کہ یہ سالے تمام آزادیاں اور تمام جمہوری اقدار صرف اپنے لیے کیوں جائز سمجھتے ہیں اور باقی تمام "کمزور" دنیا کے لیے ان کا مطمح نظر مختلف کیوں ہے۔ وہ برٹش پارلیمنٹ جسے ۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خان نے ملاحظہ کیا۔ اپنے عوام کے اپنے حقوق قانون سازی کی کتنی مدافعت کرتی تھی۔ لیکن اسی پارلیمنٹ نے پورے ہندوستان اور آدھے افریقہ اور ممالک بحرالکاہل اور ممالک مشرق بعید کو غلام بنا رکھا تھا اور ان کے خزانے ان کے وسائل بے دریغ اپنی مرضی سے خرچ کرائی تھی اور وہی پارلیمنٹ اب بھی جو کچھ مقبوضات باقی رہ گئے ہیں انھیں چھوڑنے کی تحریک از خود نہیں کرتی بلکہ جب ماؤ ماؤ کی تحریک آزادی ہزاروں دوسرے روپ دھار کر انگریزی قبضہ ناممکن بنا دے گی تو یار لوگ مجبوراً دم دبا کر بھاگ لیں گے اور کہیں گے کہ ہم نوآبادیوں کو تربیت دے کر رخصت ہوا کرتے ہیں اور ہانگ کانگ ابھی خود مختار ہونے کا اہل نہیں ہے۔

یہ برٹش پارلیمنٹ وہ ہے جس کے ضوابط کی مثالیں ہماری اور دوسری نوآزاد قوموں کی پارلیمنٹوں میں آج بھی دی جاتی ہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے پارلیمانی ماہرین تو مشکل مسائل میں وہاں کے حوالے بھی ایسے فخر و ناز سے دیتے ہیں گویا کوئی پورا پہاڑ ایک تیر مار کر چھید دیا ہو۔ سچ ہے انگریز کا زہر اپنے سابق غلاموں کی رگ رگ میں اس طرح رچا ہوا ہے کہ اس کا اثر کئی نسلوں تک رہے گا۔ میں ان پارلیمانی ماہرین سے معافی چاہتا ہوں۔ ان کا علم و فضل اپنی جگہ آخر انھیں بھی روٹی کمانی ہے۔ دھونس جمانی ہے۔ لیڈری کرنی ہے اور کسی نہ کسی قسم کی پاکستانی پارلیمنٹ میں جا کر برطانوی طرز کی پارلیمانیت بگھارنی ہے۔ سو میں ان سے معافی چاہوں گا۔ لیکن پرنالہ کہاں گرے گا یہ بات طے کرنے کی ہے۔

ہاں یوں میں آپ کو ان عمارات کی تعداد، ان کے فرنیچر کا حال، ان کے برآمدوں، غلام گردشوں، کتب خانوں کی تفصیل کتاب میں دیکھ کر فوراً بتا سکتا ہوں۔ برٹش پارلیمنٹ کے لیے بہت سی گائیڈ کتابیں مل جاتی ہیں۔ کئی تاریخیں بھی ہیں جنھیں انگریز "جمہوریت پسند" علما نے بڑی محبت اور محنت سے لکھا ہے۔ دو چار میں نے بھی پڑھیں۔ مگر کہیں کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ آزادی کا قلعہ، یہ جمہوریت کا ضامن ادارہ، یہ مادر پارلیمان آخر صدیوں تک ایشیائیوں اور افریقیوں پر ناجائز قبضہ، استبداد، ظلم، لوٹ کھسوٹ کیوں برداشت کرتا رہا۔ وہ پارلیمنٹ جو انگلستان میں گوشت کی قیمتیں زیادہ ہونے پر حکومت بدل دیتی تھی اپنے اہل کاروں سے ایشیا میں انسانی گوشت کی بوٹیاں کیوں نچواتی رہی۔

یہ بھی نہیں کہ اس زمانے میں سب انگریز اندھے اور بہرے تھے اور کسی کو مقبوضات کی اصل خبر ہی

نہیں پہنچتی تھی۔ دور کیوں جایئے مشہور مقرر اور رکن پارلیمان برک کی مثال ہی سینئے۔ برک اٹھارویں صدی کا انگریز سیاست داں ہے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر قبضہ جما رہی ہے۔ شجاع الدولہ وزیر اودھ حافظ رحمت خان والی روہیل کھنڈ سے جنگ کرنے کے لیے لارڈ ہیسٹنگز سے چالیس لاکھ روپے نقد پر ایک انگریزی بریگیڈ کی خدمات حاصل کر کے روہیلوں کو تباہ کر دیتے ہیں اور اسی ہاؤس آف کامنز، اسی برٹش پارلیمنٹ میں برک کیا کہتا ہے۔

"اس نیلام کرنے والے ہیسٹنگز نے لڑائی کی کسی معقول وجہ کے بغیر شجاع الدولہ کے ہاتھ تمام روہیلہ قوم کا نیلام کر ڈالا، اور چالیس لاکھ روپے لے کر مخلوق خدا کو مکمل استحصال کے لیے بیچ ڈالا۔ ہماری طرف سے معاہدے کی پوری پوری پابندی کی گئی اور روہیلوں کے ممتاز ترین سردار اور اپنے عہد کے سب سے بہادر انسان حافظ رحمت خاں پر جو تمام ایشیا میں اپنی دلیری کی طرح اپنی اچھی شاعری میں بھی شہرت رکھتا تھا انگریزی بریگیڈ اور ایک لاکھ فوج سے حملہ کر دیا۔ اس کا سر کاٹ ڈالا گیا۔ حافظ رحمت خاں کی عظیم المرتبت بیوی اور بچے انگریزی کیمپ میں مٹھی بھر چاولوں کی بھیک مانگتے دیکھے گئے، پوری روہیلہ قوم چند ناقابل ذکر افراد کو چھوڑ کر ہلاک کر دی گئی، تمام ملک اجاڑ دیا گیا۔ اور وہ سرزمین جو مزدوروں کی حفاظت اور ایک عمدہ پیداواری منڈی تھی ایک ویرانے میں بدل گئی۔۔۔۔"

مگر اس تقریر، اس اطلاع پر مادر پارلیمان نے کیا کیا، کچھ بھی نہیں کیا بلکہ برک کو کھانے کی گھنٹی کا خطاب دیا گیا۔ یعنی جب یہ بیٹھا بولنے کھڑا ہو کھانا کھانے چل دو اور اس کے بعد ہندوستان کی مزید تسخیر، مزید مظالم، مزید استحصال کے قانون بناؤ، ممالک عرب کو کھا جاؤ، افریقہ اور امریکہ کے درمیان غلاموں کی تجارت کرو، دوسرے ملکوں کے جہازوں کو ڈبو دو، غیر ملکی منڈیاں قبضے میں کر لو یعنی برطانیہ کا ہر فرد آزادی کا حق دار ہے باقی دنیا کا ہر فرد غیر مہذب، وحشی، درندہ، جاہل اور غلامی کا مستحق۔

نو سر۔ یہ میری مادر پارلیمان نہیں ہے جہاں سنہ انیس سو بیالیس جیسے "ترقی یافتہ" زمانے میں بھی مسٹر ونسٹن چرچل کہتے ہیں کہ "میں برطانوی مقبوضات کا خاتمہ کرنے کے لیے وزیر اعظم نہیں بنا ہوں" اور اس "ہاؤس" کی عظیم اکثریت اس ظالمانہ بیان پر تڑتڑ تالیاں بجاتی ہے۔

نو سر۔ یہ میری مادر پارلیمان نہیں ہے۔ جو انیس سو چھپن جیسے دور حریت میں بھی نہر سوئیز پر فوجی حملہ کراتی ہے۔

نو سر، یہ میری مادر پارلیمان نہیں ہے جو آج تک ہانگ کانگ اور ویسٹ انڈیز کو غلام بنائے

ہوئے ہے۔ نو! نو! نو! میں اسے ایک جمہوری ادارہ نہیں مانتا۔ یہ ادارہ انگریز قوم کی اپنی حفاظت کا قلعہ ہے جہاں وہ اپنی حفاظت تو کرتی ہے مگر وہیں سے باقی تمام دنیا پر گولا باری کرتی ہے۔ اگر مجھ سے برطانوی پارلیمنٹ کے بارے میں کوئی ایک فقرے کا بیان چاہیے تو میں کم از کم یہ کہوں گا کہ:

"دنیا کو برطانوی پارلیمنٹ پر اس وقت تک شرم آنی چاہیئے جب تک تمام انگریزی مقبوضات آزاد نہیں ہو جاتے۔"

اب پاکستان میں عاشقانِ برطانیہ اور غلامانِ برطانیہ بُرا مانتے ہیں تو مان جائیں بلکہ اگر میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے سے بگاڑ بھی لیں،

ایذا رسانیوں کے بہلانے ہزار ہیں

اماں یار کس چکر میں پڑے ہو، کہیں سیکڑوں برس کا زنگ ایک مضمون، ایک تقریر، ایک کتاب، ایک آدھ نیم شبی سے اترتا ہے تم سے پہلے بڑے بڑے لوگ مولانا محمد علی جیسے لوگ یہی باتیں کہتے کہتے مر گئے۔ اور انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں ناکام سیاست داں کہلائے، تم تو یوں بھی کس کھیت کی مولی ہو، چلو کوئی لائٹ بات کرو۔ ہلکی پھلکی مزے دار بات۔

تو پھر اب پیٹی کوٹ لین چلیے۔

شکر ہے پیٹی کوٹ لین کا نام دیکھ کر یار لوگ اطمینان سے بیٹھے۔ آؤ یارو پیٹی کوٹ لین دیکھو یہ ایسٹ اینڈ میں واقع ہے، ایسٹ اینڈ کیا ہے، یوں سمجھیے کہ آج کا مشہور لندن تمام تر ویسٹ اینڈ ہے یعنی مغربی حصہ۔ ویسٹ اینڈ جہاں بڑے بازار، مشہور عمارتیں، پارلیمنٹ، بگ بین، لندن یونیورسٹی، برٹش میوزیم، غرضیکہ تمام مشہور لندن کا علاقہ ویسٹ اینڈ کہلاتا ہے اور نسبتاً مہنگا ہے۔ مشرقی حصہ ایسٹ اینڈ کہلاتا ہے۔ اگر آپ لندن میں کسی سے کہیں کہ میں ایسٹ اینڈ میں رہتا ہوں تو ہاتھ کھینچ لے گا کیونکہ ایسٹ اینڈ مزدوروں، غنڈوں، غریبوں کا علاقہ ہے۔ وہاں بول چال کا لہجہ بھی ویسٹ اینڈ کے لندن سے مختلف ہے۔ مکان گندے اور سستے، لوگ بد اخلاق، بے اعتبار اور بوگس، اور عورتیں۔ سبھی عورت، عورت میں کوئی فرق نہیں۔ ویسٹ اینڈ کی ہو، ایسٹ اینڈ کی ہو، لندن کی ہو، کراچی کی ہو، یا ٹوکیو کی۔ ایک تو بقول جوش ملیح آبادی:

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے جوانی گنگنائے گی ضرور

دوسرے یہ کہ ویدوں میں آیا ہے، مردوں مردوں میں ملک، قوم، ذات پات کے اعتبار سے فرق ہے، مگر عورت ذات میں کہیں کوئی فرق نہیں۔ خیر بات پیٹی کوٹ لین کی تھی۔ پتا نہیں اس جگہ کا نام پیٹی کوٹ لین کیوں ہے، شاید کبھی پیٹی کوٹ بکتے ہوں گے اب تو یہ خردہ فروشی کی ایک ناچتی گاتی چیختی چنگھاڑتی مارکیٹ ہے یعنی ہاٹ بازار، جہاں انگریزی، شائستگی، نستعلیقیت، آہستہ گوئی، میانہ روی سب کا بیڑا ہو گیا ہے۔ خیر،

ایک پہلو یہ بھی ہے انگریز کی تصویر کا

اس بازار میں آسانی سے تو آواز سنائی ہی نہیں دیتی، برابر کھڑے ہو کر بھی مخاطب کے کان میں چیخنا پڑتا ہے۔ خوانچے والے الگ چیختے ہیں، دکان دار الگ، اور چاروں طرف سے دلال اور سب کے بیچ میں گاہک۔ ویسٹ اینڈ کے مقابلے میں نرخ بہت کم ہیں اس لیے مقررہ الاؤنس پر گزارا کرنے والے غیر ملکی طلبہ بلکہ شرفا بھی چھپتے چھپاتے ادھر پہنچ جاتے ہیں۔ گرم کپڑے، جوتے، موزے، بنیان، شیشے کے ظروف، فرنیچر، کاٹ کباڑ، روزمرہ کے استعمال کی چیزیں سب کچھ موجود ہے اور چوری کا مال بھی۔ اور ہر دکان اور ہر مال کا نرخ الگ ہے۔ ویسٹ اینڈ جیسا نہیں کہ بس قیمتیں لکھی ہوئی ہیں مول تول نہ کیجیے۔ ابھی یہاں دس پونڈ کا بھاؤ بتائے گا اور ڈیڑھ پونڈ میں سودا کرے گا۔

"اٹس آگڈ ڈائے ٹوڈائے"

آپ سمجھے یہ کیا آواز ہے۔ معقول انگریزی میں یہ فقرہ یوں کہا جائے گا۔

اِٹ اِز اے گڈ ڈے ٹوڈے (آج کا دن اچھا ہے)

مگر یہ کاک نی لہجہ ہے کاک نی یعنی بازاری "آے ہٹو کیا فرنگی بھی بازاری ہوتے ہیں۔" جی ضرور ہوتے ہیں۔ ایسے ویسے نہیں بلکہ بہت زیادہ اور بدمعاش بھی ہوتے ہیں۔ خود انھی خطوط میں سرسید کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ دب کر لکھا ہے مگر سچ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

"اس میں بھی شک نہیں کہ لندن میں بدمعاش بھی پورے ہوتے ہیں جو کام وہاں کے بدمعاش کر گزرتے ہیں وہ اور کسی جگہ کے بدمعاشوں سے ممکن نہیں ہے۔"

ظاہر ہے کہ سرسید بلاد امریکہ تشریف نہیں لے گئے تھے ورنہ انگریز بدمعاشوں کو یہ درجۂ فوقیت عطا نہ کرتے، بہرحال انگریز بدمعاش پیٹی کوٹ لین میں بھی خاصی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے ایک سستا سا بٹوہ خریدا اور دکان کے آگے کھڑے ہو کر اپنے پاؤنڈ گنے مگر پاؤنڈ تو واسکٹ کے اندر قمیص کی جیب میں رکھ

لیے اور بٹوا ضابطے کے مطابق کوٹ کی جیب میں۔ چند قدم چلا اور پھر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا غائب تھا۔ اس متوقع تجربے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ کرکبھی بیان کردوں گا تو اپنا دل جھوٹ بولنے پر ملامت نہیں کرے گا۔

"ہے مسٹر۔ وانٹ اے کِک"۔ ایک مضبوط اور نو عمر لڑکی نے آنکھ مار کر کہی ماری پتا نہیں کِک یعنی لات کا ترجمہ کیا ہوتا ہے۔

"یس۔ وائی ناٹ" (ہاں کیوں نہیں)

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتی ہوئی برابر کی گلی میں لے گئی۔

گلی میں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا، چائے خانے میں کیبن بنے ہوئے تھے جیسے اپنے ہاں فیملی کیبن ہوتے ہیں۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی اور بٹوا نکال کر انجکشن کا سامان پھیلا دیا۔

"یہ کیا ہے"

"یہ ہیروئن ہے۔ کیا تم جانتے نہیں۔ تم وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئی"۔

"کتنے پیسے ہوں گے"

"اوہ یو فول۔ بندھا بندھایا نرخ ہے۔ ایک پاؤنڈ، چار گھنٹے نشہ رہے گا"۔

"نا، میں تو پانچ شلنگ دے سکتا ہوں"۔

"اوہ دیوا سٹوپڈ مین۔ پانچ شلنگ تو دلال ہی لے لیتا ہے۔ اچھا میں جاتی ہوں"۔

"اچھا دس شلنگ والا انجکشن لگا دو"۔

"اوکے۔ اوکے۔ جلدی کرو۔ پانچ شلنگ ریسٹوران والے کو بھی دینے ہوں گے نشہ ہلکا ہو گا"

"نہیں جی اس کو ہم تو ایک پینی بھی نہیں دیں گے" میں اٹھلایا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ساتھ مل کر چائے پی لیں اور باتیں کریں"۔

وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ "اوہ تمھیں نشہ نہیں چاہیے۔ اچھا وقت چاہیے۔ مگر یہ دن کا وقت ہے اور میں سخت مصروف ہوں۔ تم اپنا پتا بتاؤ میں رات کو پہنچ جاؤں گی۔ ہوٹل نہ ہو۔ مجھے ہوٹل میں نہیں آؤں گی اور پانچ پونڈوں کی سمجھے"۔

میں نے اپنے شہر ظہیر علی سابق نمائندہ جنگ وافسر نشر و اشاعت بی بی سی کا پتا دے دیا جو دوسرے دن مجھ پر بہت خفا ہوئے۔

یہ سوہو ہے، بارونق پکاڈلی سرکس میں ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو دائیں ہاتھ کو تنگ و تاریک گلیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سوہو کا علاقہ کہلاتا ہے، یہاں قانونی نائٹ کلبوں، جوئے خانوں، شراب خانوں کے علاوہ غیر قانونی عریاں خانے، جوئے خانے، قحبہ خانے اور مراکز جرائم کثرت سے ہیں۔ رات کو دس گیارہ بجے کے بعد تنہا ان گلیوں میں گھومنا موت کو دعوت دینا ہے، یوں ویسٹ انڈیز کے کالے بہت بدنام ہیں اور اخبارات میں عام طور پر انھی کے نام آتے ہیں مگر دلالوں کی زیادہ تعداد گوروں ہی پر مشتمل ہے کالے بھی اپنا کام چلا لیتے ہیں مگر بڑے جرم کی ہمت نہیں کر پاتے، اس کے لیے منصوبہ بندی اور بعد میں قانونی تحفظات کی ضرورت پیش آتی ہے جو بے چارے کالوں کے بس کی نہیں، وہ تو چھوٹی موٹی مار پیٹ، چاقو زنی، دھول دھپا کر لیتے ہیں۔ گورا صاحب منصوبہ بنا کر کام کرتا ہے، اگر کسی رات کو کوئی جانا بوجھا ایشیائی یا جنوبی امریکہ کا کوئی امیر کبیر عیاشی کے لیے سوہو آرہا ہے تو اس کی خبر پہلے ہی سے لگ جائے گی اور راتوں رات ایک نیا کلب کسی زمین دوز عمارت میں صرف اسی کے لیے آراستہ ہو جائے گا۔ وہ اور اس کے ساتھی ایک روشن، باقاعدہ کلب دیکھ کر آرام سے بیٹھیں گے۔ لڑکیاں شراب پلائیں گی۔ ننگا ناچ ہو گا۔ اور جب نشے کا زور بندھے گا کلب کے بیرے اور کارکن مسلح ڈاکوؤں میں بدل جائیں گے۔ اور دوسرے دن پتا چلے گا کہ اس نام کا کوئی کلب تھا ہی نہیں بلکہ سب کا سب تماشا ایک رات کا تھا۔

نشہ دینے والوں کے باقاعدہ گروہ ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکوں کو پہلے مفت اور پھر نہایت سستی قیمت پر نشے کی راہ لگا دیتے ہیں۔ ایک شلنگ میں ایک زوردار پانچ پونڈ والا انجکشن دے دیا اور وہ مزے میں آگیا۔ اوہو اتنا زبردست نشہ، صرف ایک شلنگ میں، پھر اسے عادت ہو گئی اور پھر وہ قبضے میں آگیا، اگر مقررہ وقت پر یعنی چار چار یا چھ چھ گھنٹے بعد انجکشن نہ لگے تو وہ مچھلی کی طرح تڑپتا ہے، سر پھوڑتا ہے اور بے حال ہو جاتا ہے۔ مگر وہ انوسٹمنٹ تھا، اب قیمت پوری ادا کرنی ہو گی، قرض لو، چوری کرو، ڈاکا مارو، یہاں تک کہ گروہ میں شامل ہو جاؤ۔

ہاں، یہ انوسٹمنٹ (INVESTMENT) کی کیا بات تھی۔ میاں ایسے موقعوں کے لیے انوسٹمنٹ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا، یہ بڑے لوگوں، بڑے ملکوں، بڑے معاملوں میں استعمال ہونے کا لفظ ہے۔ ذرا احتیاط رکھا کرو۔

"یہاں اعلیٰ ڈگریوں کے لیے بات کیجیے" ایک شاندار بورڈ لگا ہوا ہے، اگر پولیس پوچھے تو...

صاحب بتاتے ہیں کہ ہم ممبر ملکوں کے لیے تعلیمی گائیڈ کا کام کرتے ہیں، یعنی انھیں علوم وفنون اور جملہ مدارس، یونیورسٹیوں وغیرہ کی تعلیمی اطلاعات اور اخراجات کے تخمینے بنا کر دیتے ہیں. لیکن طالب حق کے لیے خاصا مواد موجود ہے. مثلاً:

ڈپلوما اِن فائن آرٹس ۔ فائن آرٹس انسٹی ٹیوٹ لندن ۔

یہ ڈپلوما ایک نہایت نفیس ودبیز کاغذ پر آٹھ دس بڑی بڑی مہروں اور تین چار عظیم الشان عہدے والے دستخطوں کے ساتھ آپ کو پانچ پونڈ کا مل جائے گا۔ اسی طرح جس مضمون کا ڈپلوما، ڈگری، سند، سرٹیفکیٹ چاہیے حاضر ہے. مال موجود نہیں تو تیار کرا دیا جاتا ہے بس قیمت کی بات ہے بیس پچیس پونڈ میں تو ڈاکٹریٹ قسم کی سند بھی مل جاتی ہے. آرام سے لندن میں سال دو سال کلرکی کیجیے یا ریلوے اسٹیشن پر مزدوری، اور گھر جاتے وقت تین چار سوٹوں کے ساتھ بیس پونڈ کی ایک ریشمی چمکتی ہوئی سنہرے پھندنوں میں بندھی ہوئی سند لے جائیے. حکومت یا یونیورسٹی مانے یا نہ مانے خاندان والے، ملنے جلنے والے، محلے والے ضرور مان لیں گے ۔ اور "وہ" بھی مان لے گی، بلکہ اپنے مشکوک باپ بھائی کو خودکشی کی دھمکی بھی دے دے گی، اور آپ کو کم از کم ایک اچھا دردبھرا افسانہ لکھنے کا موقع ضرور مل جائے گا۔

اسی طرح روز نئی نئی مالیاتی کمپنیاں بنتی اور بگڑتی ہیں، صرف دو سو پونڈ میں مکان بنانے کا وعدہ کر کے روپے اینٹھنے والے ادارے سیکڑوں ہزاروں ہیں ۔ یہ لوگ خریدار کو بنتے ہوئے گھر تک دکھا دیتے ہیں ۔ اور جب گھر بنانے والے راج مزدور منیجر کمپنی ہذا کو یس سر یس سر کہہ کر خطاب کریں تو خریدار کا دل بلیوں اچھلنے لگے گا۔ دو سو پونڈ نقد باقی علی الحساب۔ مکان آپ کا، علاقہ کمیٹی میں جا کر دیکھ لیجیے یہ زمین ہماری کمپنی کی ہے ۔

اور تین مہینے بعد کمپنی فیل، روپیہ ہضم، تماشا ختم۔

مگر اے ایمان والو تم اپنے سابق آقاؤں کی کس کس برائی کا ذکر برداشت کرو گے. ایک سابق غلام حال سیاح کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اب بھی انگریز قوم کی خوبیاں ہی خوبیاں بیان کیے جائے، ان کی تعلیم ایسی، ان کی تربیت ایسی، ان کی صفائی ستھرائی ایسی، ان کی یونیورسٹیاں بے مثال، ان کا علم لازوال.

بس مناسب یہ ہے کہ بدمعاش لندن کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور نیک معاش لندن کا رخ کیا جائے: کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

کچھ نرطریق غزالوں کے

"مادا موزیل کیا میں آپ کے ساتھ اس ناچ کی عزت حاصل کرسکتا ہوں"

"تھینک یو"

"کیا آپ بھی خالی نہیں ہیں مادا موزیل"

"میں خالی ہوں مگر مجھے آپ پسند نہیں آئے"

"اور آپ مادا موزیل"

"شکریہ۔ آیئے"

یہ میں نہیں تھا بلکہ میرے ایک تجربہ کار ساتھی تھے، وہ کئی برس سے لندن میں مقیم ہیں۔ بڑے گرگ باراں دیدہ، سرد و گرم چشیدہ بزرگ ہیں۔ یہ مقام ایسٹوریا ہے۔ ایسٹوریا جو ایسٹر اسکوائر کے پاس ایک عام ناچ گھر ہے۔ روس میں اسے عوامی ناچ گھر یا عوامی مرکز تفریح قسم کی چیز کہا جاتا ہے۔ ایک وسیع نیم تاریک زیر زمین ہال، داخلے کا ٹکٹ فقط ڈھائی شلنگ۔ ایک بینڈ برابر سستی تیز دھنیں بجائے جاتا ہے۔ شراب بند ہے، چائے کوکا کولا یعنی بے الکحل کے مشروبات ملتے ہیں۔ ڈھائی شلنگ والے لڑکے لڑکیاں، ہر رنگ، ہر قسم، ہر عمر، ہر قومیت کے "شرفا اور خواتین" جوڑوں میں اور اکیلے آتے ہیں۔ دو چار گھنٹے ناچتے ہیں اور چائے یا کوکا کولا پی کر اپنی کھال میں مست گھروں کو سدھارتے ہیں۔

ویسے ایسٹوریا میں جوڑے کم ہی آتے ہیں۔ جوڑے کیفے لا پیرس میں جاتے ہیں جو نسبتاً اعلیٰ ناچ گھر ہے۔ کیوں کہ وہاں ٹکٹ ساڑھے بارہ شلنگ ہے اور خاتون ساتھ ہوں تو الگ ٹکٹ نہیں لگتا۔ وہاں شراب بھی ملتی ہے کیوں کہ فرض یہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ زیادہ پیسے خرچ کرسکتے ہیں ان کا ظرف بھی وسیع ہوتا ہے یعنی وہ نشے میں آکر گڑبڑ نہیں کرتے، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہمارے ہاں کلب کا جوا حلال اور گلی کا

تو خلاف قانون ہے یا کلب میں پینا فیشن اور ادھر ادھر پی لینا جرم ہے ۔ کیونکہ ہماری جملہ فیشن دار روایات ولایت سے وراثت میں آئی ہیں ۔

ہاں تو ایسٹوریا میں عام طور پر لڑکے لڑکیاں اکیلے آتے ہیں اکثر یہ وہ طبقہ ہوتا ہے جسے ڈیٹ کرنے یعنی باقاعدہ ادعائے محبت کے ذریعے معینہ ملاقات کا موقع نہیں ملتا یا فرصت نہیں ہوتی ، مثلاً غریب اور کم رو ایشیائی ، افریقی یا ویسٹ انڈیز کے طالب علم اور طالبات ، جنھیں عاشق ہونے اور خرچ کرنے کا یارا نہ فرصت ۔ کس نمی پرسد کہ بھیا (بہنا) کون ہو ۔ مگر زندگی برابر جوش مارتی ہے ۔ آخر روز و شب کا بوجھ بالکل خالی ٹوٹی تو نہیں اٹھایا جا سکتا ۔ چنانچہ شام کو ایسٹوریا کا رخ کرتے ہیں ۔ خواتین یعنی لڑکیاں اور شرفا یعنی مرد برآمدوں میں ملے جلے کھڑے ہوتے ہیں ۔ سامنے ناچ ہو رہا ہے ۔ آپ اصولاً کسی سے بھی ناچ کی درخواست کر سکتے ہیں "ان کے " برا ماننے کا سوال ہی نہیں ہے ۔ ایسی ہی ہیں تو کہیں اور گئی ہوتیں ۔ ہاں وہ انکار کر سکتی ہیں اور آپ کو برا ماننے کا حق نہیں ہے بلکہ ویدوں میں آیا ہے کہ "ان کے " انکار کا برا ماننا ہی نہیں چاہیے ۔ یا تو کیے جاؤ کوشش مرے دوستو ورنہ آگے بڑھو کہیں اور قسمت آزمائی کرو ۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ

عام طور پر گوہر یک دانہ دو چار قدم دور ہی مل جاتا ہے ، ہمت مردانہ کی ضرورت بار بار پیش نہیں آتی کیونکہ آخر گوہر یک دانہ بھی تو جوہری کی تلاش میں آیا ہے ۔ اب ایک بار وہ ہاتھ میں آگیا اور جوہری معقول ہے تو روایت کے مطابق ناچ ختم ہونے تک وہ جوہری کے قبضے ہی میں رہے گا اور بات بن گئی تو اگلی شام ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گا ۔ لیکن کوئی کوئی گوہر بڑا چکنا ہوتا ہے ۔ بار بار پھسل کر رقیب میں جا لگتا ہے ایک ناچ آپ کے ساتھ ، دوسرا رقیب کے ساتھ ، تیسرا کسی اور رقیب کے ساتھ ۔

ایکسپرٹوں کی رائے

اجی انگریز (سالی) سے تو بات ہی مت کرو ۔ یہ کھردرے لوگ ہوتے ہیں ۔ تم تو کانٹی نینٹل یعنی (غیر انگریز یورپین) کا انتخاب کیا کرو ۔ ویسے نئے آدمی کے لیے پتا چلانا مشکل ہے کہ کون انگریز ہے اور کون یورپین ۔ مگر دو چار ہفتے میں سب شناخت ہو جاتی ہے ۔ انگریز کا رنگ سرخی مائل بھبھوکا ، سپاٹ بے رس ہوتا ہے اور یورپین کے چہرے پر نمک ضرور ہوتا ہے ۔ جرمن کا بدن سخت ، فرانسیسی کی چال

میں لوچ، اطالوی کی تو رگ رگ پکارتی ہے کہ میں اطالوی ہوں۔ اطالوی، خوش باش۔ دوسری پہچان لہجے کی ہے۔ انگریز لہجہ کھردرا اور یورپی لہجہ میٹھا کشمیری سیب کی طرح۔ اجی سب یورپین سب انگریزوں سے بہتر ہیں اور ہسپانوی، خدا کی پناہ! افضل حسن ہے ان کی موسم شباب ان کا۔

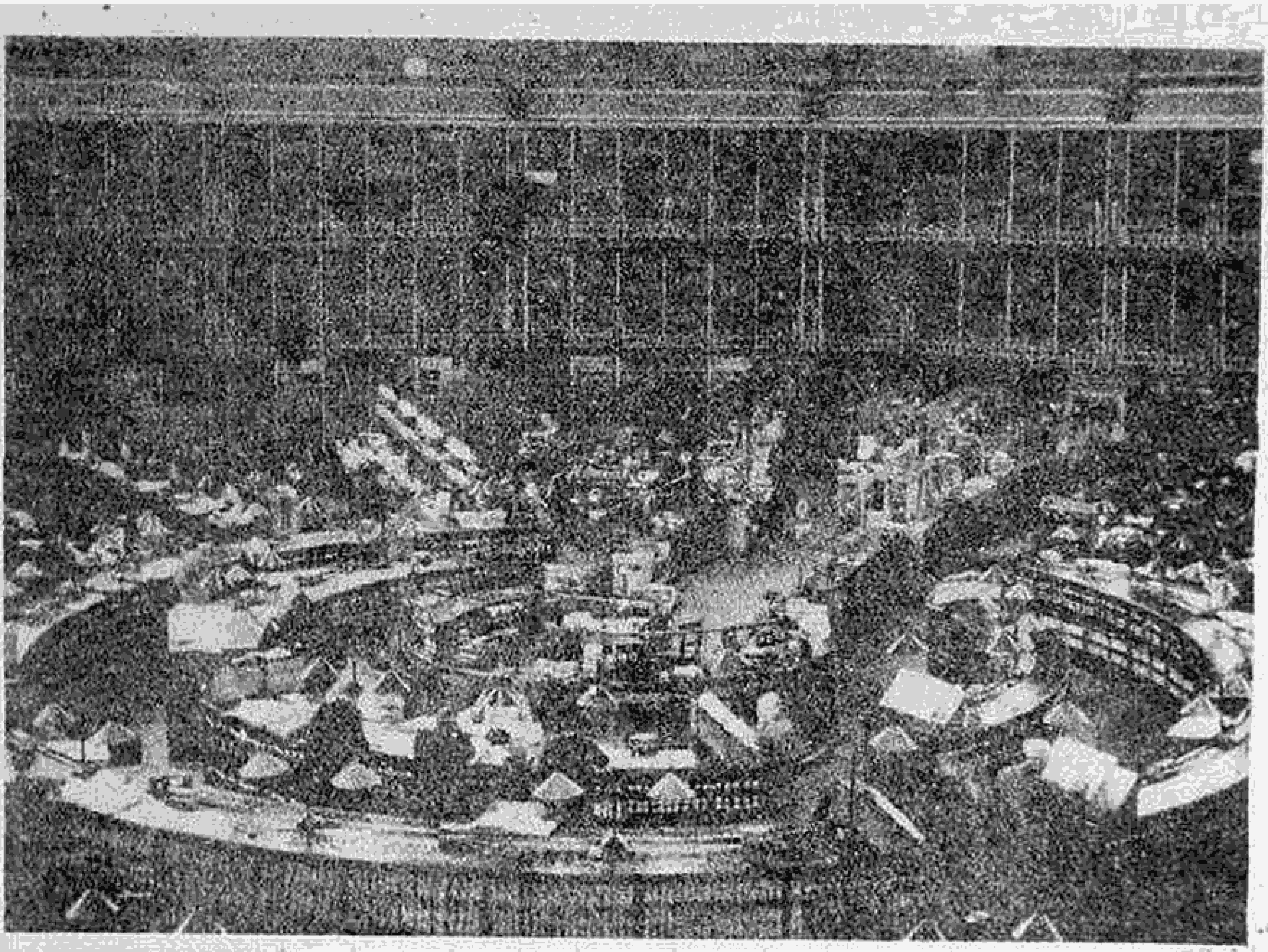
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

"بات یہ ہے مسٹر" وہی ایکسپرٹ فرما رہے ہیں "کہ یہاں انگریز اپنے سوا سب کو کالا، پیلا، بھورا اور تھرڈ کلاس سمجھتے ہیں، اور چونکہ یہاں روزگار اور تعلیم کا زور ہے اس لیے یورپ بھر کی لڑکیاں کھنچ کر آجاتی ہیں۔ وہ انگریزی اور دیگر فنون سیکھتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ نوکری بھی کرتی ہیں۔ اس لیے انھیں یہ پہلے ہی سے متعصب لوگ اچھی نوکریاں نہیں دیتے اور انھیں گھٹیا قسم کے کام اور کم داموں پر قناعت کرنی پڑتی ہے، اور ان کے دل میں انگریز کے خلاف غیض و غضب کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یورپ والے، انگریزوں کی طرح رنگ و نسل کے تعصب کا شکار نہیں ہیں۔ انگریزوں نے تو صدیوں رنگ دار لوگوں پر حکومت کی ہے اس لیے انھیں تعصب ہے۔ ان یورپ والوں نے اکا دکا ایشیائی نو آبادیات پر حکومت کی ہے اور مزاجاً رنگ کا تعصب نہیں رکھتے پھر یہ کہ انگریزوں کے نزدیک سبھی اجنبی اور غیر ملکی اور غیر سفید ہیں۔ مگر یہ بین الاقوامی ناچ گھر ہے، پرواہ مت کرو، وہ دیکھو جرمن خالی کھڑی ہے۔ ارے بھائی پکی جرمن ہے۔ ہم شرط باندھتے ہیں کہ وہ جرمن ہے، دیکھتے نہیں سیدھے سادے کپڑے ہیں۔ ٹھوڑی مضبوط اور جسم سخت ہاتھ پاؤں محنت کشوں کے سے لگتے ہیں، روزگار کی ستائی ہوئی ہے، کہیں آیا گیری یا نرسنگ کرتی ہوگی۔ دن بھر کی دکھیاری دیر سے پہنچی ہے، یہاں جوڑے تقسیم ہو چکے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ کوئی نیگرو کوئی مدراسی قبضہ جمالے تم پہنچ جاؤ۔ جاؤ نا یار۔ کیا شاعر بنے پھرتے ہو، ہمت سے کام لو۔ اب یہ خود آکر تو ہاتھ جوڑنے سے رہی کہ:

ناچ کرنے سے جو انکار کرو گے صاحب
خون ہو جائے گا ناحق مرے ارمانوں کا

اگر آپ کے پاس کافی دام ہیں تو لنڈن پلیڈیم جائیے، یا البرٹ ہال، یا رائل کنسرٹ ہال اور... سیکڑوں کلچری یعنی ثقافتی مراکز ہیں، ٹکٹ دس شلنگ سے لے کر پانچ پونڈ بلکہ پندرہ پندرہ پونڈ بھی ہے، مگر اچھے مقامات پر ہفتوں پہلے نشستیں مخصوص کرانی پڑتی ہیں۔ ہائے انگریز تفریح کے لیے بھی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ کوئی اچھا ڈراما یا "شو" دسمبر میں ہونے والا ہو تو اگست ہی میں ہفتوں کے لیے نشستیں

مخصوص ہو جاتی ہیں۔ کسی حد تک یہ ایک ریکٹ بھی بن گیا ہے، نشستیں مخصوص کرنے والی ایجنسیاں کھلی ہوئی ہیں جو مشہور و مقبول تماشوں، سرکسوں، ڈراموں کے ٹکٹ خرید کر رکھ لیتی ہیں اور "بلیک" میں بیچتی رہتی ہیں، ہمارے ہاں بے چارہ بلیک والا صبح سے قطار میں لگ کر چار ٹکٹ لیتا ہے اور ڈیڑھ دو روپے زیادہ پر بیچ دیتا ہے۔ لندن میں یہ باقاعدہ کاروبار ہے اور نفع بھرپور، آخر کو وہ مہذب سوسائٹی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ یہ سب کلچری خزینے ہیں۔ ایک ایک ڈراما ایک ایک شو، شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔



برٹش میوزیم لائبریری - کتابیں اپنے آبا کی

شاید پہلا سامراجی تجربہ

یہ برٹش میوزیم لائبریری ہے۔ برٹش میوزیم تو خیر دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے کہ ہزار ہا نوادر سے بھرپور ہے، مگر میں ان پڑھ آدمی اس کے کتب خانے سے زیادہ مرعوب ہو گیا ہوں، اس کتب خانے میں داخلے کا اجازت نامہ لینا پڑتا ہے جو مجھے غلطی سے پڑھا لکھا جان کر برٹش کاؤنسل نے خود مہیا کر دیا ہے۔
اب میں حیران ہوں کہ یہاں کیا دیکھوں۔ کتابوں کے طوفان میں میرا دم گھٹ گیا ہے۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں، نائب مہتمم کتب خانہ میری رہنمائی کے لیے بطور خاص مجھے لیے گھوم رہے ہیں۔

"ڈاکٹر عالی ادھر آئیے آپ کو شعبۂ مشرقیات میں تو خاص دلچسپی ہے نا۔"

"ڈاکٹر عالی" میں نے سنا اور بے ساختہ ہنسنے لگا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے خاموش کام کرنے والے محققین نے موٹے موٹے شیشوں کی عینکوں میں سے مجھے گھورا اور متنفس ہو کر گردنیں پھر نیچے جھکا لیں۔
اس کتب خانے میں بات کرنا تو کجا زور سے سانس لینا بھی جرم ہے، کیا پتا کس محقق کے ہاتھ سے کسی تحقیق کا سرا پھسل جائے، کوئی صاحب الف کے صوتی مآخذ پر کام کر رہے ہیں، کوئی صاحب کتے اور بندر کے نسلی رشتوں کا کھوج لگا رہے ہیں۔ ان کے لیے ایک قہقہہ تو کیا ایک کھنکتی ہوئی مسکراہٹ بھی ان کا ذہنی توازن بگاڑ دینے کا بہانہ بن سکتی ہے۔ مگر میں ان پر نہیں اپنے آپ پر ہنستا ہوں کیونکہ یہاں بی۔ اے سے آگے قدم نہیں رکھا اور اب ڈاکٹر کا خطاب مل رہا ہے۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر عالی" وہ پریشان سے ہو گئے۔ "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔" اے واہ انگریز کا طرزِ کلام۔ طنز بھی کرے گا تو لپیٹ کر، یہاں تو سیدھے سیدھے اپنے ممدوح کے پیچھے پڑ جاتے "کیوں صاحب آپ ہوش میں تو ہیں، مطلب کیا ہے جی اس قہقہے کا، تمیز نہیں ہے آپ کو، کس نے آپ کو یہاں بھیج دیا ہے۔"

میں شرمندہ ہوگیا، ہونا ہی تھا، مگر میں اسے کیسے بتاتا کہ میں صرف ایک بوگس سا گریجویٹ ہوں ڈاکٹر تو کیا ایم۔اے بھی نہیں ہوں، مجھے زندگی میں پہلی بار ڈاکٹر کہا گیا تھا، اور میں اس لمحہ بھر کی بادشاہت کو چھوڑنے پر بالکل تیار نہیں تھا، یوں بھی پی۔ایچ۔ڈی کہلانا میری زندگی کی معراج ہے، جو پڑھ لکھ کر تو شاید کبھی نصیب نہ ہو۔ رہ گئی اعزازی ڈگری تو اس کے لیے وزارت، امارت، تجارت اور مہارت چاہیے۔

"کچھ نہیں آئی۔ایم سوری۔ مجھے کچھ یاد آگیا تھا۔ میں نے بات ٹالی"۔

"آپ کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ کس موضوع پر تھا" ظالم نے ایک دم سوال کردیا۔

"اسلامی معاشرے پر انگریزوں کے احسانات" میں نے اطمینان سے بلکہ کسی قدر فخر و نازش کے انداز سے جواب دیا۔ وہ وقت بہت نازک تھا، میری ذرا سی غلطی سارا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔

"آؤ تب تو آپ یقیناً شعبۂ مشرقیات دیکھیں گے"۔ ان کی آنکھوں میں سامراجی روایات کی روشنیاں اس قدر تیز ہوگئیں کہ وہ میرے چہرے کے پھیکے پن اور دبی دبی گھبراہٹ کو نہ دیکھ سکے، انھیں یقین ہوگیا کہ یہ کوئی اپنا ہی سامراجی پٹھو ہے، وہ اور زیادہ خلیق ہو گئے "آپ کو ہم ایک میز الاٹ کردیں گے۔ آج کل کام کرنے والوں کا بہت زور ہے، مگر ہم آپ کے لیے کچھ نہ کچھ کرہی سکتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ یہ ایک خصوصی رعایت ہے جو ہر محقق کو نہیں دی جاتی"۔ "بھائی یہ سمجھے کہ میں برٹش کاؤنسل کا وظیفہ خوار محقق ہوں۔

میں نے فرطِ تشکر سے سر ہلایا اور شعبۂ مشرقیات میں ایک ماہر تحقیق کی طرح گھومنے لگا۔ یہاں کتابیں نکالی نہیں جاسکتیں، کیونکہ کام کرنے کا کمرہ بلکہ میدان الگ ہے جہاں لیمپ لگی ہوئی میزیں مہیا کی جاتی ہیں اور چار سو ساٹھ کام کرنے والوں کے لیے پورا انتظام ہے۔ سامنے کتب بردار صاحب بیٹھتے ہیں جنھیں کتب کے لیے پرچہ لکھ کر دینا پڑتا ہے۔ یہاں تو میں ایک پٹھو ہونے کی وجہ سے خاص اجازت لے کر سیرِ کتب کر رہا ہوں۔ یہ لائبریری شاید دنیا کا پہلا سامراجی عجوبہ ہے۔ کیا آپ کتابوں کی تعداد جاننا چاہتے ہیں، وہ ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہیں، ان کے موضوعات اور مضامین کی قسمیں، فہرست کتب، بلکہ من بھر ذخیرۂ اسمائے کتب حاضر ہے، اور اگر آپ کو اعداد و شمار میں دلچسپی ہے تو میرے ساتھ تین چار ہفتے تک ان ضخیم فہرستوں کے جنگلوں میں گھومنا پڑے گا، اس لیے چھوڑیئے اس دھندے کو، نہ آپ کو تعلیم سے دلچسپی ہے نہ مجھے ہوسکتی ہے، یعنی اگر میں اور آپ چاہیں بھی تو تعلیم سے قرار واقعی دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اسباب آپ کو خود معلوم ہیں، اس لیے جھینکے سے آگے بڑھ جایئے بس یہ سن لینا کافی ہے کہ دنیا میں تین کتب خانے

عدیم المثال ہیں۔ برٹش میوزیم لائبریری، امریکی کانگریس کی لائبریری اور سوویٹ لائبریری مگر سوویٹ لائبریری میں ہم انگریزی دانوں کے مطلب کا مال کافی نہیں اور امریکی لائبریری میں مشرقیات پر وہ مال مسالا اور نوادر موجود نہیں جو برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہیں۔ کیونکہ ابھی بیس برس پہلے تک بے چارے امریکیوں نے مقبوضاتی حکومت کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ اور برطانیہ تو صدیوں برطانیہ عظمیٰ رہا ہے، بلکہ پرانی چال کے پاکستانی صحافی تو آج بھی اس کی وجہ سے دول عظمیٰ کی اصطلاح استعمال کر جاتے ہیں۔

ہاں ایک فہرست زرین ان ناموں کی بھی ہے جنھوں نے گزشتہ دو سو برس میں یہاں کام کیا ہے۔ ان میں بڑے بڑے نام ہیں، اور ان ناموں کے بڑے بڑے کام ہیں۔ یہاں تک کہ بابائے اشتراکیت جناب کارل مارکس صاحب نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "داس کیپٹال" مرتب کرنے کے لیے یہیں کام کیا تھا۔ برطانوی کاپی رائٹ قانون یہ ہے کہ جو کتاب، جو اخبار، جو لفظ ملک بھر میں چھپے اس کی تین نقلیں لازمی طور پر مفت اس کتب خانے میں داخل کی جائیں۔ (یہی قانون امریکہ میں بھی ہے۔ لیکن پاکستانی ناشرین اسے اپنے حق ملکیت پر ڈاکا تصور کرتے ہیں) اس لیے نئی کتاب تو یوں آگئی۔ پرانی کتابیں بیشتر تو سامراجیت کا تحفہ ہیں اور باقی خریدی گئی ہیں اور برابر خریدی جاتی ہیں۔ ہندوستان پاکستان پر آج بھی سب سے زیادہ "مواد" اس کتب خانے اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے جسے انگریز آج بھی تقسیم نہیں کرنے دیتا۔ خیر انڈیا آفس لائبریری کا قصہ الگ ہے، خود اسی کتب خانے میں وہ مال موجود ہے کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔

مگر، میری آنکھیں خیرہ ہوتے ہوتے ایک دم پھر سے کھل گئیں، اور لمحے بھر میں پورا منظر بدل گیا۔ میں نے اس خاموش پرسکون ماحول میں ایک ہنگامہ برپا دیکھا، اور دیکھا کہ انگریزوں کی فوجیں ہندوستان کے عوامی اور ذاتی کتب خانوں میں گھس گھس کر کتابیں نکال رہی ہیں اور برطانوی جہازوں پر لاد رہی ہیں، اور پھر میں نے دیکھا کہ بہت سے ہندوستانی امراء زعما، اور آئی سی ایس کے افسران اور شرفا ہمارے مخطوطات اور نوادر اپنے سروں پر رکھے، بڑی بڑی اونچی اونچی الماریوں کے آگے سیڑھیوں پر چڑھ رہے ہیں اور انھیں اپنے تکونے لمبے لمبے رومالوں سے جھاڑ کر قرینے سے ان الماریوں میں سجاتے جا رہے ہیں۔ ان کی قبائیں، انگرکھے اور داڑھیاں کیسی پاکیزہ اور صورتیں کیسی نورانی ہیں...... نہیں، مجھے تو ان کی مجبوریاں ان کے چہروں پر نظر نہیں آتیں...!!

اور میں نے دیکھا کہ ان بزرگوں میں منجملہ دیگرا کابر کے میرے والد ماجد اور میرے دادا حبان اور

پردادا جان بھی شامل ہیں اور سیکڑوں دوسرے بزرگ جنھوں نے انگریزی راج کے سائے میں پرورش پائی اور جن کے سائے میں انگریزی راج نے پرورش پائی، سب خطاب یافتہ، وظیفہ پانے والے، ریاستوں، جاگیروں والے، خاندانی، سب اہلکارانِ سرکار انگلشیہ فی الہندوستان، سب وہ لوگ جن کی دولتیں جاگیریں، عہدے، اور ان سے نسبتیں آج بھی میرے وطن میں ہزاروں "بڑوں" کا مایۂ افتخار ہیں۔

یہ وہ حضرات ہیں جن کے سبب آج بھی عربی فارسی اور اردو پر کام کرنے والے تک لندن کے محتاج ہوئے بیٹھے رہتے ہیں اور اگر کبھی لندن سیاسی زوال کا شکار بھی ہوگیا تب بھی ان کتابوں کی وجہ سے مدتوں دنیا بھر کے اہل علم کا کعبہ بنا رہے گا۔

بھئی معاف کرنا اس وقت علامہ اقبال کا ایک مشہور شعر نشتر کی طرح دل میں چبھ رہا ہے کیونکہ کسی سانحے کے متعلق سننا اور بات ہے، مگر اسے دیکھنا بڑی قیامت ہے خود بڑے میاں پر کیا گزری ہوگی جو فرمایا کہ:

خزانے علم و حکمت کے کتابیں اپنے آبا کی
کہ دیکھو جن کو یورپ میں تو جی ہوتا ہے سی پارہ

جناب سیاحت نامہ جائے بھاڑ میں اور سفرنامے کے اصولی مطالبات جائیں چولھے میں۔ صاف بات یہ ہے کہ مجھ سے یہ کتابیں یہاں نہیں دیکھی جاتیں۔ شاید یہ وقتی یا رسمی جذباتیت سے آلودہ حب الوطنی کی کوئی گھٹیا شکل ہے، مگر ہے، آخر سستی اور جذباتی غیر حب الوطنی کی بھی تو بہت سی شکلیں ہوتی تھیں، مثلاً انگریز کے ہاتھوں خطاب یافتگی جس پہ بزرگ (بہتوں کے بزرگ) خوش ہوتے تھے۔ لہٰذا اب ایک خُرد ناخوش ہو رہا ہے پیچ و تاب کھا رہا ہے، جل رہا ہے، کھول رہا ہے، یہ اس کا کم از کم حق ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا خطاب ہے۔ اپنی ناموس کو غیر کے گھر دیکھ کر ٹھنڈے دل سے اس کا تاریخی تجزیہ کرنا میرے بس کا نہیں۔ گڈ بائی مائی ڈیر برٹش میوزیم لائبریری۔ اب میں یہاں حاضر نہیں ہو سکوں گا۔

(بھئی اپنی جہالت چھپانے کا کیا خوب بہانا نکالا ہے)

"کیوں ڈاکٹر کیا بات ہے" صدر دروازے میں نائب مہتمم صاحب پوچھتے ہیں۔

"سنیے جناب ایک تو میں ڈاکٹر نہیں ہوں، جب ہو جاؤں گا آپ کو ضرور اطلاع دوں گا۔ دوسرے یہ کہ یہ کتب خانہ میرے کام کا نہیں۔"

"واٹ!!!" وہ تقریباً چیخ پڑے، شاید انھیں ایسا لگا جیسے پورے برطانوی استعمار پر کوئی ایٹم بم

گرادیا گیا ہو۔ وہ میرے فقرے کا پہلا حصہ بالکل بھول گئے۔

"اجی جناب" میں اردو میں بولا:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

باہر نکلتے ہی میرے پھیپھڑوں اور دماغ کے کونوں کھدروں میں لندن کی تازہ سرد ہوا سرسرانے لگی، میں نے اوورکوٹ پہنا، مفلر باندھا، دستانے چڑھائے، اور گردن کو زور سے ایک جھٹکا دیا۔

"مالش" (پرواہ مت کرو) میں نے عربی میں اپنے آپ سے کہا اور قریب ہی رسل اسکوائر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں یونیورسٹی کے علاقے میں آج کل خود انگریز لوگ اپنی پرانی کتابیں بیچتے ہیں۔

تمام کیمبرج

"جب میں کیمبرج میں تھا تو....."

پتا نہیں کیمبرج میں کیا ہوتا ہوگا مگر آزادی سے پہلے جب ہم کالے لوگ کسی آئی سی ایس صاحب بہادر یا پروفیسر قسم کے بزرگ سے کیمبرج کا ذکر سنتے تو فرطِ عقیدت سے سر جھکا لیا کرتے تھے اور اب بھی جھکا لیتے ہیں مگر اب زیادہ دخل مروت کا ہوتا ہے۔ اس فرطِ عقیدت میں احترام کی وجہ سے ہماری پلکیں تک جھپکنے نہ پاتیں "اوہ کیمبرج! یا اللہ وہ کیا جگہ ہے جہاں سے آنے والے کالے پیلے لوگ اپنا رنگ بھول کر اپنے ہم وطنوں، عزیز رشتے داروں اور ماتحتوں کو ایک دم کالا آدمی سمجھنے اور کہنے لگتے ہیں۔" ہم لوگ سوچتے "کیمبرج ضرور کوئی طلسماتی یونیورسٹی ہے۔ جہاں آدمی انگریزی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان بھول جاتا ہے اور بھولنے کے ساتھ ساتھ اس سے نفرت بھی کرنے لگتا ہے۔"

یہی قصہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا بھی تھا، مگر آج کیمبرج کی باری ہے تو کیمبرج ہی سہی۔

اتفاق دیکھیے کہ میں اردو نویس کالا آدمی کیمبرج میں بیٹھا ہوں اور میرے اعزاز میں کنگز کالج کے شعبۂ ادبِ انگریزی کے صدر ایک پر مغز تقریر کر رہے ہیں، جس کا مجھ پر بالکل کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ حضرت مجھے بالکل نہیں جانتے بلکہ جان ہی نہیں سکتے۔ اور صرف اصول میزبانی کی خاطر برطانوی وضع داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہمارے ایشیا میں اس وضع داری کا مظاہرہ شہروں اور قصبوں کے نمائندوں، افسروں اور وی آئی پی قسم کے بزرگوں کے لیے کرتے ہی رہتے ہیں جن پر مجھے پہلے ہنسی آتی تھی، اب کسی بات پر نہیں آتی۔

ہوا یہ کہ میں لندن سے اکتا گیا، یا لندن مجھ سے اکتا گیا تو میری سرپرست برٹش کاؤنسل نے مشورہ دیا کہ یہاں سے کیمبرج کی ہوا بھی کھا لو۔ میں نے بھی سوچا کہ ایک نظر اس عظیم درس گاہ پر بھی سہی، جو دنیا کے

سات سمندر پار دور کے خالص مشرقی ممالک میں ہزاروں "اعلیٰ" خاندانوں، حاکموں، بزرگوں اور چھٹ بھیوں کا لعبۂ مقصود رہی ہے۔

آج میری گائیڈ مس میری میک گریگر ہیں' جو انگریزی ادبیات کی طالبہ ہیں، ایک نہایت خوش شکل، نوجوان دوشیزہ، ہونٹوں پہ رنگت، گالوں پہ لالی، چال بھی ہے متوالی۔ صورت اور بات چیت سے شرافت ٹپکتی ہے۔ بال کٹے ہوئے نہیں، بلکہ لمبے لمبے سنہرے رنگ کے ہیں، غرض یہ کہ ان میں کسی طرح کا کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ ایسا جلیس اس کھردرے ملک میں کہاں ملتا ہے۔ مگر۔ مگر ان کا قد مجھ سے کم از کم چار انچ لمبا ہے۔

جب ریل ٹھیر رہی تھی اور میں نے انھیں پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا تو جی بے اختیار پکار اٹھا کہ کاش یہی مس میری میک گریگر رہنمائے کیمبرج ہوں تا کہ کیمبرج دیکھنے کی زحمت ہی نہ اٹھانی پڑے۔ کہیں ریستوران میں وقت گزار دیا جائے مگر جب ریل ٹھیری اور میں پلیٹ فارم پر اترا اور انھوں نے آگے بڑھ کر میرا نام پوچھتے ہوئے ہاتھ ملایا تو معلوم ہوا کہ اب تو کیمبرج ہی دیکھنا پڑے گا۔

..... قد یار کتنا دراز ہے۔

کیمبرج ایک شہر کا نام بھی ہے، دریا کا بھی، اور یونیورسٹی کا بھی۔

یوں ایک نقالی کا کیمبرج، شہر امریکہ میں بھی ہے۔ جہاں ہارورڈ یونیورسٹی واقع ہے مگر وہ دنیا اور ہے۔ ابھی تو اس کیمبرج کو بھگتا لیا جائے۔ مس میک گریگر ایک اسکاٹ ہیں یعنی اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی۔ جہاں کے لوگ ساڑھے چھ فٹ تک قد رکھتے ہیں اپنے رواجی صوبائی تعصب کے ماتحت انھیں اڈنبرا یونیورسٹی میں جانا چاہیے تھا، کیونکہ برطانیہ میں صوبائی تعصب پاکستان سے تھوڑا سا ہی کم ہے، لیکن قصہ یہ ہے کہ ان کا خاندان کئی پشتوں سے کیمبرج میں پڑھتا آیا ہے اس لیے وہ یہاں اس قد کے باوجود تشریف لے آئیں۔ اور آج....

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کیمبرج والے اپنے شاگرد خاندانوں کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ جیسے علی گڑھ میں ہوتا تھا اور اگر تین پشتیں اچھے ہونہار مشاہیر کی گزر گئی ہیں تو چوتھی پانچویں پشت کے نالائق بھی عزت کے ساتھ چل جاتے تھے۔ کیمبرج میں داخلے کا بھی چکر ہے۔ ہر کہ درمہ یعنی ہر ایک کو داخلہ ملنا مشکل ہوتا تھا۔ اب تو وہاں بھی غول بزرگوں کے عوامیت چھا گئی ہے لیکن پہلے صرف داخلے ہی میں بڑے گھپلے پڑتے تھے۔ کون ہو، کس

خاندان کے ہو، باپ، دادا، پردادا کہاں پڑھتے تھے۔ پڑھتے بھی تھے یا فقط نوابی کرتے تھے وغیرہ۔ تعلیمی معیار کیسا ہے۔ لاطینی جانتے ہو یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب سب چلتا ہے۔

بہرحال یہ برطانیہ کی قدیم، عظیم ترین، اور خوب صورت ترین یونیورسٹی ہے۔ اب باادب باملاحظہ ہوشیار ہو جائیے اور بس نمبر ۱۰ ایکڑ لیجیے جو سیدھی ایمانیوئیل کالج پہنچا دے گی۔ یہاں سے پیدل نویسی ہے۔ ویسے کیمبرج کا شہر یا قصبہ پہ زیادہ مبا چوڑا اور پیچیدہ بھی نہیں ہے، پورے شہر کی شکل انگریزی حرف وائی (Y) جیسی ہے۔ ہائے ہائے رے یہ زنگ خوردہ پاکستانی دماغ کہ انگلستان میں مثال کے لیے بھی انگریزی حرف ہی سوجھتا ہے۔

ہم پتلی پتلی سڑکوں اور نہایت تنگ گلیوں سے گزرتے ہیں، ایک بڑی سڑک اتنی چوڑی ہے جیسے اندرون بھاٹی دروازہ لاہور یا بوری بازار کراچی۔ نہایت تنگ مگر یخنتہ، صاف شفاف، نہ جانے شہری صفائی یورپ کے حصے میں کیوں آئی ہے۔ بھئی آگئی، اس کا رونا کیا، یہاں آپ علمی مراکز دیکھنے آئے ہیں یا کراچی کارپوریشن پر تنقید کرنے، بس چپ چاپ گزرتے چلیے اور اپنے احساسات کی لگام مس میری میک گریگر کے ہاتھ میں دے دیجیے ورنہ وہ بار بار دولتیاں جھاڑیں گی۔

افسوس کہ میرے احساسات کے گھوڑے (یا گدھے) بڑے اڑیل ہیں اب میں اس صورت حال کا کیا کر سکتا ہوں کہ کیمبرج جیسے علمی، ادبی اور سائنسی مقام پر یورپ والے شہر کے انتظامات حفظان صحت کا فرق محسوس ہو رہا ہے اور خون کھول رہا ہے کہ اس چھوٹے سے تنگ اور گنجان آباد شہر کا انتظام صفائی اتنا اچھا کیوں ہے۔ ڈیر میری یعنی ڈیر مس میک گریگر کچھ اس مرض کا علاج کرو، آخر تم تو حاکم قوم ہو اور سنا ہے کہ حاکموں کی آنکھوں میں جادو اور زبان میں کرامتیں ہوتی ہیں۔ یعنی جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا ہے خواہ وہ کتنا ہی عام یا بوگس کیوں نہ ہو اس میں دریائے معانی موجیں مارتے نظر آتے ہیں۔

"اب بتائیے ڈاکٹر عالی" یہ کم بخت بھی ڈاکٹر ہی کہہ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہیں میرے کاغذات میں کوئی گھپلا ہو گیا ہے۔ خیر چلیے دو عزت رہ جائے گی" ہاں تو یہ بتائیے ڈاکٹر عالی" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھتی ہیں "کیا آپ ایک ایک کر کے سارے کالج دیکھیں گے، یا آپ کو چند بڑے بڑے اور مشہور کالج دکھائے جائیں۔ حسن اتفاق سے آج موسم بھی صاف ہے اور سب کالجوں میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہو رہا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہاں تقریباً ہر کالج شاندار اور قیمتی روایات کا مرکز ہے"

"جی ہاں، یقیناً یہ ایک عظیم درس گاہ ہے اور اس مدرسے کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ

ہوگا کہ ہم کسی منصوبے کے بغیر ایک دم کالجوں کی قطار میں داخل ہوجائیں اور یوں ہی سیر کریں۔"

"بغیر منصوبے یعنی بغیر کسی ترتیب کے۔" انھوں نے اپنی حیرانی چھپائی۔

"جی ہاں میری مراد ہے بس یونھی چلا جائے۔" میں ذرا نہیں گھبرایا — آخر کو میں پاکستانی ہوں، جہاں منصوبہ بندی کو ایک غیر دانشورانہ اور بالکل مادّی زمینی یعنی رذیل قسم کی چیز سمجھا جاتا ہے منصوبہ، ترتیب، یہ بدعت سیر میں بھی شامل ہوگئی تو پھر زندگی کا مزا کیا رہ گیا۔

"بہت بہتر" انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "اچھا تو آیئے یہیں سے شروع کرتے ہیں۔"

دریائے کیمبرج کے کنارے گھاس کے تختے اور تختوں کے پیچھے پیچھے کالج چلے گئے ہیں، کالجوں کے دروازے سامنے گلی میں کھلتے جاتے ہیں، جو ٹیڑھی سیدھی ان کے گرد ایک سانپ کی طرح کنڈلی مارتی جاتی ہے۔ مگر یہ سامنے کا منظر کچھ نہیں، اس میں کوئی ترتیب بھی نہیں، اصلی شے ہے کالجوں کی پشت۔ ترجمے کی معافی کیونکہ انگریز اس پورے علاقے یعنی کنار کیمبرج کے لیے بیکس کا لفظ استعمال کرتے ہیں "BACKS" جس کا ترجمہ ہوا پشتیں، پیٹھیں، اور جامعہ عثمانیہ کے انداز میں عقبیات۔ گہری سبز رنگ گھاس اور پتلا سا نہر نما دریا اور اس پہ جا بجا پُل۔ کئی پُل نہایت تاریخی ہیں، کئی کئی سو برس قدیم، ایک پُل مشہور سائنس داں نیوٹن کا بنایا ہوا بھی ہے، سوا سو برس کا ہوگا، اس کے تختے تقریباً کالے ہوگئے ہیں۔ شاید بودے بھی ہوگئے ہوں گے مگر وہ نیوٹن کا پُل ہے اسے کون چھیڑ سکتا ہے۔ ان پُلوں کے نیچے سے چھوٹی چھوٹی کشتیاں گزرتی ہوئی بقول اردو کی پہلی کتاب کے کیا ہی بھلی لگتی ہیں۔

کالجوں کی اپنی اپنی تاریخ ہے، پانسو برس پرانا کالج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ عمارتیں باہر سے زنگ آلود، کرم خوردہ، اندر سے کمرے تاریک، اور چھوٹے مگر صاف اور مرمت شدہ۔ کسی کالج کا صحن چالیس پچاس گز سے زیادہ نہیں مگر تاریخی عظمتیں ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ نئے کالج نسبتاً بڑے اور روشن ہیں مگر روایات کی کرنیں کم کم نظر آتی ہیں۔ اب یہ کنگز کالج ہے شاندار، فراخ اور بارعب مگر اس میں زیادہ قدامت نہیں۔ صرف فیلوز بلڈنگ سنہ سترہ سو چوبیس میں بنی تھی، باقی زیادہ تر کام انیسویں صدی کا ہے، سو انیسویں صدی کو کون پوچھتا ہے۔ ہاں بہ جو دائیں ہاتھ کو سینٹ میری کا گرجا ہے، یہ پندرھویں صدی کی چیز ہے، اس کا مینار سنہ چودہ سو اکیانوے میں شروع ہوا تھا اور سولہ سو آٹھ میں ختم ہوا اور سامنے کا حصہ سولہ سو بتیس میں اختتام پذیر ہوا۔

کیا آپ بور نہیں ہوئے۔ میں تو ہو گیا ہوں۔ بس یہی کیمبرج کا روایاتی چکر ہے، روایات، روایات۔ اس کالج کے اس کمرے میں نیوٹن پڑھتا تھا۔ بھئی واہ۔ بہت خوب۔ یہاں فلاں شاعر نے نظمیں کہیں اور یہاں فلاں نے پڑھیں، اور یہاں فلاں لارڈ نے عشق کیا اور نا کام ہوا یا کامیاب ہو گیا۔ یہاں کورٹ آف ٹری نی ٹی میں زینہ بنام ای کے سکے اوپر نیوٹن اور لارڈ مکالے اور مصنف ٹھیکرے رہتے تھے۔ ہاں یہ سب روایات، یہ یادیں انگریزوں اور انگریز پسندوں کے لیے نہ جانے کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس جامعہ کے ایک ایک انچ پر دس دس ضخیم کتابیں، حوالے اور مضامین مل جائیں گے، اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ مگر یہ سب کچھ انگریزوں کو مبارک ہو۔ یہاں میرے لیے کچھ نہیں ہے سوائے علمی خزانوں کے۔ یہ مخطوطات یہ نوادر کتب۔ یہ یادیں، یہ سب طالب علموں کا ورثہ ہیں اور میں ان پر دنیا کے ایک عام شہری کی حیثیت سے خوش ہو سکتا ہوں، فخر کر سکتا ہوں بلکہ ان سے عشق بھی کر سکتا ہوں:

دے مجھے تپشِ دل مجالِ عشق تو دے

یہاں تپشِ دل نے پھر احساسات کے گھوڑوں اور گدھوں کے ایسی لات ماردی ہے کہ وہ پھر اڑنے لگے ہیں۔ یہ گھوڑے یہ گدھے، بڑے کمینے اور منچلے ہیں، بار بار دولتیاں مار کر طعنہ دیتے ہیں اور طعنہ دے دے کر دولتیاں مارتے ہیں۔

"کیوں میاں ایشیائی" وہ ہنہناتے ہیں: "یہ تم کس خوشی میں عظمتِ غیر کو اپنا مال سمجھ رہے ہو۔ تمھارے پاس اپنا بھی کچھ ہے، جو تھا وہ تو بزرگوں نے صدیوں پہلے خانہ جنگیوں میں گنوا دیا۔ اب تم کیا ارادے رکھتے ہو۔ کوئی درس گاہ، کوئی جامعہ، کوئی دانش گاہ تمھارے پلّے میں بھی ہے کہ نہیں۔ کیا تم اور تمھارے بعد آنے والے ازل تک کیمبرج ہی دیکھنے آئیں گے۔ یا کبھی کیمبرج والوں کو ادھر بھی بلائیں گے۔"

یہ احساسات گدھے سہی، مگر بات جما کر کرتے ہیں۔ میں جواب تو دے نہیں سکتا۔ اس لیے زور سے ایک لات مار کر انھیں آگے بڑھا دیتا ہوں۔

یہ کوئنز کالج ہے۔ ذرا سنبھل کر ملاحظہ کیجیے۔ یہ نام لکھا تو یوں جاتا ہے 'QUEENS' لیکن تلفظ ہوتا ہے کوئنز۔ کیونکہ یہ یک ڈرسٹ نہیں ایک ملکہ کے نام پر نہیں ہے بلکہ خدا کا کرنا یوں ہوا کہ سنہ چودہ سو سینتالیس میں ایک بادری ... اینڈریو ڈوکٹ نے ملکہ مارگریٹ آف انجو کی سرپرستی حاصل کر کے اسے کوئنز کالج کا نام دیا۔ اس وقت یہ اس طرح لکھا جاتا تھا "QUEEN'S COLLEGE" یعنی این اور ایس کے

بیچ میں شوشہ دے دیا جاتا تھا۔ معنی تھے ملکہ کا کالج۔ اب کیا ہوا کہ شاہ ہنری ششم کے ساتھ ساتھ خاندان لنکاسٹر کا زوال ہوگیا تو دوسرے بادشاہ اور دوسری ملکہ آئے مگر کالج والے ہوشیار تھے۔ انھوں نے جھٹ دوسری ملکہ معظمہ کی سرپرستی حاصل کرلی۔ یہ ملکہ تھیں ملکہ الزبتھ وڈویل جو شاہ ایڈورڈ چہارم سے بیاہی تھیں۔ ان ملکہ معظمہ نے سنہ ۱۴۶۵ء میں اس کالج کا دوبارہ آغاز کیا اور اب یہ ان کے نام سے منسوب کردیا گیا۔ پھر وہ خاندان بھی حسب دستور زوال پذیر ہوگیا لیکن اب کالج والوں کو کوئی ملکہ میسر نہ آئی تو انھوں نے کچھ مدت انتظار کرنے کے بعد اس کا نام ملکاؤں کا کالج رکھ دیا۔ اردو میں یہ جمع لکھنی آسان ہے لیکن انگریزی میں 'QUEENS' لکھنا پڑتا ہے۔ اور گائیڈ لوگ مس میری میک گریگر کی طرح مجھ جیسے ناخواندہ لوگوں کو بار بار صحیح تلفظ کی یاددہانی کراتے ہیں۔

یہ مس میری میک گریگر آف اسکاٹ لینڈ کا پیغام ہے جو میں نے ان صفحات کے ذریعے اردو دنیا تک پہنچا دیا ہے۔ شکریہ۔

حق بہ حق دار رسید

یہ دیکھیے، اسے آہوں کا پل کہتے ہیں۔ بھئی اصل میں اس کا نام ہے برج آف سائز۔ اب میں اس کا اردو نام آہوں کا پل نہ رکھوں تو اور کیا رکھوں۔ مس میک گریگر۔ اس نام کی غایت یعنی وجہ نہیں بتا سکتیں۔ میرا خیال ہے وہ شرما رہی ہیں۔ یا ممکن ہے خفا ہوں۔ انگریز قوم کا سرخ رنگ لمحے لمحے بدلتا رہتا ہے، خفا ہو تب بھی اور شرمائے تب بھی۔ بہرحال کیا یہ کافی نہیں کہ یہ منظر عجیب و غریب ہے۔ ایک غمناک سرور چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ سائے، ندی اور سبزہ۔ کیا مکمل رومانی منظر ہے جو علم و فضل کے بوجھ سے

پگھلا جائے ہے

مگر اب میں اس پل کے سامنے بار بار پنجوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کررہا ہوں تاکہ کم از کم اس مقام پر تو میں مس گریگر سے چھوٹا نہ لگوں۔ لے لڑکی ذرا نیچے ڈھلان کی طرف ہی چل، میں دو قدم چل کر رک جاؤں گا، یہاں تک کہ تیرے قد سے اونچا ہو جاؤں گا۔ میرا احساس کمتری شعور سے تحت الشعور میں چلا جائے گا اور میں کم از کم ایک ساعت ایک لمحے کے لیے تو کہہ سکوں گا کہ

کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے

کیونکہ اب تو دو گھنٹے سے (طوالت مصرع معاف)؛

اس قد کے سبب جاں پہ بنی جاں پہ بنی ہے

"میری" میں مس میری میک گریگر کو ان کے "پہلے" نام سے پکارتا ہوں۔ میں کیمبرج کی سیر کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور آرام سے بیٹھ کر گپ کرنا چاہتا ہوں۔ احتمال تھا کہ وہ برا مان جائیں گی مگر خدا کا شکر ہے کہ امریکہ کا اثر قدیم و عظیم کیمبرج میں بھی نفوذ کرتا جاتا ہے وہ ذرا بھی برا نہیں مانیں بلکہ ٹھٹھک گئیں۔ "بھئی میری" میری ہمت بڑھی " آؤ یہاں اس گھاس کے تختے پر بیٹھ جائیں اور گپ کریں"۔ "گپ" انھوں نے استعجاباً پوچھا" مجھے تو بتایا گیا تھا کہ آپ بہت کم وقت میں سب کچھ دیکھنا چاہتے ہیں" واہ رے انگریز اور انگریزی کی تربیت، اعتراض بھی بالواسطہ کرتا ہے۔ میں بغلیں جھانکنے لگا، مگر پھر ایک بغل میں ایک جواب نظر آ گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کچھ اس عظیم جامعہ کے بارے میں زبانی بھی تو بتائیں گی ہم تھک بھی گئے ہیں۔ یہاں بیٹھ جائیں اور آپ کہیں اور میں سنوں تاکہ ان معلومات کی روشنی میں سیر کا مزا دوبالا ہو جائے"۔

"اوہ آئی سی" انھیں اطمینان ہوا" مگر میں سمجھتی تھی کہ آپ سب انڈین، معاف کیجئے گا پاکستانی لوگ انگلستان اور بطور خاص کیمبرج کے چپے چپے کی تاریخ سے واقف ہوں گے"۔

"ہاں یہ درست ہے" میں کھسیانا ہو گیا" مگر ہمارے ملک میں سبھی تو پڑھے لکھے نہیں ہوتے مجھ جیسے بھی تو بہت سے ہوتے ہیں"۔

"اوہ آئی سی" بھولی اور امپریلزم کی روایات میں دبی ہوئی مس میک گریگر کو یقین نہیں آیا کہ میں پکولی پاکستانی زائر انگلستان اتنا ان پڑھ ہو سکتا ہے۔ مگر شاید وہ بھی تھک گئی تھیں اور میں تقریباً اڑ گیا تھا۔ وہ آلتی پالتی مار کر مجھ سے ذرا دور گھاس کے تختے پر بیٹھ گئیں" تو آپ کیا جاننا چاہیں گے" انھوں نے مستعدی اور شفقت سے پوچھا، ایسی شفقت جو ہمارے مرا گے بچے پالتو جانوروں سے رکھتے ہیں۔

"بس جو کچھ آپ بتا سکیں۔ میرا تہی دامن معلومات کے خزانے سے بھر دیجیے تاکہ اردو داں طبقہ عمر بھر آپ کے احسانات سے سر نہ اٹھا سکے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں امریکہ کا اثر اتنا ہو گیا ہے کہ ہم اعداد و شمار اور معلومات کو ذہانت، طباعی، انفرادیت، تفکر، خلوص جستجو اور ترتیب نتائج پر ترجیح دینے لگے ہیں، دوسرے یہ کہ میرے پاس بس اسٹائل ہی اسٹائل ہے جسے سنجیدہ طبقے تفریحاً تو داد دے سکتے ہیں لیکن اگر اسے اعداد و شمار اور معلومات عامہ کی بیساکھیاں بھی مل جائیں تو وہ دوڑ دوڑ کر ان کی ذہنی منزلیں چھو سکتا ہے"۔

مس میک گریگر نے کیمبرج کی داستان شروع کی اور میں انھیں زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔ وہ شاید کسی بادشاہ کی بات کررہی تھیں۔ "بادشاہ تو ہمارے بھی بہت گزرے ہیں"۔ میرے تحت الشعور نے شعور سے کہا۔ شعور نے کانوں کے پردے پہلے سے تھوڑے تھوڑے کھینچ رکھے تھے۔ لیکن اب آنکھوں کے دریچے بالکل وا کردیئے۔

مس میک گریگر مجھ سے لمبی ہونے کے باوجود بے حد خوبصورت تھیں.....

"آکسفورڈ یونیورسٹی قدیم تر ہے مگر وہاں ۱۲۰۹ء میں عام شہریوں اور دانشوروں میں جھگڑے ہونے لگے تو بہت سے دانشور کیمبرج بھاگ آئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ۱۲۱۴ء میں واپس بھی چلے گئے۔ کیونکہ امن وامان دوبارہ قائم ہوگیا تھا لیکن جو رہ گئے تھے انھوں نے علمی اداروں کی بنیاد ڈالنی شروع کردی"۔

یہاں مجھے رک کر پوچھنا چاہیے کہ دانشوروں اور شہریوں میں جھگڑے کیوں ہوئے لیکن اگر میں بولا تو ان کے کھلتے ہوئے ہونٹ بند ہوجائیں گے۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو ہوا پر جھولنے دو میاں شاعر خاص طور پر جب وہ تازہ ہوں اور سرخ ہوں اور کنواری ہوں۔

"پھر یہ ہوا کہ ۱۲۲۵ء میں باقاعدہ ایک چانسلر بھی مقرر ہوا لیکن اس وقت علما کی تعداد بہت کم تھی۔ اس تعداد میں پیرس سے بھاگے ہوئے پناہ گزین علمانے قابل قدر اضافے کیے جنھیں ۱۲۳۱ء میں شاہ ہنری سوئم نے باقاعدہ خوش آمدید کہتے ہوئے انھیں کیمبرج میں بسا دیا"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے" میں پوچھتا ہوں "پناہ گزین ہونے کے بعد آدمی عالم فاضل یا شریف کیسے کہلا سکتا ہے۔ وہ تو صرف پناہ گزین رہ جاتا ہے"۔

"میں آپ کا سوال نہیں سمجھی" وہ حیرت سے دیکھنے لگی ہیں۔

"نیور مائنڈ۔ یعنی برداشت کیجئے مس میک گریگر مجھے ذرا وطن یاد آگیا تھا۔ ہاں آپ بتا رہی تھیں کہ پیرس سے آئے ہوئے عالموں کو انگریز بادشاہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا"۔

"جی ہاں۔ لیکن یقینے تو سہی یہ بات آپ نے کیا کہی علم وفضل، ہنر، یہ تو عالمی ورثے ہیں۔ عالمی قدریں ہیں، کیا آپ کے خیال میں انگریز بادشاہ ہنری سوئم نے برا کیا کہ فرانسیسی علما کی عزت افزائی کی"۔

"اجی نہیں اس نے بہت اچھا کیا۔ وہ بڑا وِنڈرفل بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ آگے بھی تو بتائیے بائے بھولی میری آف اسکاٹ لینڈ، تو یہ بات کیا سمجھے گی۔

"بس تو یوں اس یونیورسٹی کی تاسیس ہوئی۔ یہاں قدیم ترین کالج ہے۔ پیٹر ہاؤس جو ۱۲۸۴ء میں تکمیل کو پہنچا۔ آپ دیکھیے کہ یہاں اٹھارہ کالج تو مردوں کے ہیں اور دو خواتین کے اور کچھ نئے نئے ادارے ہیں جو ابھی پوری طرح یونیورسٹی سے وابستہ نہیں ہوئے۔ لیکن ان کی اٹھان اچھی ہے۔ مثلاً چرچل کالج جو ابھی انیس سو ساٹھ میں بنا ہے۔ کیا آپ سب کالجوں کی تاریخ جاننا چاہتے ہیں؟"

میں تو ایک ایک اینٹ کی تاریخ حفظ کرنے کو تیار ہوں۔ ایسا استاد پھر کہاں ملے گا۔ مگر یوں بہت جلد شام ہو جائے گی۔" جی ہاں ضرور" میں کہتا ہوں "لیکن فی الحال آپ مجھے ان کے سنہ تکمیل لکھوا دیں تو مناسب ہے۔ تاریخ میں اب تک سنوں کا بڑا رعب پڑتا ہے۔"

"اوہ یس" دیکھیے میرے پاس سب کے سنہ موجود ہیں مگر کیا یہ بورنگ نہ ہوگا"

"ضرور ہوگا لیکن پھر میں پڑھے لکھے پاکستانیوں پر رعب جما سکوں گا کہ بھئی میں نے بھی بڑی زبردست اسٹڈی کر رکھی ہے اور میرے پاس ایک بیش بہا خزانۂ معلومات بھی جمع ہو جائے گا۔"

بیش بہا پر وہ بہت خوش ہوئیں "اچھا تو لکھیے پیٹر ہاؤس ۱۲۸۴ء۔ کلیر کالج ۱۳۲۶ء۔ پیمبروک کالج ۱۳۴۷ء۔ گانویل اینڈ کائس کالج ۱۳۴۸ء۔ ٹری نی ٹی ہال ۱۳۵۰ء۔ کارپس کرسٹی کالج ۱۳۵۲ء کنگز کالج ۱۴۴۱ء۔ کوئینز کالج ۱۴۴۸ء۔ (یہ وہی دو ملکاؤں والا مدرسہ ہے) سینٹ کیتھرائن کالج ۱۴۷۳ء۔ جی زس (یسوع) کالج ۱۴۹۶ء۔ کرائسٹ (مسیح) کالج ۱۵۰۵ء۔ سینٹ جان کالج ۱۵۱۱ء میگڈلین کالج ۱۵۴۲ء۔ ٹری نی ٹی کالج (پہلے والا ہال ہے) ۱۵۴۶ء۔ ایمانیوئیل کالج ۱۵۸۴ء۔ سڈنی سیکس کالج ۱۵۹۶ء۔ ڈاؤننگ کالج ۱۸۰۰ء۔ اور سلوین کالج ۱۸۸۲ء۔ (اللہ رے قدامت)۔

"اور خواتین کے کالج ہیں۔ گرٹن کالج ۱۵۸۴ء۔ نیون ہام کالج ۱۸۸۲ء۔ ان کے علاوہ چار نئے مکاتب طالب سند ہیں۔ مگر خیر آپ پہلے ہی تھک گئے ہوں گے۔ تو یہ سب ادارے کیمبرج کی زینت ہیں۔ لیکن کیمبرج یونیورسٹی بہ حیثیت یونیورسٹی ان سب کے اوپر اور ان سب سے ممتاز ہے۔ یہ تو کالج ہوئے۔ آپ کے ہاں بھی کالج یونیورسٹی سے متعلق ہوتے ہیں نا۔"

"جی ہاں" میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا "بس ذرا یہ ہوا تھا کہ مولوی عبدالحق نے جب اردو کالج بنایا تو اسے کئی برس تک کراچی یونیورسٹی نے درجۂ اسناد نہیں دیا۔"

"اس کا کیا مطلب ہے" وہ پھر پریشان ہو گئیں اور میں نے اپنے چھٹتے ہوئے خیالات کو فوراً تہذیب کی بوتل میں بند کر دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں آپ کی زبان کی بڑی قدر ہے، یعنی پاکستانی عوام اور دانشور اور اہلِ اختیار آپ کی زبان پر جان بھی دے دینے کو تیار ہیں۔"

ان کی روشن آنکھیں پھر چمکنے لگیں۔ انھیں ضرور مجھ پر پیار آگیا ہوگا۔

"جی ہاں۔ انگریزی دنیا کی عظیم ترین زبان ہے اور کیمبرج کی انگریزی تو مستند ہے۔ یہ آکسفورڈ والے ہم سے یونہی خار کھاتے ہیں" وہ بھنکنے لگیں اور پھر انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی داستانِ رقابت سنائی جو میں بہت سے آئی سی ایس والوں سے بہت پہلے سن سن کر بور ہوتا رہا ہوں اس لیے آپ کو پہلی بار بھی بور نہیں کروں گا۔

پھر انھوں نے مختلف کالجوں اور خود یونیورسٹی کے قیام میں انگریز اہلِ خیر کا ذکر کیا۔ کچھ کام بادشاہوں اور ملکاؤں کے ہیں۔ مگر زیادہ ادارے انگریز امرا اور تجار نے بنائے ہیں اور اب جو کچھ حکومت دیتی ہے اس سے دو تین گنا غیر سرکاری ذرائع سے جمع ہوتا ہے۔

"ہا ہا ہا" میں بے اختیار ہنسنے لگا اور مس میک گریگر پھر پریشان ہوگئیں۔

"آپ ہنسے کیوں"

"آئی ایم سوری" میں نے ایک دم معافی مانگ لی۔ میں انھیں کیا بتاتا کہ میں ان تمام انگریز امرا اور تجار کو کتنا بے وقوف سمجھ رہا ہوں، جنھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج جیسے علمی ادارے قائم کیے۔ کیا بوگس لوگ تھے کہ دولت کما کما کر اپنے خاندانوں کے لیے چھوڑنے کے بجائے علم و فن کے چکر میں پھنسے رہے اور آج ایک سابق غلام ملک کا باشندہ بیٹھا ان کا مذاق اُڑا رہا ہے۔

کیمبرج کا نصاب بڑا سخت ہے، اب وہاں بہت سے مضامین لینے والوں کے لیے لاطینی جاننا لازمی نہیں رہا، مگر پھر بھی لاطینی کا بھوت بہت سے شعبوں میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ عام ڈگری بی اے ہے جو تین برس میں ۱۹ مضامین پڑھنے کے بعد ملتی ہے۔ علاوہ اور مضمونوں کے موسیقی بھی ایک مضمون ہے۔ ہائیں میاں یہ کیا کہہ رہے ہو انگریزوں میں بھی ڈوم ڈھاڑیوں کو ڈگریاں ملنے لگیں ——— اجی جناب صرف بی اے ہی نہیں، ایم اے کی ڈگری بھی ملتی ہے، یعنی جو موسیقی کا بی اے موسیقی میں کوئی کارنامہ دکھلائے وہ ماسٹر آف میوزک یعنی ایم اے سمجھا جاتا ہے۔ دیکھا قبلہ آپ نے کیا زمانہ آگیا ہے۔

عام ڈاکٹریٹ تین برس کی خاص محنت کے بعد ملتا ہے۔ (لکھنؤ اور لاہور والے کہیں گے ملتی ہے

مگر یہ حقیر فقیر دلی کا محاورہ بولتا اور لکھتا رہے گا۔ ویسے یہ نہایت مناسب ہوگا کہ ایک دفعہ ان محاوروں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے ان کے سرقلم کردیے جائیں) خاص ڈاکٹریٹ کی ڈگری یعنی ایل ایل ڈی (ڈاکٹریٹ آف لا) ایم ڈی (ڈاکٹریٹ آف میڈیسن) میوز ڈی (ڈاکٹریٹ آف میوزک) (میوزک کا ترجمہ موسیقی ہی سمجھیے گو پرانے شرفا اور امرا اور افسر اس کا ترجمہ اب بھی گانا بجانا ہی کرتے ہیں) ایس سی. ڈی (ڈاکٹریٹ آف سائنس) ڈی. لٹ (ڈاکٹریٹ آف لٹریچر) ان لوگوں کو ملتی ہے جنھوں نے بی. اے کرنے کے بعد کم از کم آٹھ برس علمی کاموں میں گزار دیئے ہوں۔ اس میں بھی چکر یہ ہے کہ قانون، سائنس اور ادب کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار نے اپنے اپنے مضمون کے میدان میں کوئی طبعزاد اضافہ کیا ہو۔ لاحول ولاقوۃ یعنی پہلے آدمی تین برس باقاعدہ پڑھے پھر آٹھ برس اسی مضمون میں جھک مارے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی طباعی کا ثبوت بھی فراہم کرے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اعلیٰ افسر ہو جائے۔ روٹی بھی ملے عزت بھی، اور چند برسوں میں کسی یونیورسٹی سے اعزازی ڈاکٹریٹ بھی مل جائے، بھئی کیمبرج کا یہ چکر ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر اس کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ ہر ملکے را رسمے دیگر است یعنی ہر ملک کی اپنی اپنی رسم ہوتی ہے۔ اب ان کی یونیورسٹی لائبریری ہی میں بیس لاکھ کتابیں اور دس ہزار مخطوطات ہیں، تمھارے ہاں سب جامعات میں ملا کر دس لاکھ کتابیں بھی نہیں ہیں تو اب ڈگریاں اعزازی بھی نہ بانٹی جائیں، آخر ڈگریاں ہیں کس لیے کیا انھیں بیس لاکھ کتابوں کے انتظار میں رکھے رکھے سڑا دوگے یا کام میں بھی لاؤگے۔

اب اندھیرا ہونے والا ہے اور کیمبرج کی عقبیات یعنی پشتین یعنی عقبی سبزہ زار پہ ہلکی ہلکی اداسی چھائی جاتی ہے۔ یہ عقبیات کل پانچ کالجوں سے متعلق ہیں، یہ نہیں کہ سارے کالج قطار اندر قطار سیدھے سیدھے چلے گئے ہوں اور پیچھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے گھاس کے تختے ہوں، باقی تیرہ کالج ادھر ادھر واقع ہیں اور اس سبزۂ مسلسل کی سعادت صرف پانچ کے حصے میں آئی ہے جن میں سے ایک کی پشت پر ایک پاکستانی نیم دانشور، نیم طالب علم نیم سیاح ایک دختر اسکاٹ لینڈ سے کیمبرج کی کہانی نہایت ذوق و شوق سے سن رہا ہے۔ اس ذوق و شوق میں علم کی پیاس یا فضیلت کا رعب کتنا ہے اور کتنا زور "منظر نامے" کا ہے۔ اس کا تجزیہ کرنا بالکل فضول بات ہے، مثلاً بہترین عرق انگور پیتے وقت یہ یاد دلایا جائے تو کتنی تکلیف ہوگی کہ جو آپ پی رہے ہیں، اس میں اتنے فی صد لوہا، اتنے فی صد مٹی اتنے فی صد گوبر اور اتنے فی صد دوسرے بظاہر گندے نظر آنے والے اجزا ہیں۔

لہٰذا اب مس میری میک گریگر کے اصرار پر سینٹ کیتھرائن کالج ایک نظر دیکھ لیا جائے کیوں کہ یہاں ان کے "وہ" تعلیم پاتے ہیں۔ سینٹ کیتھرائن کالج بہت خوب صورت ہے اور اب تو بقول جگر صاحب:

اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

لیکن مس میک گریگر اس کے خوب صورت ہونے سے مطمئن نہیں بلکہ زور اس امر پر دے رہی ہیں کہ یہ کالج تدریس کے معاملے میں پوری یونیورسٹی کے جملہ اداروں پر بھاری ہے اور یہ کہ "وہ" آج ایک بہت ذہین طالب علم تو ہیں ہی لیکن کل انگلستان کے مشاہیر میں بھی شامل ہوں گے۔

"نہایت عمدہ" میں کھنکار کر کہتا ہوں۔ "لیکن مجھے تو کلیر کالج کا یہ منظر زیادہ پسند آرہا ہے۔ کالج والج میں نہیں جانتا ہیں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے باغات اور یہ پل اور یہ ندی اور یہ روشیں یہ تختے ایک ریاضی داں کو بھی شاعر بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ اور کلیر کالج آپ کے ستیاں کے کالج سے زیادہ قدیم بھی ہے۔"

"کیا آپ ریاضی داں ہیں" وہ ایسے پوچھتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ معلوم تو نہیں ہوتے۔"

"جی نہیں میں ایک شاعر ہوں جو ریاضی داں تو کیا صرف اکاؤنٹنٹ بن کر بھی خوش ہو جاتے کیونکہ ہمارے ہاں شاعری کی آمدنی اور اکاؤنٹنٹ کی آمدنی میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"بھئی آپ کا مذاق میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاعر سے بڑا مقام آخر کس کا ہو سکتا ہے، ہم لوگ تو شاعر کو بہت بلند مقام سمجھتے ہیں۔"

"آپ اور آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ لیکن اگر موقع ہو تو ہمارے کسی سیٹھ یا بڑے افسر یا چھوٹے افسر ہی سے پوچھ کر دیکھیے گا۔"

اب جلد جلد گھوم لیجیے۔ یہ ٹری نی ٹی کالج کی لائبریری ہے، دونوں طرف مشاہیر کے مجسمے آویزاں ہیں۔ کاہے کے مشاہیر، ہمارے ہاں تو بانئے تعلیم سرسید احمد خاں کی تصویر بھی کسی کالج میں کم ہی نظر آتی ہے۔ اس لیے ہمیں یہ لائبریری پسند نہیں آئی، ہمیں تو ہمارے رنگ کی کوئی چیز دکھاؤ۔

اچھا تو یہ کرائسٹ کالج میں ملٹن کا لگایا ہوا شہتوت کا درخت دیکھیے۔ ملٹن عظیم ملٹن جس نے جنتِ گم گشتہ جیسی لافانی نظم لکھی، سترھویں صدی کا نابینا جس کے نام پر انگریزی ہی نہیں ہر زبان کے ادیب ناز کرتے ہیں، یہ درخت اس نے لگایا ہے۔ وہ سامنے بائیں ہاتھ کے اس کمرے میں رہتا تھا جس کی کھڑکیاں پہلی منزل سے باہر کھل رہی ہیں۔

یہ شہتوت کا درخت ملٹن کی شاعری جیسا گمبھیر میٹھا اور خوب صورت اور اکیلا ہے۔ مس میری میک گریگر کی آنکھوں سے زیادہ خوب صورت اور مجھ سے زیادہ اکیلا۔ حسن اور تنہائی، جس کے گرد انسانی دردمندی اور غم نے حلقے ڈال رکھے ہیں۔ اب یہ میرا کیمبرج ہے، یہ نوابوں، جاگیرداروں، سخت کالر والوں کا کیمبرج نہیں ہے نہ یہ وہ کیمبرج ہے جہاں برطانوی استعمار پسندوں نے نوآبادیات اور مقبوضات پر صدیوں حکم رانی کے لیے افسروں کی فوجیں تیار کی تھیں وہ کیمبرج میرے حافظے سے محو ہو گیا ہے اور ایک عظیم اور شاندار کیمبرج ابھر آیا ہے جسے ملٹن جیسے عظیم شاعر اور نیوٹن جیسے عظیم سائنس دان کی مادر درس گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میں مس گریگر کے وجود سے غافل ہو گیا ہوں۔ مردہ ملٹن کے بے جان درخت نے ایک زندہ اور خوش شکل خاتون کو شکست دیدی ہے۔

بچپن میں سنا تھا کہ گانے والے گوالیار جا کر میاں تان سین کے مزار پر چھائے ہوئے پیپل کے پتے توڑ توڑ کر کھاتے تھے تاکہ گلا کھل جائے پتا نہیں میرا دماغ کھلے نہ کھلے، قلم چلے نہ چلے، مگر میں نے بھی مس میک گریگر کے منع کرتے کرتے ملٹن کے درخت سے ایک پتہ توڑ کر منہ میں رکھ لیا ہے اور اس شان سے انھیں دیکھ رہا ہوں جیسے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

اب کیمبرج کا افسوں پوری طرح میرے دل و دماغ پر چھا گیا ہے۔ یہ افسوں عظیم انگریز شاعر ملٹن کے لگائے ہوئے درخت سے پھوٹا اور ایک تنندی کی طرح میری ان نفرتوں حقارتوں اور عداوتوں پر چھا گیا جو انگلستان میں گھومتے ہوئے برطانوی سامراج اور اس کی روایات کے خلاف ہر وقت میرے دل میں جاگزیں رہتی ہیں۔

"کیمبرج یونیورسٹی انگریزوں کے پورے نہیں تو خاصے گناہ بخشوا سکتی ہے" میں مس گریگر سے کہتا ہوں مگر وہ حسب عادت میری بات نہیں سمجھتیں۔

"کیوں انگریزوں سے گناہ کون سے سرزد ہوئے ہیں" وہ بڑے خلوص سے پوچھتی ہیں اور کسی قدر خفا بھی معلوم ہوتی ہیں۔ خیر خفگی سے تو میں نہیں ڈرتا کیونکہ میں بہرحال ایک ایشیائی شاعر ہوں جہاں بزرگوں کے بقول:

ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

لیکن میں انھیں کیسے بتاؤں کہ انگریزوں کے "کارنامے" تو کجا، خود ہم پر جو بوجھ ڈال گئے ہیں وہی

ہم سے اتارے نہیں اترتا۔

اچھا تو آیئے پھر اس علم و عقل کے سمندر میں بھٹکتی ہوئی مچھلیوں کی طرح تیرنے لگیں، خواتین سے بحث میں جیتنا تو کس اہلِ دل کو پسند آئے گا۔

(ویسے مچھلی کی مثال اچھی نہیں لگی ایک تو مچھلی غیر شاعرانہ شے ہے پھر یہ بھی سنا ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔)

یہ ٹری نی ٹی ہے۔ ٹری نی ٹی کی کیا بات ہے۔ یہاں لارڈ بیکن نے تعلیم پائی تھی۔ جو شیکسپئر کا ہم عصر تھا اور جس کے متعلق مدتوں یہ کہا جاتا رہا کہ شیکسپئر کا کلام اصل میں لارڈ بیکن کا کلام ہے یعنی انگریز روایات بھی الٹی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو اکا برا اور نوابوں اور جاگیرداروں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں سے لکھوا کر پڑھتے ہیں اور یہاں شیکسپئر جیسے عظیم شاعر اور ڈرامانگار کا کلام ایک نواب سے منسوب کر دیا گیا۔ بہرحال لارڈ یعنی خان بیکن خان ہفت ہزاری ورکن دربار ملکہ معظمہ الزبتھ اول خود واقعی عالم فاضل تھا اس کے مضامین آج بھی انگریزی دانوں کے لیے کلاسک میں شامل ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ ایک بے ایمان اہلکار ثابت ہوا، سو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

اسی ٹری نی ٹی میں سر آئزک نیوٹن نے تعلیم پائی۔ نیوٹن سائنس دان بنا۔ یہ وہ نیوٹن ہے جس نے سیب کے درخت سے سیب نیچے گرتے دیکھ کر سوچنا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ کرۂ ارض میں کشش ہے یعنی اس نے کشش ثقل دریافت کی اور اس دریافت نے نہ صرف پورے عالم کا فکری اندازِ نظر بدل کر رکھ دیا بلکہ سیکڑوں جدید ایجادات کی بنیاد بھی ثابت ہوئی۔ اب چونکہ نیوٹن انگریز تھا اور اسے سر کا خطاب مل گیا اس لیے اس کے تذکرے سے تھوڑی بہت سنجیدگی معلوم ہوگی۔ ورنہ اگر میں یا کوئی اور سیدھے سیدھے طور پر یہ کہہ دے کہ سوچنا اچھی بات ہے سب کو سوچنا چاہیے اور اپنے مشاہدے اور فکر سے اعلیٰ نتائج اخذ کرنے چاہئیں تو یار لوگ مذاق اڑائیں اور "وہ" میرے نام پہ نشان لگا کر رکھ لیں کیونکہ آج بھی کیفیت وہی ہے جو پچاس برس پہلے تھی یعنی،

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

چنانچہ سوچنے کی ترغیب دلانے میں خطرہ دیکھ کر میں قدیم فارسی شاعری کی طرف آتا ہوں، جس کا کیمبرج سے تعلق یہ ہے کہ اسی ٹری نی ٹی میں فٹز جیرالڈ نے بھی تعلیم پائی تھی۔ لے بھی کون

فٹز جیرالڈ۔ یہ نام ہی بیہودہ سا لگتا ہے۔ شکر ہے کسی کو کوئی انگریزی نام بیہودہ تو لگتا ہے ورنہ اپنے ہاں تو ابھی تک بچوں بلکہ نوجوانوں میں "پیار کے نام" انگریزی میں مروج ہیں۔ ٹامی۔ بابی۔ جمی (: آئی ایم سوری لیکن میں اعتراف کرتا چلوں کہ بہت دن ہوئے ایک اینگلو انڈین قسم کی مسلمان سوسائٹی کی دوشیزگانِ خوش اندام مجھے بھی جمی دی پوئٹ کے لقب سے پکارتی تھیں) پھر معذرت یعنی قطع کلام کی معذرت کے بعد عرض ہے کہ فٹز جیرالڈ نے فارسی شاعر اور دانشور حکیم عمر خیام کی رباعیات کا بے نظیر ترجمہ کر رکھا ہے اور آج اس ترجمے کے سبب عمر خیام اور اس کے نام سے منسوب ایک فلسفہ پوری دنیائے مغرب میں مشہور ہے۔ جو لوگ فارسی اور انگریزی دونوں زبانیں جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ترجمے کا نام ہی نام ہے۔ اصل میں یہ فٹز جیرالڈ کی اپنی تشریح خیام ہے لیکن جو لوگ فارسی نہیں جانتے اور صرف انگریزی جانتے ہیں وہ اس ترجمے کی طاقت اور روانی سے سخت مسحور ہیں۔

افسوس غالب کو فٹز جیرالڈ نہ ملا ورنہ آج مغرب ایک اور ادیب سے بھی مسحور بیٹھا رہتا۔

اور سنیئے اسی ٹری نی ٹی میں یادش بخیر پنڈت جواہر لال نہرو نے تعلیم پائی ہے۔ پنڈت جی کے علم و فضل میں کسے کلام ہے، نہ ان کی ذہانت میں۔ لیکن افسوس کہ پنڈت جی ٹری نی ٹی کی آنچ میں تپ کر بھی متعصب برہمن کے برہمن رہے۔

اور جناب سنا ہے کہ وہ " دختر کے برہمنے" والے علامہ اقبال بھی ٹری نی ٹی کے سند یافتہ ہیں۔ ان کا شعر یاد ہے۔ خودی ودی والا نہیں، خالص غزل کا شعر جو انھوں نے کشمیر کے سلسلے میں فرما رکھا ہے۔

دختر کے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بہ روئے او کشائے باز بہ خویشتن نگر

(وہ برہمن زادی جس کا چہرہ گلابی اور جس کا قد بوٹے جیسا ہے۔ پہلے اس کے چہرے کو دیکھ اور پھر اپنے آپ کو یعنی اپنی اہلیت دیکھ)۔ ——— خیر یہ بات تو کشمیر کی نسبت سے نکل آئی ورنہ بات ٹری نی ٹی کی تھی۔ ویسے آج کل ہندوستان میں ہر بات کشمیر ہی سے نکلتی ہے۔ اور انشاءاللہ وہیں جا کر ختم ہوگی (اعلیٰ قسم کے انٹلکچوئل لوگ میری کشمیر نویسی پر ناک بھوں نہ چڑھائیں گو میں بدترین پاکستانی بھی ہوں لیکن پاکستانی ہوں تو کشمیر کو نہیں بھول سکتا۔)

ایک انگریز بقراط نے کہا تھا کہ ٹری نی ٹی کا منصب بہت بڑا ہے۔ لارڈ بیکن، نیوٹن، فٹز جیرالڈ،

نہرو، اقبال یہاں تک کہ ذاتِ ازل خود ٹری نی ٹی سے متصل ہے۔
مگر اب بات بقول کسے ہائی براؤ یعنی اونچی قسم کی ہوتی جاتی ہے۔ میں ٹھیرا جنتا لیکھک یعنی عوامی ادیب، اس لیے ایک دم ٹری نی ٹی سے زقند لگا کر یسوع کالج پہنچتا ہوں۔ تو یہ چھلانگ کیا ہوئی، خدا سے بھاگے تو مسیح تک پہنچ گئے۔

تو یہاں سے دوسری زقند لگاتا ہوں اور ایک گول قدیم عمارت کے سامنے آ کر رکتا ہوں۔ مگر یہ خود گرجا ہے۔ اس کا نام ہے راؤنڈ چرچ یعنی گول گرجا۔ اس کے بنانے والوں کو دنیا گول ہونے کا علم ہو چکا ہوگا ویسے دنیا کے اوپر بھی سبھی کچھ گول ہے بلکہ محاورے میں گول گول ہے جس طرف سے چلو وہیں پہنچو گے جہاں سے چلے تھے ویسے اس گرجا کا اصل نام ہے سینٹ سی پلچر کا گرجا۔ پورے انگلستان میں کل چار گول گرجا ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔ نہایت قدیم اور خوش منظر عمارت ہے، سنہ گیارہ سو تیس عیسوی میں تعمیر مکمل ہوئی جب دارالعلوم کیمبرج کا پہلا مدرسہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ یہ گرجا کیمبرج یونیورسٹی کے علاقے میں تو شامل نہیں لیکن شہر کا قدیم ترین گرجا ہے۔ گرجاؤں کے سلسلے میں دو نام اور سن لیجیے ایک گرجا کرائسٹ کالج کے سامنے واقع ہے جس کا نام ہے سینٹ اینڈریو دی گریٹ کا گرجا' دوسرا نیومارکیٹ روڈ کی نچلی طرف یعنی اپنے مکتبی شہر کیمبرج سے ذرا دور ہے۔ اس کا نام ہے سینٹ اینڈریو دی لیس (ایل ای ڈبل ایس) یعنی ایک تو ہوا بڑے اینڈریو صاحب کا گرجا اور دوسرا چھوٹے اینڈریو صاحب کا گرجا۔ اب ہمارے صاحب لوگ جو 'اولیا' اور اہل کرامت کے ناموں کے ساتھ اس قسم کے القاب کے استعمال کو جہالت اور بیمار مشرقیت کا مظہر سمجھتے ہیں وہ ازراہ کرم سفید بادشاہ قوم کے یہ دو نام یاد کریں اور پھر اس حقیر فقیر سے بات کریں۔

یہ مذہبی فضا ہے، نرم میٹھی اور رسیلی۔ اس فضا میں بیسویں صدی کی گڑگڑاتی ہوئی مشینوں کی بو باس نہیں ہے، گرجا، نیکی بدی، خدا، یسوع، تثلیث۔ اس فضا میں ایک اپنا سرور ہے۔

لیکن خدا کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ خدا سب انسانوں کا ایک ہے مگر اس سے نیچے اترو تو عقیدے کے معاملے میں

بہت سخت مقام آتے ہیں

اس لیے میں محکمۂ مذہبیات سے فوراً محکمۂ کتابیات میں تبادلہ کراتا ہوں۔ انگریز تبادلے کے معاملے میں اڑیل حاکم نہیں ہوتا تھا، نااہلی کی بنا پر بھی زیادہ تر تبادلے ہی کرتا تھا چنانچہ مس میری میک گرگر وائٹ

روایات برطانیہ نے بخوشی یہ تبادلہ منظور فرمایا اور ٹیکسی کے ذریعے کیمبرج یونیورسٹی لائبریری یعنی کتب خانۂ جامعہ کیمبرج پہنچادیا۔ جس میں تیس لاکھ کتابیں اور دس ہزار مخطوطات ہیں۔ یہ کتب خانہ عقاب کے پھیلے ہوئے پروں کی طرح بنا ہوا ہے اور مجھ جیسے جہلا کو ہر وقت اپنی آغوش میں لینے پر تیار ہے۔ بہت سے لوگ اس کی تصویر دیکھ کر خوش نہ ہوں گے کیونکہ یہ ایک پتھروں والی عمارت کی تصویر ہے جس میں نہ بالوں کی تراش ہے نہ ابروؤں کا کٹاؤ نہ آنکھوں کا سبھاؤ، اس کی کمر بھی ننگی نہیں ہے لہٰذا اس کے بازو گداز اور عریاں ہیں، اب کوئی دیکھے تو کیوں دیکھے، اور کیا دیکھے۔

اب میرا چھچھورا پن دیکھیے کہ اس کتب خانے کا ذکر کرنے کی بجائے میں آپ کو کتابوں کے چکر میں پھانسنا چاہتا ہوں۔ ویسے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ انگریز نے آدھی دنیا پر تلوار کے زور سے نہیں کتابوں کے بل پر حکومت کی اور اپنے لیے کتابوں کو ڈھالوں کے طور پر استعمال کیا۔

پتا نہیں آپ ان اقوال زریں کا مطلب کیا سمجھیں گے۔ یا کیا سمجھ کر بھول چکے ہوں گے۔ میں تو یونیسکو کا آدمی ہوں اور یونیسکو فنا فی الکتاب ہے اور کہتی ہے کہ:

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

مگر میں چونکہ یونیسکو کا جز وقتی آدمی ہوں یعنی کل وقتی نوکر نہیں ہوں اس لیے اس سے آگے جاکر کہتا ہوں:

گر شوق بھی نہ ہو تو کتابیں پڑھا کرو

کیا پتا اللہ یہ دیکھ کر تمھیں کسی دن شوق بھی عطا کردے۔

بھئی معاف کیجیے گا اس وقت چھوٹی چھوٹی بے وقوفانہ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ (گویا بڑی بے وقوفانہ باتیں کرنے پر معذرت خواہی کی ضرورت نہیں) اور وہ یک سطری، آسان عام فہم مبنی بریکانہ اسٹائل میں یہ ہیں۔

اے پاکستانی بھائیو اور بہنو میں عظیم جامعہ کیمبرج کے عظیم کتب خانے کے آگے کھڑا ہو کر آپ کو خلوص دل سے یاد کرتا ہوں اور آپ کی خدمت میں یہ گزارش کرتا ہوں کہ

۱: اللہ نے اپنا علم کتابوں کی صورت میں اتارا ہے اس لیے کتابیں موٹروں، کوٹھیوں، اور عہدوں سے افضل ہیں۔

۲: کتاب پڑھنا اور کتاب خریدنا کوئی شرمناک فعل نہیں نہ اس کے لیے چھپنے یا شرمانے کی ضرورت ہے۔

۳:- کتاب کے بغیر اس بیسویں صدی کے سرکس میں ہم بھانت بھانت کے مداریوں کے ہاتھ میں کٹ پتلیوں اور جانوروں کی طرح کھیلتے رہیں گے۔

۴:- کتاب کسی فرد، کسی قوم، کسی ملک کے لیے سب سے مضبوط حفاظتی ڈھال ہے۔

وطن عزیز کو یہ چند پند سودمند پیش کرنے کے بعد اب میں پھر بقراطیت کا لبادہ اوڑھ کر مس بیک گریگر کے ساتھ ایک تقریب میں جاتا ہوں جو ایک ادبی جماعت نے مجھ غریب کے اعزاز میں پاکی ہے۔ وہاں بہت سے پڑھے لکھے لوگ میرے منتظر ہیں اور ایک صدر شعبۂ ادب بھی جنھیں ابھی تک معلوم نہیں کہ ان کے مہمان خصوصی پاکستانی شاعر ڈاکٹر عالی علم سے کتنے بے بہرہ آدمی ہیں۔

شبنم، برائی ٹن اور چرچل

یہ جگہ لندن سے کوئی دس میل دور ہے اور ہم چھ مسافر اس پختہ اور چوڑی سڑک کے تقریباً وسط میں کھڑے ہیں جو سخت خلافِ قانون فعل ہے ۔

ہوا یہ کہ صبح ہم ایک اسٹیشن ویگن میں برطانیہ کی مشہور ساحلی سیرگاہ برائی ٹن کے لیے چلے۔ اسٹیشن ویگن انگریزی روایات کی طرح پرانی ہے اور گو بظاہر مضبوط معلوم ہوتی۔ ہے گر اندر سے اسے زنگ لگتا جاتا ہے ۔کوئی پانچ میل چل کر اس کا ایک ٹائر پھٹ گیا۔ ٹائر پھٹنے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی گر ڈرائیور کے ایک فقرے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں پہلے سے کوئی خرابی تھی ۔

" اسے پھٹنا ہی تھا " اس نے گویا اطمینان سے کہا اور دوسرا ٹائر لگانے میں مصروف ہو گیا۔
چونکہ میں انگریز قوم کا محکوم رہ چکا ہوں اور:

حاکم کے گھر کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس لیے میں نے اس فقرے میں ہزارہا اسرار و معانی کی جھلکیاں دیکھیں ۔ پہلے مجھے شاہ فیصل آف عراق کی حکومت یاد آگئی جس کا ٹائر پھٹنے کے آثار بھی نہ تھے مگر وہ پھٹ گیا۔ اسی طرح مجھے اور بہت سی مثالیں سوجھیں جن کا بیان پاکستانی بچوں اور امیروں اور جاگیرداروں کی ذہنی صحت کے لیے مناسب نہ ہوگا
دوسرا ٹائر لگا تو کوئی پانچ میل چل کر انجن زور زور سے بولنے لگا پہلے اس نے ہمیں دھمکایا، فوں فاں دکھائی، تان پلٹے لیے اور پھر ایک دم بند ہو گیا۔

" یہ برطانیہ عظمیٰ کا زوال ہے " میرے ساتھی فرانسیسی نے کہا جو یوں بھی رستے بھر برطانیہ اور انگریزوں کی برائی کرتا آیا تھا۔ ڈرائیور سخت جھنجھلایا مگر میں نے اسے یاد دلایا کہ ایشیا میں انگریز قوم کی حسِ مزاح بہت مشہور ہے تو وہ ہنسنے لگا ۔ اس نے دو چار ہاتھ انجن پر چلائے اور پھر اعلان کر دیا کہ گاڑی

بے کار ہو چکی ہے اور مسافر آزاد ہیں کہ جدھر منہ اٹھے نکل جائیں۔

"آپ کا کرایہ لندن میں ہمارے صدر دفتر سے واپس مل جائے گا" اس نے بڑی خوش دلی سے کہا اور سامنے والے مکان سے لندن ٹیلیفون کرنے چلا گیا۔

"ہم ہچ ہائیک کریں گے" فرانسیسی چلایا" بولو کون کون چلتا ہے" ہچ ہائیک کا مطلب یہ ہے کہ گزرتی ہوئی گاڑیوں سے لفٹ مانگا جائے۔ جو جہاں تک لے جا سکے اس کا احسان قبول کر لینا چاہیے کیونکہ آگے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی گاڑی مل جاتی ہے۔ اس صورت میں کرایہ بالکل بچ جاتا ہے اور وقت تمام برباد ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اسی چکر میں ڈاکے اور زنا کے واقعات بھی پیش آتے ہیں مگر ان کی اوسط محفوظ سفر کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ہم چھ میں سے دو تو بالکل بور قسم کے انگریز میاں بیوی تھے۔ میاں اپنے ہیٹ کا سامنے والا کونا بار بار چٹکی مار کر جھاڑتے تھے اور بیوی کے نخرے معاذاللہ مجھے کسی لکھنؤ والے کا شعر یاد آیا:

نازکی ختم ہے ان پر جو یہ فرماتے ہیں
فرش مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

ایک بار میرا ہاتھ ان کے دست نازک سے مس ہو گیا تو انھوں نے بڑی کراہت کا اظہار فرمایا۔ مجھ سے بھی نہ رہا گیا اور میں نے رومال نکال کر اپنا ہاتھ رگڑ رگڑ کر صاف کیا تو وہ اور ان کے شوہر کئی منٹ تک مجھے غضب ناک آنکھوں سے گھورتے رہے۔

(سچ یہ ہے کہ بعد میں مجھے اپنی اس حرکت پر بہت شرم بھی آئی) تیسرے ایک بڑے میاں تھے گھاس پھوس۔ برائی ٹن وہ سیر کرنے نہیں جا رہے تھے بلکہ ان کی ایک پوتی ایک کالے کے ساتھ بھاگ کر وہاں جا چھپی تھی اسے سمجھانے جا رہے تھے۔ بے چارے بھولے آدمی تھے اس لیے بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی تھی۔ انھوں نے کہا میں ہچ ہائیک کو ایک غیر شریفانہ طریقہ سمجھتا ہوں لندن سے امدادی گاڑی آ جائے یا کوئی واپسی کی بس مل جائے تو میں لندن چلا جاؤں گا۔ بھاڑ میں جائے میری پوتی اور بھاڑ میں جائیں سب کالی اقوام۔

یہ تقریر سن کر میں نے جملہ کالی اقوام کی طرف سے ایک احتجاجی تقریر کی جسے سنا نہیں گیا بلکہ لوگ بیزار بیزار سے نظر آئے۔ چوتھا مسافر ایک موٹا سا اطالوی تھا جسے انگریزی تقریباً نہ آنے کے برابر آتی تھی مگر اسے بولنے کا شوق بہت تھا پہلے اس نے فرانسیسی کو بور کیا اور اب میرے سر پیچھے پڑنے والا

تھا مگر میں نے فوراً ایک آسان ترکیب نکال لی۔

"میں اطالیہ کو پسند نہیں کرتا" میں نے کہا "کیونکہ وہاں مسولینی پیدا ہوا تھا" جذباتی اطالوی بمشکل میری بات سمجھا اور جب سمجھ گیا تو مجھے مارنے پر تیار ہو گیا جس کے جواب میں میں نے بھی اپنے ڈنٹر قبضے دکھائے مگر تھوڑی سی بدمزگی کے بعد اس سے میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

اب میں اور فرانسیسی ہچ ہائیک کے لیے تیار ہوگئے۔ ہم نے اپنے ساتھیوں سے رسمی طور پر الوداع کہی اور کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر برائی ٹن کی طرف رخ کر کے آرام سے چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سے بسیں اور کاریں گزرتی تھیں۔ بسیں معینہ مقام کے علاوہ کہیں نہیں رکتیں اور کاریں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ ہم سبھی کو روکنے کے لیے ہاتھ ہلاتے تو عام طور پہ کار ہلکی ہو جاتی اور کوئی نہ کوئی گردن باہر نکال کر کہتا" سوری نو روم "یعنی معاف کرنا جگہ نہیں ہے۔

اور پھر وہ آگئیں۔

وہ تھیں مادام شبنم۔ شبنم کی طرح روشن نرم اور نازک۔ آپ یقین کیجیے کہ انھوں نے اپنا نام مادام ایس ڈیو بتایا تھا۔ بس مجھے زیادہ پسند نہ آیا اور ڈیو اردو میں شبنم کو کہتے ہیں اس لیے میں انھیں مادام شبنم ہی کہوں گا۔

وہ اکیلی نہیں تھیں ان کا ایک آٹھ دس سالہ بچہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا ان کی کار چھوٹی آسٹن تھی نئی انگریزیہ سلطنت کی طرح مختصر اور مضبوط جو بڑی موٹروں سے مقابلہ تو نہیں کر سکتی مگر ایک چھوٹے سے خاندان کو دشوار گزار راستوں پر آرام سے لیے جاتی ہے۔

مادام شبنم نوجوان نہ تھیں مگر ادھیڑ بھی نہ تھیں، اگر مجھے ایک پرانی تشبیہہ استعمال کرنی پڑے تو میں انھیں ایک پختہ سیب کہہ سکتا ہوں۔

فرانسیسی نے بیٹھتے ہی مادام شبنم سے عشق لڑانے کا اقدام کیا اور مارا گیا۔ وہ یقیناً ایک جوان طناز تھا اور اس کے لمبے لمبے بھورے بال اس کے مردانہ حسن میں اضافہ کر رہے تھے لیکن وہ بہت سطحی آدمی تھا۔ جلد باز۔ جلد نتائج چاہنے والا۔

" آپ جتنی اچھی گاڑی چلاتی ہیں اتنی ہی خوب صورت بھی ہیں" اس نے تقریباً پہلے ہی سو گز میں داؤں مارا اور یہ کہتے کہتے وہ پچھلی سیٹ سے بالکل آگے جھک گیا۔

" او یس" بچہ مسرت سے چلایا" مائی ممی از ویری بیوٹی فل"

"شکریہ" مادام سر ہلائے بغیر بولیں۔ "لیکن اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ اگلے بس اسٹاپ پر اتر جائیں مجھے یقین ہے کہ آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔"

اگلے بس اسٹاپ پر انھوں نے بے کچھ کہے گاڑی روک لی۔ اتنی دیر میں فرانسیسی محجوب ہوکر اپنی بے عزتی بھول بھی چکا تھا۔ وہ خوشی خوشی اترنے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مادام کی طرف دیکھا "مجھے لے چلو" شاید میری آنکھیں پکاریں۔

"کیا آپ دونوں شروع سے ساتھ ہیں؟"

"نہیں" فرانسیسی خود بولا۔ "میں انھیں جانتا بھی نہیں۔"

مادام نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر کار چلادی۔ میں نے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے فرانسیسی کی طرف نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا "واہ کیا زندہ دل قوم ہے۔" میں نے سوچا پھر میں نے دیکھا کہ فرانسیسی نے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہلاتے مجھے آنکھ ماری۔ "گڈ لک" اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔

لندن سے برائٹن تک کا راستہ دنیا کے حسین ترین راستوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ سڑک خاصے پیچ کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ شاید یہ علاقہ پہاڑی بھی ہے۔ شاید اس لیے کہتا ہوں کہ اپنے پہاڑوں جیسی کوئی بات نظر نہ آئی صرف سڑک کے اونچے نیچے ہونے سے گمان ہوا کہ کسی پہاڑی پر یا اس کے بیچ میں سے جا رہے ہیں ورنہ دونوں طرف گہرا سبزہ اور قدم قدم پر سرخ رنگ کی کھپریل والے بنگلے نظر آتے ہیں۔ اس سبزے کو سبزہ کہہ دینے سے اس کا بیان مکمل نہیں ہوتا۔ ایک زمردیں فرش ہے جو میلوں بچھا ہوا ہے۔ گہری سبز مخمل جیسا فرش جو نرم ہے تازہ ہے اور جس کے دیکھنے سے آنکھوں میں طاقت آتی ہے۔

برائٹن یوں تو ایک شہر ہے مگر وہ ساحلی سیرگاہ کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ لندن سے کوئی اسی میل ہوگا۔ ہفتے اتوار کو لاکھوں مرد عورتوں کا اژدحام ہوتا ہے۔ ساحل کے کنارے کنارے سیکڑوں ہوٹل اور ریستوران ہیں۔ بڑی سڑک کے سامنے ایک لکڑی کی سڑک سمندر میں خاصی دور تک چلی گئی ہے۔ یہ مصنوعی جہاز کی عمارت ہے۔ ایک جہاز سا بنا کر سمندر میں کھڑا کر دیا گیا ہے جس میں طرح طرح کے کھیل تماشے موجود ہیں۔ جوئے کی مشینیں تو بے شمار ہیں۔ چھ چھ پنس، ایک ایک شلنگ کے کھیل بھی ہیں لیکن بہت سے کھیل ایک پنس والے بھی ہیں۔

یہ ایک پنس جسے پینی کہتے ہیں بڑی ملا ہے۔ تول کے بعد وزن اور قیمت میں لپٹی ہے

کے برابر ہے۔ انگریزی سکوں کی داستان الگ ہے۔ایک عذاب ہے جیبیں آدھے پونڈ کے سکوں میں اتنی بوجھل ہو جاتی ہیں کہ اپنے آپ پر شرم آنے لگتی ہے۔ خیر ایک باب انگریزی سکوں پر بھی سہی۔ سالے کیا یاد کریں گے کہ کسی کو ستایا تھا۔

یہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں زیادہ نظر آئے۔ مادام شبنم خود بڑی نستعلیق ہیں۔مگر بچہ ہے کھیلوں پر پلا پڑتا تھا اور یہ حقیر فقیر سگِ لیلیٰ والی روایت کا مارا ہوا اس کے غمزے سہتا تھا۔ مادام بیوہ ہیں، ایک مضبوط باوقار کھاتی پیتی بیوہ، نہایت پڑھی لکھی مدبر بلکہ مدبر متغ (یہ مادہ دماغ کا ہے جناب نیاز فتح پوری اور دیگر علما درگزر فرمائیں) غریب لڑکے لڑکیاں یہاں میچ میٹنگ یعنی بر کی تلاش کا کام بھی کرتے ہیں۔ سو اس میں کیا برائی ہے سستا نسخہ ہے، کامیاب ہو نہ ہو وقت تو اچھا گزر جاتا ہے۔

اور یہ ساحل کے کنارے ہزاروں لوگ نہا رہے ہیں اور کشتی رانی کر رہے ہیں، یہ عوامی تفریح گاہ ہے۔ لارڈ قسم کے لوگ ادھر کم آتے ہیں یعنی برائی ٹن آتے بھی ہیں تو اس عوامی کنارے سے دور اپنے ساحلی گھروں یا مخصوص ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔ ویسے اس ساحل کی کیا بات ہے۔ بقول کسے:

لڑکے کو لڑکی ملے
لڑکی کو لڑکا!

مگر گرم اور روشن دن کی باتیں ہیں۔ غسل آفتابی۔ تیراکی چہلیں۔ دوڑ بھاگ۔ کیونکہ جب صبح ہونے والی ہوتی ہے یعنی رات رخصت ہوتی ہے تو یہ ساحل کنواری ماؤں کے لیے آغوشِ مادر کا متبادل انتظام بھی کرتا ہے۔ ریشمیں اور مضبوط لباسوں میں تقریباً بندھے ہوئے نوزائیدہ بچے پنگوڑوں اور ٹوکروں میں اس ساحل والی دیوار کے نیچے رکھ دیے جاتے ہیں تاکہ موجوں کی لپک سے محفوظ رہیں اور آنے جانے والوں کی نظر فوراً پڑ جائے۔ عام طور پر پولیس فوراً ہی بچے کو قبضے میں لے لیتی ہے اور کسی لاوارث بچوں کے گھر بھیج دیتی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی جوڑا یا تنہا ممتا کی ماری خاتون پولیس کو خبر ہونے سے پہلے ہی بچہ پار کرلے۔ پولیس کے ذریعے بچہ لینے میں قباحت یہ ہوتی ہے کہ کئی طرح کی ضمانتیں دینی پڑتی ہیں اور بار بار بچے کی صحت و تعلیم کی رپورٹ پیش کرنی ہوتی ہے۔

ویسے یہ بچے صرف ساحل برائٹن ہی پر نہیں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ کوڑے کے ڈبوں میں بھی لٹکا دیے جاتے ہیں۔ گلیوں کے محفوظ مقامات پر بھی چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ماں کتنی ہی بے بس یا شرمندہ یا ظالم کیوں نہ ہو بچے کو محفوظ چھوڑ کر جانا چاہتی ہے لیکن ان بچوں کی اصل ماں انگریز قوم ہے جو انھیں محبت سے پالتی ہے۔

مگر برائٹن کے قصے میں ان بچوں کا ذکر کیوں آگیا یہ تو لندن کی بھی ایک مشہور صنعت ہے۔ شاید اس لیے کہ ایک کانسٹبل نے ایک اسی قسم کے بچے کو دریافت کیا ہے اور خلقت ٹوٹی پڑتی ہے۔ یہ بچہ اس نے سامنے والے ریستوران کی ایک میز سے اٹھایا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک نوعمر لڑکی آئی تھی، چائے منگائی خود پی۔ دودھ منگایا بچے کو پلایا اور ریستوران کی خادمہ کو بچے کے پاس کھڑا کر کے کار میں سے کچھ لینے کے بہانے باہر چلی گئی۔

"کیا آپ کے ملک میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں" مادام شبنم مجھ سے پوچھتی ہیں۔

"جی بالکل نہیں" میں سخت ڈھٹائی سے کہتا ہوں۔

"چیریو سر ونسٹن" ایک دم سارا مجمع دوسری طرف لگ جاتا ہے اور لوگ زور زور سے ہاتھ ہلانے لگتے ہیں۔ وہ اس ناجائز بچے کو بھول جاتے ہیں۔

سر ونسٹن چرچل سابق وزیر اعظم برطانیہ ایک کھلی کار میں بیٹھے ہیں اور کار آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ان کا روایتی سگار ہے اور وہ گردن ہلا ہلا کر عوام کے نعروں کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ میری مہربان مادام شبنم بھی اپنی تمام سنجیدگی بھول کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگتی ہیں وہ مارے خوشی کے دیوانی ہوئی جا رہی ہیں۔

"چرچل اب انھیں کیا دے سکتا ہے" میں سوچتا ہوں "کچھ بھی نہیں مگر یہ قوم اپنے زعما کی کتنی عزت کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ ایسا ہمارے ہاں کیوں نہیں ہوتا؟"

یہ کتنے بوگس سوالات ہیں۔ انگریزی پڑھے لکھے اور سنکی لوگ تو فوراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے ہاں چرچل جیسا پیدا ہی کون ہوا ہے مگر میں اسے نہیں مانوں گا۔ اتنا بڑا کوئی پیدا نہ ہوا ہو کچھ بڑا تو پیدا ہوا ہے مگر پیدا ہو بھی جائے تو پنپنے کوئی نہیں پاتا۔ اگر وہ صاحب اقتدار ہے تو ویسے ہی اس سے دشمنی ایک قومی فرض ہے۔ اگر وہ اقتدار سے محروم ہو گیا ہے تو اس کا مذاق اڑانا اور اس کی بے عزتی کرنا بھی ایک اہم قومی فرض ہے۔

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

اب یہ چرچل خاں ہیں۔ یہ کوئی ساری عمر وزیر اعظم تو رہے نہیں بلکہ اصل میں تو وزیر اعظم جنگ کے زمانے میں رہے ہیں۔ مگر اس سے پہلے بھی ان کی قدر و منزلت میں کمی نہیں کی گئی۔ دس برس یہ ہر قسم کے اقتدار سے محروم رہے پورے دس برس۔ اس عرصے میں تو ہم اپنے زعما و مشاہیر کی ہڈیاں تک گلا کر خاک کر دیں مگر یہ پٹھا جما رہا۔ تقریریں کیں کتابیں لکھیں اور سگار پیا اور۔

یہ کیا بات ہے کہ انگلستان کا کوئی ذکر چرچل سے خالی نہیں رہ سکتا۔ چرچل جو برسوں سے ایک عضو معطل رہا ہے آج بھی مورخوں سیاحوں اور صحافیوں کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔

شاید یہ خوبی انگریز قوم کی ہے چرچل کی نہیں۔ یہ قوم جب اپنے بڑوں کو بڑا بنا دیتی ہے تو چھوٹا نہیں بننے دیتی۔

اگر آپ چرچل کے بہت زیادہ شائق ہوں تو میں برائٹن چھوڑ کر ایک دم آپ کو ڈوواسٹاک لے چلوں جہاں میں دوسرے دن گیا تھا، اس کے لیے لندن واپس آکر بالکل دوسری سمت میں جانا پڑے گا۔ یہ علاقہ انگلستان کا ورسائی کہلاتا ہے۔ اصل ورسائی تو فرانس میں ہے نا پیرس سے نزدیک وہ شاندار محل جس نے سیکڑوں دوسرے انقلابات کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کا صلح نامہ بھی مرتب کرایا۔ مگر یہ پھر تاریخ کا چکر شروع ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف انگلستان کا ورسائی دیکھیے جو مارل برو کے دسویں ڈیوک کا محل ہے اور جہاں خان چرچل خان پیدا ہوئے تھے۔ بھئی معاف کرنا میرا بیان کچھ پاکستانی ہوتا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی پٹھان پاکستانی شہری وزیر یا بڑا عہدے دار ہو جاتا ہے تو اس کے نام سے پہلے بھی خان لگا دیا جاتا ہے حالانکہ جب وہ کچھ نہیں ہوتا تو اس کے نام کے بعد میں بھی خان کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بلکہ معتبر لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں کہ یہ خان کدھر سے ہوا۔ مگر جب اسے کوئی بڑی کرسی مل جائے تو وہی معتبر لوگ اسی معمولی سے نام سے پہلے اور بعد میں خان لگا کر بڑے پیار اور احترام سے اس کا نام نامی لیتے اور جپاتے ہیں۔

ہاں تو خان چرچل خان اس گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ گویا یہ بڑے خاندانی آدمی بھی ہیں یہ محل ۱۷۲۲ء میں مکمل ہوا تھا اور اسے ملکہ این نے اپنے کپتان جنرل ڈیوک آف مارل برو اول کو تحفتاً بخش دیا تھا۔ یہ ڈیوک وہ بزرگ تھے جنھوں نے شاہ فرانس لوئی چہاردہم کو شکست دی تھی۔ یہ محل اب تقریباً ایک عجائب خانہ ہے۔ ڈھائی شلنگ دو اور طرح طرح کے نوادر دیکھو۔ چینی کے قیمتی ظروف۔ جھاڑ فانوس۔

مرقعے۔ تصویریں۔ فرنیچر۔ سنا ہے کہ اچھے دام دینے پر اس کے باغ میں پارٹی کا انتظام بھی کر دیا جاتا ہے۔ یوں انگلستان کے نوابوں کی جاگیردارانہ عظمتیں کسی نہ کسی حد تک عوام کے تصرف میں آتی جاتی ہیں مگر اس نمائش کی تہ میں وہی پرانی قدروں کا احترام موجود ہے انگلستان بدلتے بدلتے بدلے گا، برطانوی انقلاب برطانوی مزاج کی طرح بہت ٹھنڈا اور سست رو ہے۔ فرانس اور روس کی طرح گرم اور تیز رو نہیں ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ انگلستان چاہے کتنا بدل جائے لیکن اس کی چند باتیں کبھی نہیں بدلیں گی یعنی:

۱۔ لندن میں شاہی مہمانی کے ہوٹل کلارجیز کے آگے کھڑی ہوئی رولس رائس پر خاک نظر نہیں آسکتی۔

۲۔ آزاد "مفکرین" کے خطوط بنام مدیر بند نہیں ہو سکتے۔

۳۔ ہائیڈ پارک میں آزاد جلسے بند نہیں ہو سکتے۔ جہاں لکڑی کے ایک خالی بکس پر کھڑے ہو کر کوئی بھی مقرر جو چاہے کہہ سکتا ہے اور قانون اس کی گرفت نہیں کر سکتا۔

(یہ اور بات ہے کہ اس کے سننے والے کتنے ہوتے ہیں)

۴۔ "پب" یعنی پبلک شراب خانوں میں کام پیشہ انگریز بیئر کے گلاس سامنے رکھ کر گھنٹوں بیٹھنا اور سیاست پر باتیں کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔

یوں اب میں بھی بہ حیثیت مجموعی انگریز قوم کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنے کے قابل ہو گیا ہوں۔

ے باقی دو ماہتاب باقی

سر سیّد سے معذرت کے ساتھ

اب انگلستان مجھ سے اور میں انگلستان سے بیزار ہو گئے ہیں۔ مگر میں نے اس بیزاری سے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے، آخر انگریز نے بھی تو آپ سے دو سو برس تک فائدہ اٹھایا ہے ـــ اور اب بھی اٹھا رہا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ میں ان کی زبان سمجھتا ہوں اور یہاں "قیام درویش" بھی تین مہینے رہا ہے۔ پیرس کی طرح نہیں کہ آئے دیکھا اور چل دیئے۔ یہاں بہت کچھ دیکھنا اور سننا پڑا ہے، بار بار خیال آتا ہے کہ کوئی اہم بات رہ نہ جائے۔ مثلاً میں نے اب تک ٹاور آف لندن کا حال نہیں بتایا جو ایک مشہور عبرت خانہ ہے۔ یہ لندن کے وسط میں ایک قلعہ ہے اور قلعے میں ایک مینار ہے جس پر ایک کمرہ ہے۔ اس کمرے میں بڑے بڑے لارڈ قید اور قتل کیے جاتے تھے۔ یہیں دو معصوم شہزادوں کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔

اس قلعے میں خاندان شاہی کے نوادر اور ہتھیار اور قدیم خزانے نمائش کے لیے رکھے ہیں مگر میں نے وہ نہیں دیکھے۔ ہوا یہ کہ میں جو قلعہ دیکھنے گیا تو باہر کچھ توپوں پر نظر پڑی۔ ایک توپ بھرت پور کی لڑائی میں جیتی گئی تھی۔ اس پر پیتل کا کتبہ لگا ہوا ہے اور انگریزی افواج کی شان میں چند الفاظ کندہ ہیں۔ بس یہ سب مجھے بہت برا لگا۔ یہ وقتی تھی مگر تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ توپ میری طرف کر دی گئی ہے اور اب اس میں سے ایک گولا نکل کر میرے سینے پر آ لگے گا۔ میں نے اس توپ کے ایک گھونسا مارا۔ کچھ نہ ہوا۔ زور سے ایک لات ماری پھر بھی کچھ نہ ہوا بلکہ میرا پنجہ ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گیا۔ پتا نہیں میرے پاؤں کا پنجہ کب اتنا مضبوط ہوگا لیکن مجھے یقین سا ہے کہ ایک دن وہ مضبوط ہو جائے گا اور میں اس توپ کے ایسی لات ماروں گا کہ وہ زمین میں دھنس جائے اور عمر بھر کے لیے میرے برصغیر کی فتح اور غلامی کا نشان دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔

لہٰذا اٹھا ورآف لندن کو چھوڑیے یا کسی اور سفرنامے میں تلاش کیجیے۔ ایک اور سبب جس سے تنگ آکر میں انگلستان سے بھاگ رہا ہوں یہ ہے کہ یہاں کے سکے نہایت بے ہودہ ہیں۔ آپ نے پونڈ کا نام بہت سنا ہوگا، پونڈ کا تو نوٹ ہوتا ہے اور ہر وقت پونڈ کام میں آتا بھی نہیں اصل چکر تو سکوں کا چلتا ہے سو وہ ملاحظہ فرمائیے۔

یہ ہاف کراؤن ہے۔ ایک موٹا چوڑا سفیدی مائل سکہ۔ اس کے معنی ہیں ڈھائی شلنگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ شلنگ کا فل یعنی پورا کراؤن بھی ہوتا ہوگا مگر وہ نہیں ہے۔ یعنی فل کراؤن کوئی سکہ ہے ہی نہیں بس پانچ شلنگ کا نوٹ ہوتا ہے۔ یہی قصہ گنی کا ہے۔ ہمارے بچپن میں اشرفی کو گنی بھی کہتے تھے اور گو غلط کہتے تھے مگر اطمینان تو رہتا تھا کہ یہی گنی کوئی شے ہے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ گنی اکیس شلنگ یعنی ایک پونڈ ایک شلنگ کی رقم کو کہتے ہیں لیکن گنی ہوتی نہیں۔ شیخی کا یہ حال ہے کہ ہر اچھی چیز کی قیمت گنیوں میں لکھی ہوئی ملے گی۔ یہ سوٹ بیس گنی کا ہے۔ یہ کتاب ایک گنی کی ہے۔ کرایہ مکان دس گنی فی ہفتہ۔ یعنی شان تو وہی پرانی ہے مگر مطلب یہ ہوتا ہے ایک پونڈ اور ایک شلنگ خیر آدمی گنی بھی برداشت کر لے مگر ہاف کراؤن کیسے برداشت کرے جو ڈھائی شلنگ کا ہوتا ہے جب کہ فوراً ہی دو شلنگ کا سکہ بھی موجود ہے۔ اسے ٹو شلنگ پیس کہتے ہیں یعنی دو شلنگ کا ٹکڑا ہاف کراؤن سے ذرا سا چھوٹا اور خاصا بھاری۔ پھر شلنگ کی باری آتی ہے جو ایک پونڈ کا بیسواں حصہ ہے اور ٹپ میں خوب استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد ملاحظہ کیجیے چھ پنس۔ سفید رنگت پتلا دبلا سا سکہ۔ لندن سے کراچی بلکہ دنیا بھر میں کہیں بھی بھیجنے کے لیے ہوائی لفافہ چھ پنس کا آتا ہے، اگر خط لفافے میں بند کیا جائے تو ایک شلنگ کا ٹکٹ لگانا پڑتا ہے۔ چھ پنس سب سکوں میں کارآمد اور خوب صورت اور کم بوجھل ہے۔ اب آئیے تھری پنی پر، یہ تین پنس کا ٹکڑا ہے پہلے ہلکا سفید ہوتا تھا اب تانبے کا اور بھاری اور دبیز ہے، بے تکلف بولنے والے اسے تھری پنی کہیں گے کیونکہ یہاں کی بھی ایک بازاری زبان ہے جو ہمارے زعما اور فضلا بھی بڑی خوشی سے اختیار کر لیتے ہیں۔

اور اب:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

یہ ہیں جناب پینی۔ ایک پنس۔ ہاف کراؤن کے برابر چوڑے موٹے اور بوجھل اور قیمت پیسے برابر۔ مثلاً ایک پینی میں آپ کوئی معقول بات نہیں کر سکتے شاید کسی بہت معمولی اور گھٹیا ریستوران میں چوبدار

کو ایک پینی دے کر پیشاب کر سکتے ہیں لیکن ایک ایک پینی کے کئی سکے جیب میں رکھنے ضروری ہیں کیونکہ بہت سے نرخ اتنے نامعقول ہیں کہ ایک پینی کی ضرورت بار بار پڑتی ہے مثلاً بہت سے مقامات سے بہت سے مقامات تک کرایہ پانچ پینی ہے، اب مشین میں ایک سکہ تو تھری پینی کا ڈالا دو پینی کا سکہ ہے نہیں اس لیے گن کر دو سکے ایک ایک پینی کے دینے پڑتے ہیں۔ خریداری میں ٹیکس کا چکر ہے۔ کئی چیزوں کے ساتھ اصل قیمت پر ایک ایک دو دو پینی دینی پڑتی ہے۔

مگر یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ایک ہاف پینی بھی ہے۔ ایک پنس کا آدھا حصہ۔ تھری پینی سے بڑا بلکہ چھ پنس کے برابر ہوتا ہے اور چونکہ تانبے کا ہوتا ہے اس لیے زیادہ بھاری بھی ہوتا ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا مصرف باقی رہ گیا ہے ہم نے تو اسے چوم کر چھوڑ دیا تھا۔

اعشاری نظام تمام مہذب دنیا میں رائج ہے بلکہ ہندوستان پاکستان جیسے " نیم مہذب " ملکوں میں بھی رائج ہو چکا ہے مگر انگریز ہے کہ اسے قبول کر کے نہیں دیتا۔ سنا تھا حکومت اس سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہتی ہے۔ روز بیان آتے ہیں (اخبارات میں خطوط اور اداریے چھپتے ہیں) مگر کہیں نہ کہیں کوئی اڑنگا لگا ہوا ہے گویا اب اس وقت بھی انگلستان کا سکہ یوں ہے۔

ایک پونڈ کے بیس شلنگ

ایک شلنگ کے بارہ پنس

ایک پنس کی دو ہاف پینیاں

یعنی ایک پونڈ میں چار سو اسی ہاف پینی کے سکے ہوتے ہیں۔ مگر معاملہ چونکہ بڑی قوم کا ہے اس لیے اسے حماقت کہنے کی بجائے کچھ اور کہنا پڑے گا مثلاً ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

اب کچھ ان کے مشہور زمانہ اخلاق کا حال بھی دیکھیے لیکن اس سے پہلے سر سید مرحوم کا ایک خط دیکھتے چلیے۔

" میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے ادنیٰ تک امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابلِ تعظیم یا لائق ادب سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے ساتھ اخلاق اور بد اخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے، پس ہمارا کچھ حق نہیں ہے۔

(اگر یہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانوروں کی طرح سمجھیں۔
اگرچہ میرے ہم وطن میری اس تحریر کو بہت سخت سمجھیں گے اور وہ تعجب کریں گے کہ کس چیز کی ہم میں کمی ہے اور کس چیز کی انگریزوں میں فوقیت ہے جو میں نے ایسا لکھا ہے۔ مگر ان کا تعجب کرنا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ وہ یہاں کی کسی چیز سے واقف نہیں ہیں اور جو کچھ یہاں ہے وہ حقیقت میں وہم وخیال سے باہر ہے۔ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا اور دیکھتا ہوں امکان نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں وہم وگمان میں بھی آسکتا۔ جو کوئی میرا ہم وطن اس تحریر کو سچی اور واقعی حقیقت نہ سمجھے آپ یقین کیجیے کہ اس کی مثال مینڈک اور مچھلی کی ہے۔"

مگر اے صاحبان عالی شان میں سرسید مرحوم کے قدم کی خاک کے برابر نہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ وہ پرانے زمانے کے بھولے اور شریف النظر لوگ تھے انھوں نے اچھا ہی اچھا دیکھا اور اچھا ہی کہا۔ ان کے دل میں اپنی قوم کا درد تھا کہ وہ اس کے لیے جلد سے جلد، بہتر سے بہتر حالات پیدا کرنا چاہتے تھے اس لیے اسے غیرت دلاتے تھے۔

پھر یہ بھی سچ ہے کہ ۱۸۷۰ء کا انگلستان آدھی دنیا میں حاکم تھا اور مقبوضات اور نو آبادیات کی تمام دولت وہاں کھنچ کر آتی تھی اور فارغ البالی کا ملمع بڑا چمک دار ہوتا ہے۔

جو انگلستان میں دیکھتا ہوں وہ ایک مضبوط جفاکش اور تعلیم یافتہ قوم کا وطن ضرور ہے مگر ایسا نہیں کہ میں سرسید جیسا ایک اور خط لکھنے پر مجبور ہو جاؤں۔ سرسید مرحوم یقیناً سوہو نہیں گئے ہوں گے۔ جہاں ہر طرح کا اخلاقی اور جنسی جرم پرورش پاتا ہے۔ نہ انھوں نے ہائیڈ پارک کے اندھیاروں میں سرپنٹائن جھیل کے کنارے وہ تماشے دیکھے ہوں گے جو میری گنہگار آنکھوں نے امتناع عصمت فروشی کے بعد بھی دیکھے۔ نہ انھیں مرد رنڈیاں ملی ہوں گی نہ نشے باز اور گراہ نشے پلانے والے نہ کسی انگریز بہادر نے ان کی جیب کاٹی ہوگی۔ نہ کسی عورت نے مدد مانگنے کے بہانے بلیک میل کیا ہوگا۔ نہ مالک مکان نے سر درات میں ایک دم کرایہ زیادہ کرنے کا فیصلہ کر کے گھبرائے ہوئے مسافروں کی جیب خالی کرائی ہوگی۔ نہ یہ ہوا ہوگا کہ ٹیکسی ڈرائیور کافی ٹپ نہ ملنے پر گالیاں دیں۔ سرسید مرحوم کو کیا خبر ہوگی کہ ان کے زمانے کے بعد اس قوم میں جاسوس اور قومی غدار یعنی لارڈ ہاہا جیسے لوگ بھی پیدا ہوں گے یا یہ کہ انگلستان میں نسلی فسادات بھی پیدا ہوا کریں گے یا یہ کہ شاہراہوں پر چلنے پھرنے والے اپنے علما وفضلا کا مذاق بھی اڑائیں گے۔ جیسا کہ میں نے لارڈ

برٹرینڈرسل کے ساتھ ہوتے دیکھا ہے۔

جب لارڈ برٹرینڈرسل نے 'بین دی بامب' یعنی ایٹم بم کے خلاف مہم شروع کی تو یہ حقیر فقیر وہیں موجود تھا۔ ان کے جلو میں کوئی بیس پچیس آدمی موجود تھے' دو چار آزاد قسم کی لڑکیاں بھی تھیں لیکن سب کے سب متین اور شستہ اور پرسکون تھے۔ مظاہرے کرنا شہریوں کا بنیادی حق ہے خاص طور پر لندن میں، چنانچہ یہ مظاہرہ بھی لندن کی شہری زندگی کا ایک معمولی واقعہ تھا لیکن لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کا مذاق اڑایا' ان پر پھبتیاں کسیں بلکہ دو چار انڈے بھی پھینکے گئے اور یہ سب کچھ اس آدمی کے ساتھ ہوا۔ جسے ایک عالم ایک عظیم مدبر اور فلسفی مانتا ہے، جسے نوبل انعام مل چکا ہے اور جسے خود انگریز قوم سر کا خطاب دے چکی ہے۔

ہاں یہ ایک طرح کی فلاحی ریاست ہے۔ فلاحی ریاست کی اصطلاح آج کل ہمارے ہاں بہت استعمال ہو رہی ہے مگر بہت سے بقراط استعمال تو کرتے ہیں اور معنی نہیں جانتے۔ فلاحی ریاست (WELFARE STATE) کے معنی ہیں' وہ معاشرہ جہاں مزدوری کی ضمانت حکومت دے، جہاں ابتدائی تعلیم جبری اور مفت ہو اور جہاں ہر آدمی کو علاج کی سہولت حاصل ہو۔ اور جہاں ہر آدمی کو اظہار رائے کی آزادی ہو۔

مگر اس قوم کو یہ مقام امتحان کے بغیر نہیں ملا۔ ایک امتحان نہیں کئی امتحانات، جن میں دو عالمی جنگیں بھی شامل ہیں (مگر مائی ڈیئر سر سفرنامے اور مقالے میں کوئی فرق ہونا چاہیئے۔)

یا آپ اسکاٹ لینڈ دیکھیں گے۔ پہاڑی، مضبوط، خوش مزاج، کنجوس مکھی چوس، لمبے لمبے اسکاٹ! اگر وہاں ملک برطانیہ کو انگلستان کہا جائے تو بولنے والے کا جبڑا توڑ دیا جاتا ہے۔ "اسکاٹ لینڈ" وہ جم کر کہتے ہیں۔ ہم اسکاٹ ہیں، انگریز نہیں۔ ملکی طور پر تم ہم کو زیادہ سے زیادہ برٹش یعنی برطانوی کہہ سکتے ہو۔

مگر اسکاٹ لینڈ انگلینڈ سے بھی زیادہ تماشے کی چیز ہے اسے کسی الگ کتاب کے لیے رکھیے۔

اور لندن یونیورسٹی کا حال بھی آپ نے نہیں سنا۔ اب میں کوزے میں دریا کو کیسے بند کر دوں۔ لندن کی ایک الگ داستان ہے۔ اگر اس کی ایک ہی بات کہنی پڑے تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ کالی اقوام کے طالب علموں کو وہاں سے گوری قوم کی لڑکیاں نسبتاً جلد مل جاتی ہیں۔ اور ڈگریاں تو اپنے وقت پر سب کو مل جاتی ہیں۔

لندن کا سب سے بڑا معجزہ ہائیڈ پارک کا گوشہ مقررین ہے۔ یہاں ایک ا[illegible] ... [illegible] فاصلے

پر "مقررین" چبوترے کے خالی بکسوں پر کھڑے ہو کر دھواں دھار حکمت کے موتی لٹاتے ہیں۔ کوئی شخص کسی بھی موضوع پر تقریر کر سکتا ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ بس خاندان شاہی کے وجود کے خلاف یعنی بادشاہت کے خلاف تقریر نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ ہر چیز کے خلاف اور ہر چیز کے موافق تقریر ہو سکتی ہے اور کوئی محتسب کسی کو نہیں روک سکتا بلکہ محتسب یعنی پولیس کا کانسٹبل تو اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی جوشیلا مقرر اپنے مخالفین کے ہاتھوں پٹ نہ جائے۔

سامعین کی قسم اور ان کی تعداد مقرر کی اپنی قسمت پر منحصر ہے۔ میں نے اس گوشے میں کوئی سات آٹھ تقریریں کیں ایک بار سامعین میں صرف میں تھا۔ ایک بار ایک جبشن آیا جو ایک بچے کو گاڑی میں کھلاتی ہوئی ادھر سے گزر رہی تھی۔ ایک بار کوئی سو سامعین جن میں سے دو نے بعد میں مجھے ڈنر اور لنچ کھلائے۔ ایک بار ایک مشہور انگریزی شاعر سی۔ ڈے لیوئس جو ادھر سے گزرے اور مجھے سن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد تفصیلی طور پر شرف نیاز بخشا۔ میرے موضوعات میں کشمیر کا جھگڑا، پاکستان کے لسانی مسائل، انگریزوں اور امریکنوں کی عالمی ناانصافیاں، رائٹرز گلڈ کے حالات اور غالب کی شاعری شامل تھے۔ ایک اور مرتبہ کچھ اردو داں طالب علم ادھر سے گزرے تھے تو تقریر چھوڑ کر مجھے دوہے سنانے پڑے۔ بوڑھی انگریز عورتیں سمجھیں کہ میں آنکھیں بند کر کے مناجات پڑھ رہا ہوں۔ چنانچہ ان کی آنکھیں اس دوہے پر بھی اشک بار ہو رہی تھیں۔

ناتری ایسی بالی عمریا نا ایسو، ناداں!
پر جب ہم کوئی بات کہیں تو نے پوچھی ناجان
سچ ہے بھگتی میں رنگ و نسل اور زبان کی کوئی قید نہیں۔

رات کو بی بی سی والوں نے میرے اعزاز میں مشاعرہ منعقد کیا ہے۔ یہاں کم سے کم پانچ گنی پانچ پونڈ پانچ شلنگ ایک پروگرام کے ملتے ہیں۔ بہت سے مہاجرین، تارکین اور لندن سے گزرنے والے ضرورت مند چھوٹے افسروں کے لیے تو بی بی سی ایک مشفق سرپرست کا کام کرتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اٹھائیس زبانوں میں برطانوی حکومت کے نظریات اور ان نظریات کے مطابق خبریں فراہم کرنا ہوتا ہے۔ یہ شعر بازی ڈراما تقریر تو چاشنی کے لیے ہے ورنہ اصل میں:

لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

ایک سیکشن یعنی شعبہ پاکستانی بھی ہے۔ ایک ایک کمرے میں چار چار پاکستانی "منشی جی" بیٹھے ہیں

سوسوا سو پونڈ تنخواہ پاتے ہیں جس میں سے بیس پچیس پونڈ ٹیکس کے کٹ جاتے ہیں۔ باقی میں اگر اکیلے ہیں تو آرام سے اور خاندان کے ساتھ ہیں تو دکھ سے گزارتے ہیں۔ انگریز افسر کے چشم و ابرو پر خبروں تقریروں اور دوسرے نشریوں میں سامراجی رنگ بھرتے ہیں اور تین تین پانچ پانچ سال بعد واپس آکر مجھ جیسے ناواقفوں پر دھونس جھاڑتے ہیں کہ ہم بی بی سی میں کام کرکے آئے ہیں۔ ہم ناواقف لوگ انھیں منہ کھولے احترام و عقیدت کے جذبات سے ان کے "قابلانہ" خیالات سنتے ہیں اور ان کی پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرتے ہیں۔

اس بی بی سی کی نشریات میں کہا جاتا ہے "لندن سے آداب عرض" میں نے ابھی اسی بی بی سی میں ایک مشاعرہ ختم کیا ہے اور میں یہیں سے لندن کو خدا حافظ کہتا ہوں۔ ورنہ اگر ایک لمحے کی تاخیر کی تو پھر کمبل مجھے لپٹ جائے گا۔

چلتے چلتے انگریزی زبان کا سب سے لمبا واحد لفظ پڑھتے چلیے۔ اس کا لفظی ترجمہ میں کروں گا معنوی ترجمہ اپنی اپنی مرضی سے کیا جا سکتا ہے۔ لفظ ہے:

FLAUCIPAUCINILIPILIHILIFICATION

فلاسی پاسی نی لی پی لی ہی لی فی کے شن

ترجمہ: کسی بے قیمت چیز کا تخمینہ لگانا۔

مطلب: لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم

از کاخ و کوُ جدا و پریشاں بہ کاخ و کوُ
کردم بہ چشمِ ماہ تماشائے ایں سرائے

o

جمیل الدین عالیؔ کے
سفرنامے کا دوسرا حصہ

تماشا مرے آگے

(جرمنی - ہالینڈ - اٹلی - سوئٹزرلینڈ اور امریکا)

شیخ غلام علی اینڈ سنز - لاہور